دنیائے اردو کا پہلا بین الاقوامی ادبی جریدہ

ISSN: 2992-9946

بیاد: ڈاکٹر سعید وارثی

سہ ماہی

ورثہ

نیویارک

عالمی اردو ادب وثقافت کا نمائندہ

جلد نمبر 4، شمارہ نمبر 12، جولائی تا ستمبر 2024ء

مدیر اعلیٰ : رئیس وارثی مدیر و پبلشر: نصیر وارثی

ریذیڈنٹ ایڈیٹر پاکستان : ڈاکٹر صدف نقوی

سرپرست اعلیٰ: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی

سرپرست: افتخار عارف

نگران اعلیٰ: ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

نگران: پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی

شائع کردہ: ورثہ پبلی کیشنز اُردو مرکز نیویارک

urdumarkazusa@gmail.com

212-470-0660 - 800675-1138

عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب اردو مرکز نیویارک کے بانی صدر، مدیر اعلیٰ سہ ماہی ورثہ نیویارک
محترم جناب رئیس وارثی کو امریکہ میں ان کی رضا کارانہ خدمات پر امریکی صدر جو بائیڈن کی
جانب سے صدارتی ایوارڈ اور صدارتی تمغہ سے نوازا گیا

اور اب "ورثہ" آن لائن ایڈیشن کا اجراء ورثہ کی زیر تعمیر اُردو کی جامع ویب سائٹ پر
www.wirsaurdu.com

نیویارک سے اردو زبان کا پہلا عالمی ادبی جریدہ ورثہ کا اجراء اردو ادب کے فروغ
میں اہم سنگ میل ہے اس اہم قدم پر ورثہ کے مدیران اور پوری ٹیم کو دل کی
گہرائیوں سے مبارک باد! آپ کی محنت اور لگن اردو ادب کو عالمی سطح پر پہنچانے
میں نمایاں کردار ادا کرے گی۔

FAIQ A HAMEEDI
PSYCHIATIST MD.MPH

Central park Av
Scarsdale, NY 10583

East Gun Hill Road
Bronx,NY 10467

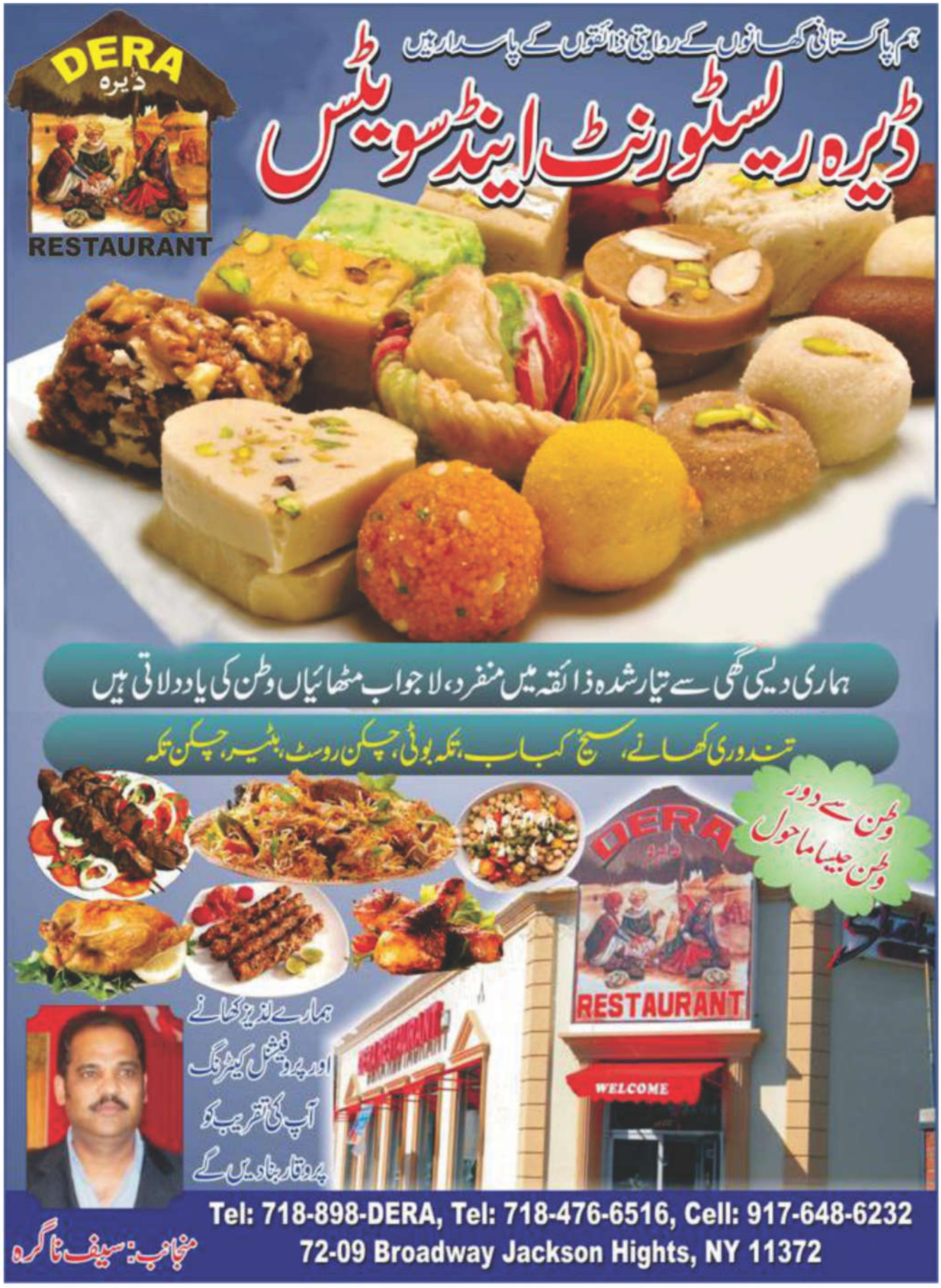

ہم پاکستانی کھانوں کے روایتی ذائقوں کے پاسدار ہیں
ڈیرہ ریسٹورنٹ اینڈ سویٹس
DERA
ڈیرہ
RESTAURANT
ہماری دیسی گھی سے تیار شدہ ذائقہ میں منفرد، لاجواب مٹھائیاں وطن کی یاد دلاتی ہیں
تندوری کھانے، سیخ کباب، تکہ بوٹی، چکن روسٹ، بٹیر، چکن تکہ
وطن سے دور
وطن جیسا ماحول
DERA
RESTAURANT
WELCOME
ہمارے لذیز کھانے
اور پروفیشنل کیٹرنگ
آپ کی تقریب کو
پروقار بنادیں گے
Tel: 718-898-DERA, Tel: 718-476-6516, Cell: 917-648-6232
72-09 Broadway Jackson Hights, NY 11372
منجانب: سیف ناگرہ

عالمی مجلس مشاورت

پروفیسر ڈاکٹر سلیم مظہر (پاکستان)
ڈائریکٹر جنرل: ادارہ فروغ قومی زبان، اسلام آباد

ڈاکٹر طارق چھتاری (انڈیا)
سابق صدر شعبہ اردو: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی

ڈاکٹر نجیبہ عارف (پاکستان)
چیئر مین ادبیات پاکستان

پروفیسر ایس اے شکور (انڈیا)
سکریٹری ڈائریکٹر اردو اکیڈمی، معتمد عمومی ادارہ ادبیات تلنگانہ

ڈاکٹر یوسف خشک (پاکستان)
وائس چانسلر خیر پور یونیورسٹی، سندھ

ڈاکٹر سید صادق علی (انڈیا)
ڈائریکٹر عربی، فارسی اردو انسٹی ٹیوٹ ٹونک، حکومت راجستھان

ڈاکٹر فاطمہ حسن (پاکستان)
سابق سکریٹری: انجمن ترقی اردو پاکستان

ڈاکٹر ادریس احمد (انڈیا)
ڈائریکٹر غالب انسٹی ٹیوٹ، نیو دہلی

ڈاکٹر غلام ربانی (بنگلہ دیش)
شعبہ اردو ڈھاکہ یونیورسٹی

پروفیسر شمس الہدیٰ دریابادی (انڈیا)
صدر شعبہ اردو مولانا آزاد نیشنل یونیورسٹی، حیدرآباد

ڈاکٹر علی بیات (ایران)
شعبہ اردو تہران یونیورسٹی

ڈاکٹر صبا عالم (برطانیہ)
شیفلڈ یونیورسٹی، ساؤتھ یارکشائر

ڈاکٹر ابراہیم محمد ابراہیم (مصر)
صدر شعبہ اردو: الازہر یونیورسٹی

اشفاق حسین (کینیڈا)
ممتاز ادیب وشاعر

پروفیسر ڈاکٹر خلیل طوقار (ترکی)
صدر شعبہ اردو استنبول یونیورسٹی

پروفیسر ڈاکٹر افروز تاج (امریکہ)
یونیورسٹی آف نارتھ کیرولینا

آصف علی عادل (ماریشس)
سابق صدر شعبہ اردو، مہاتما گاندھی انسٹی ٹیوٹ

ڈاکٹر شاہ زمان حق (فرانس)
صدر شعبہ اردو، انالکو

ڈاکٹر مرغوب حسین (جاپان)
شعبہ اردو، اوساکا یونیورسٹی جاپان

نوشی گیلانی (آسٹریلیا)
ادیبہ، شاعرہ

قیمت فی شمارہ:

پاکستان 300 روپے — امریکہ: 10 ڈالر

ہندوستان: 125 روپے — برطانیہ: 5 پاؤنڈ

(علاوہ ڈاک خرچہ)

دیگر ممالک کے لئے رابطہ کریں: 212-470-0660

دُنیائے اردو کا پہلا بین الاقوامی ادبی جریدہ

ISSN: 2992-9946

بانی: ڈاکٹر سعید وارثی

سہ ماہی ورثہ نیویارک

نیویارک، دہلی، کراچی سے بیک وقت شائع ہوتا ہے

جلد نمبر 4، شمارہ نمبر 12، جولائی تا ستمبر 2024ء

عالمی اردو ادب وثقافت کا نمائندہ

سر پرستِ اعلیٰ: پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی — نگرانِ اعلیٰ: ڈاکٹر پیرزادہ قاسم

سر پرست: افتخار عارف — نگران: پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی

چیف ایڈوائزر: پروفیسر عبدالرحیم قدوائی

مجلس ادارت

ڈاکٹر شبیر احمد قادری، ڈاکٹر فائزہ عباسی
ڈاکٹر شیر علی خان، پروفیسر ناصرہ بصری
ڈاکٹر چمن لال، خالد معین
ڈاکٹر عبدالرشید منہاس، پروفیسر ابوسفیان اصلاحی

مدیر اعلیٰ: ——— رئیس وارثی
مدیر: ——— نصیر وارثی
معاون مدیر: ——— مرزا حفیظ اوج

ریذیڈنٹ ایڈیٹر

انڈیا ——— پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی
پاکستان ——— ڈاکٹر صدف نقوی

پبلیشر: نصیر وارثی

Zara Management Inc.
62 W 47th Street, New York, 10036
Ph: 212-470-0660/1800-675-1138
Email: urdumarkazusa@gmail.com
Website: www.wirsaurdu.com

منیجر پبلی کیشنز: محمد اویس خان وارثی
ڈائریکٹر مارکیٹنگ: چوہدری امتیاز انور
انچارج نیوز ڈسک: عشرت وارثی
انچارج پبلک ریلیشنز: ڈاکٹر حنا امبرین طارق
انچارج سرکولیشن: حمید وارثی

بین الاقوامی معاونین خصوصی و نمائندہ گان

پاکستان

کراچی: محسن نقی — راولپنڈی: مظہر حسین سید
اسلام آباد: عثمان غنی رعد — ملتان: محمد بلال مصطفیٰ
لاہور: سلمان رسول — کوئٹہ: محسن شکیل
پشاور: ڈاکٹر اسحاق وردک
فیصل آباد: محمد فاروق بیگ، شہزاد بیگ

ہندوستان

دہلی: عرفات حسین شاہ — پٹنہ (بہار): ڈاکٹر صفدر امام
لکھنؤ: عادل فراز — جموں کشمیر: ڈاکٹر شہناز قادری
کولکاتا (بنگال): ڈاکٹر شبانہ نسرین — مہاراشٹرا: ڈاکٹر آمنہ فاروقی
بینگلور (کرناٹک): سلمیٰ صنم — مرادآباد: ڈاکٹر ارشد اقبال
ممبئی: وسیم عقیل شاہ — میرٹھ: پاپولر میرٹھی
حیدرآباد: ڈاکٹر نور عالم

سعودی عرب: سہیل ثاقب — ایران: ہادی شمس الہی — برطانیہ: فہیم اختر — آسٹریلیا: طارق محمود مرزا
کینیڈا: مشرف حسنی — نیپال: ڈاکٹر ثاقب ہارونی — بنگلہ دیش: محی الدین ہمدم — جرمنی: عشرت معین سیما
مصر: ڈاکٹر ولاء جمال العسلی — جاپان: ناصر ناکاگاوا — سویڈن: حنا خراسانی رضوی — یو ایس اے: خالد الطاف

شائع کردہ: ورثہ پبلی کیشنز، اردو مرکز نیویارک

اداریہ

قرآنی آیت

اِنْ تُبْدُوا الصَّدَقٰتِ فَنِعِمَّا هِیَ وَاِنْ تُخْفُوْهَا وَ تُؤْتُوْهَا الْفُقَرَآءَ فَهُوَ خَیْرٌ لَّكُمْ وَ یُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِّنْ سَیِّاٰتِكُمْ

(البقرہ:271)

"اگر خیرات علانیہ دو تو وہ کیا ہی اچھی بات ہے اور اگر چھپا کر فقیروں کو دو یہ تمہارے لئے سب سے بہتر ہے اور اس میں تمہارے کچھ گناہ گھٹیں گے۔"

حدیث مبارکہ

رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"بے شک مخفی صدقہ ربّ تعالیٰ کے غضب کو بجھاتا ہے"۔

(معجم کبیر، ج ۱۹، ص ۴۲۱، حدیث: ۱۰۱۸)

عالمی شہرت یافتہ اردو انٹرنیشنل جرنل سہ ماہی ''ورثہ'' نیویارک امریکہ کا تازہ شمارہ نمبر 12 جلد 4 آپ کے پیش نظر ہے۔ جو پابندی سے باذوق قارئین کی نظر نواز ہوتا رہتا ہے۔ جناب رئیس وارثی مدیر اعلیٰ اور جناب نصیر وارثی مدیر کی زیر نگرانی، بے لوث سرپرستی، مخلصانہ کاوشوں اور بے پناہ ادبی جذبہ اس کی اشاعت اور معیار میں نسبتاً ہر شمارہ بہتر اور جاذب توجہ کا باعث بنتا ہے۔ اس کے بیک وقت تین ایڈیشن امریکہ، دہلی اور کراچی کی اشاعت کامیابی سے ہمکنار ہیں۔ ڈاکٹر صدف نقوی، صدر شعبہ اردو فیصل آباد و یمن یونیورسٹی کراچی کو ریذیڈنٹ ایڈیٹر کے طور پر اس کی ذمہ داری دی گئی ہے جبکہ دہلی ایڈیشن کے ریذیڈنٹ ایڈیٹر کی ذمہ داری خاکسار نے بخوشی قبول کی ہے۔ مقام مسرت ہے کہ حال ہی میں معروف تخلیق کار اور عالمی شہرت یافتہ شاعر و ادیب جناب رئیس وارثی صاحب مدیر اعلیٰ 'ورثہ' اور اردو مرکز نیویارک کے بانی صدر کو ''امریکہ صدارتی ایوارڈ'' سے سرفراز کیا گیا۔ ادارہ موصوف کو خراج تحسین پیش کرتا ہے۔ بڑی خوش آیند بات ہے کہ اردو زبان و ادب کی ترویج و اشاعت اور فروغ و ارتقا کے لیے اردو مرکز نیویارک امریکہ ہمیشہ سرگرم عمل رہتا ہے اور عالمی سطح پر اہل قلم اور خصوصاً نئی نسل کے قلم کاروں کی ادبی رہنمائی اور حوصلہ افزائی کو اپنی اخلاقی ذمہ داری تصور کرتا ہے۔ بین الاقوامی جریدہ 'ورثہ' سہ ماہی نیویارک علمی، ادبی، تہذیبی و ثقافتی سرگرمیوں کا ترجمان ہے جو عالمی سطح پر بین لسانی و ترسیلی رابطوں میں موثر ذریعہ ثابت ہوا ہے اور لسانی و تہذیبی وحدتوں کے درمیان ایک روایت بنتا جا رہا ہے۔ ورثہ کے ذریعہ انڈو پاک کے علاوہ جرمنی، انگلستان، فرانس، ناروے، اٹلی، امریکہ، کینڈا، ماریش کے علاوہ خلیجی ممالک مثلاً سعودی عرب، مسقط، کویت، قطر، دوبئی کے علاوہ چین و جاپان تک ساری دنیا کے ممالک میں جہاں بھی اردو بستیاں موجود ہیں ''ورثہ'' اپنی شناخت قایم کر چکا ہے۔

اردو دنیا کی تیسری سب سے بڑی بولی جانے والی زبان ہے۔ اکیسویں صدی کے تناظر میں اردو کی ترویج و اشاعت اور ارتقا نے میں 'ورثہ' نے کلیدی کردار ادا کیا ہے۔ اس جرنل کے ذریعہ مدیران 'ورثہ' اس اہم ذمہ داری کو بحسن و خوبی انجام دے رہے ہیں۔ اس شمارے میں دانشوران علم و فن اور عالمی شہرت یافتہ اہل قلم حضرات کی گراں قدر تحریریں اور قیمتی آرا بھی شامل رہی ہیں۔ قارئین کی عالمانہ قیمتی آراء نے ''ورثہ'' کو گلوبل کردار عطا کیا ہے۔ ادارہ قارئین ورثہ مجلس ادارت و مشاورت نیز مختلف ممالک میں اس کے باشعور نمائندگان کی مخلصانہ کاوشوں اور قدر افزائی کا بھی صمیم قلب سے ممنون ہے۔ اردو مرکز نیویارک کے تحت گذشتہ آن لائن پروگراموں کا انعقاد عمل میں آیا۔ ان میں اردو ڈرامہ کا عالمی منظر نامہ، اردو ترجمہ نگاری اور رثائی ادب موضوعات شامل ہیں۔ گذشتہ ساٹھ ستر برسوں سے اردو میں ہندسوں اور رقموں کے لکھنے کا رواج اور استعمال مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ تعلیم یافتہ طبقہ عام طور پر ان رقموں اور ہندسوں کی اشعال کا مطلب نہیں سمجھ پاتا۔ اس کی تفصیل بہشتی زیور کے حصہ اول میں موجود ہے۔ اردو ہندسوں اور گنتی کو استعمال میں لانے کی ضرورت ہے۔ زبان ایک نظام (System) ہے غالباً اس لیے زبان کو صوتی علامات کا ساختیاتی نظام یعنی Structured System of Voice Symbol کہا ہے۔

سماجی اور زبان کا گہرا باہمی ربط ہے۔ عالمی سطح پر جہاں زبانوں کی کثرت ہے وہاں اجتماعی اور انفرادی سطح پر موقع و محل کے لحاظ سے لوگ الگ الگ زبانوں کا استعمال کرتے ہیں۔ لیکن جب زبانیں ایک دوسرے کے ساتھ یا ایک دوسرے کے درمیان رہنے لگتی ہیں تو یہ لسانی ربط نہ صرف یہ کہ لفظیات کی سطح پر بلکہ صرف و نحو کی سطح پر بھی قائم ہو جاتا ہے اور یہ امر سماجی لسانیات میں استدقاق یعنی Convergence سے مطابقت رکھتا ہے۔ زبانوں کے اس لین دین سے جو بھی نئی زبان پیدا ہوتی ہے اسے Pidgin زبان کہتے ہیں کیونکہ انتشار سے اتحاد کا عمل بولی سے معیاری زبان کا عمل ہے۔ لیکن اردو کی امتیازی خصوصیت یہ ہے کہ یہ براہ راست معیاری زبان کی شکل میں سامنے آئی مصحفی نے سب سے پہلے 1780 میں لفظ اردو کا استعمال کیا اور انشا کی دریائے لطافت میں 'مادری زبان' کا لفظ ملتا ہے۔ اس کے بیشتر ماخذ مضبوط میاتی تراجم (Sementic Translations) ہیں۔ بین الاقوامی اردو سہ ماہی 'ورثہ' کا مقصد نہ صرف زبان کی ترویج و اشاعت اور فروغ و ارتقاء ہے بلکہ مشترکہ تہذیب و ثقافت کو عالمی سطح پر نئی سمت و رفتار سے ہمکنار کرانا بھی ہے۔ نئے اور پرانے چراغوں کی تخلیقات 'ادبی شہ پارے نیز فنی بصیرت کو اردو مرکز کے پلیٹ فارم سے شناخت کرانا بھی ہے۔ اس مقصد کی تکمیل کے لیے مدیران اور مجلس مشاورت و ادارت اور دیگر نمائندگان کی کاوشیں ہمیشہ جاری رہتی ہیں۔ زیر نظر شمارے میں شامل اہل قلم کی گراں قدر تحریریں لائق تحسین ہیں۔ ادارہ ان کی قلمی شمولیت کا ممنون ہے۔ توقع ہے کہ اہل قلم اور ارباب نظر اور باذوق قارئین کے مفید مشوروں اور قلمی تعاون سے مستقبل میں نئے عزم کے ساتھ بہتر تخلیقات اور فکر انگیز تحریریں پیش کر سکیں گے۔

پروفیسر ضیاء الرحمٰن صدیقی
(شعبہ اردو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ)
ریذیڈنٹ ایڈیٹر سہ ماہی ورثہ نیویارک

سرپرستِ اعلیٰ:
پروفیسر صدیق الرحمن قدوائی
(صدر انجمن ترقی اردو ہند، ڈائریکٹر
غالب انسٹی ٹیوٹ)

بانی:
ڈاکٹر سعید وارثی

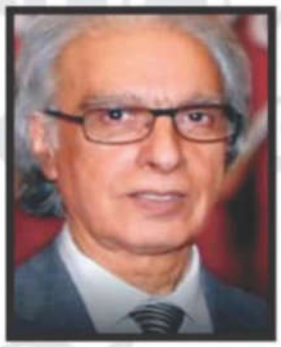

نگرانِ اعلیٰ:
ڈاکٹر پیرزادہ قاسم
(سابق وائس چانسلر، جامعہ کراچی)

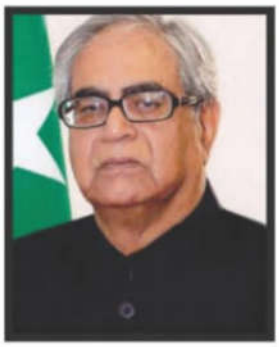

سرپرست:
افتخار عارف
(سابق صدر نشین مقتدرہ قومی زبان،
پاکستان)

چیف ایڈوائزر:
پروفیسر عبدالرحیم قدوائی
(ڈائریکٹر قرانک سینٹر، علی گڑھ مسلم
یونیورسٹی)

نگران:
پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی
(شعبہ اردو، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی)

چیف ایڈیٹر:
رئیس وارثی

ایڈیٹر:
نصیر وارثی

ریزیڈنٹ ایڈیٹر: پاکستان
ڈاکٹر صدف نقوی

فہرست	صفحہ نمبر
حمد (ناصر زیدی)، نعت (مولانا ابوالکلام آزاد)، منقبت (میکش اکبرآبادی)	4
گوشۂ انٹرویو	
انٹرویو سید تقی عابدی (ڈاکٹر صدف نقوی)	5
گوشۂ مضامین	
ٹیگور کی آفاقی شخصیت (مصیف الرحمن)	8
مراثی انیس میں ذکرِ اطفال اسیرانِ کربلا (ڈاکٹر ریحان حسن)	10
انشائیہ کے بانی ڈاکٹر وزیر آغا (واجدہ تبسم)	14
قیامِ یورپ اور علامہ اقبال کی ماہیت قلبی (طارق محمود مرزا)	17
خالد معین شاعر سے معتبر ناول نگار تک (ڈاکٹر ارشد رضوی)	19
علیگڑھ کے دو ہمعصر شاعر: جذبی اور مجاز (ڈاکٹر تبسم جہاں)	21
عصمت چغتائی کی ناول نگاری (ڈاکٹر عبدالرشید منہاس)	25
علی بن احمد مختشم کاشانی اور میر ببر علی انیس کی شاعری کا تقابلی مطالعہ (سلیمان زارع)	28
ساحر لدھیانوی: اپنے افکار کے دریچے سے (ڈاکٹر شبانہ نسرین)	30
ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی بصیرت (نصیر وارثی)	35
مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری (شیخ فاطمہ کرمانی، شیخ نصیر)	39
قتیل شفائی: برصغیر کے اہم ترین شاعر (سراج زیبائی)	42
پیکر علم و عمل: پروفیسر ہارون الرشید۔ تاثراتی خاکہ (محی الدین ہمدم)	45
اجمیر کے چند نامور شعراء (ڈاکٹر فرخندہ ضمیر)	50
سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی اردو کے پہلے ادیب و مصنف: دلائل و شواہد کے تناظر میں (طفیل احمد مصباحی)	53
گوشۂ نعتیہ ادب	
متاع از راجا اویس (ڈاکٹر ریاض مجید)	60
تفرداتِ جہاندار بحوالہ اجمعین (مرزا حفیظ اوج)	65
گوشۂ غزل	
انصر رشید، نیاز جیراجپوری، شاداب احسانی	67
گل بخشالوی، عنبریں حسیب عنبر، ڈاکٹر فیاض احمد علیگ	68
ریپ (نظم) نصیر وارثی	68
گوشۂ افسانہ	
کلموہی (حنا خراسانی رضوی)	69
تحت الثریٰ کی دُکھتی رگیں (ڈاکٹر توصیف بریلوی)	71
خونی لکیر (رمانہ تبسم)	75
خصوصی رپورٹ: مشرف حسنی	78
عالمی ادبی خبریں (ترتیب: عشرت وارثی)	79
گوشۂ کتب	85
اُمِ زہرہ سیدہ خدیجہ از نصیر وارثی اشاعت کے آخری مراحل میں	86
نصیر وارثی کا پہلا نعتیہ مجموعہ کلام عشقِ شاہِ امم اشاعت کے قریب	87
گوشۂ یادِ رفتگاں	
ڈاکٹر عبادت بریلوی	88
نیاز فتحپوری	88
فراق گورکھپوری	89
سعادت حسن منٹو	90
خدیجہ مستور	90
بیسویں صدی کی ایک عظیم شخصیت کا تعارف: ڈاکٹر محمد حمید اللہ	91

حمد

ناصر زیدی

ہمسر ہے کون تیرا سارے جہان والے
سب ہیں ترے ثنا خواں ، اے آسمان والے

ہر سمت ہیں بہاریں، تیرے ہی دم قدم سے
ہر جا ہے فیض تیرا، کون و مکان والے

ربِ رحیم ہے تو ، کتنا کریم ہے تو
در کے ترے گدا ہیں، سب آن بان والے

جینے کا کیا تصور ، ترے بغیر مولا !
تُو ہے تو یہ جہاں ہے، دونوں جہان والے

تُو ہے ازل سے یارب ! دائم ہے تُو ابد تک
کتنے ہی مِٹ گئے ہیں ، نام و نشان والے

نعت

مولانا ابوالکلام آزاد

ہے اُمتِ رسول سے جنت بھری ہوئی
جنت میں ہے رسول کی اُمت بھری ہوئی

معمور دل ہے یادِ شہِ مشرقین سے
اس گھر میں دو جہاں کی ہے دولت بھری ہوئی

میں افصح العرب کا ثنا گو ہوں دوستو
کیوں کر نہ ہو سخن میں فصاحت بھری ہوئی

پاتے تھے لوگ خطبۂ احمد سے لذتیں
کیا بات بات میں تھی حلاوت بھری ہوئی

ہے قدسیانِ خاص کو بھی آپ سے خلوص
دل میں ہے ہر ملک کے ارادت بھری ہوئی

کعبہ سے منزلت میں نہیں کم دلِ حزیں
ختمِ رُسل کی ہے جو محبت بھری ہوئی

آزاد پر بھی ہو نگہِ لطف یا رسول
ہے دل میں آرزوئے شفاعت بھری ہوئی

منقبت

میکش اکبر آبادی

علی جلال خدا ہیں علی کمال خودی
علی جمال نبی ہیں زہے جمال نبی

علی مکین و مکاں ہیں علی زمین و زماں
علی عیاں و نہاں ہیں علی خفی و جلی

یہ قید نام و نشاں لا الہ الا اللہ
یہاں علی ہی علی ہیں وہاں علی ہی علی

علی حسین کے والد علی بتول کے زوج
علی نبی ﷺ کے وصی ہیں علی خدا کے ولی

علی وہ شیر الٰہی ملوکیت دشمن
جلا نا عہد میں جس کے چراغ بادشہی

علی کا فقر ہے تیغ و جہاد و فکر و عمل
علی کا فقر نہیں ہا و ہوئے خانقہی

علی کا علم ہے جذب و سرور و وجد و حضور
علی کا علم نہیں بحث شیعی و حنفی

قلمکاروں سے گزارش

عالمی جریدہ 'ورثہ' نیویارک کے اہل قلم حضرات کی خدمت میں التماس ہے کہ وہ اپنی نگارشات ارسال کرتے وقت اپنے سوانح کوائف، موبائل نمبر اور ای میل ضرور ارسال کریں۔ غیر مطبوعہ نگارشات کو ترجیح دی جائے گی۔ شائع شدہ مضامین کے لیے حوالہ ضروری ہے۔ نگارشات موصول ہونے کے بعد تقریباً دو شماروں تک کے شائع ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔ نگارشات Inpage Urdu یا Word فائل میں ہی ارسال فرمائیں۔ یاد رہے کہ عالمی جریدہ 'ورثہ' نیویارک اردو زبان و ادب کے فروغ اور ترویج و اشاعت کے لیے پابندی سے شائع کیا جاتا ہے جو تحقیق و تنقید، تخلیقی ادب نیز عالمی سطح پر اردو صحافت کے نمائندے کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ مزید براں جواں سال قلم کاروں کی بطور خاص شمولیت کا متحمل ہے۔

ہدایت: موصول شدہ قلم کاروں کی تحریروں سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ کسی بھی قسم کی قانونی چارہ جوئی صرف نیویارک کی عدالتوں میں ممکن ہے۔

212-470-0660-1800-675-1138 nawarsi@aol.com urdumarkazusa@gmail.com

گوشہء انٹرویو

سید تقی عابدی

ڈاکٹر صدف نقوی
صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد

سید تقی عابدی اردو ادب کے نامور محقق، نقاد، شاعر اور ادیب ہیں۔ کینیڈا میں رہائش پذیر ہیں۔ ماہر فزیشن ہیں۔ لیکن اردو ادب کی خدمت میں مشغول ہیں۔ 70 سے زائد کتب تصنیف کر چکے ہیں۔ ان کو گراں قدر اعزاز و انعامات سے بھی نوازا گیا ہے۔ اردو کی نئی بستیوں کے روحِ رواں ہیں۔

ہے متاع آگہی سید تقی عابدی
معتبر و دانشوری سید تقی عابدی
علم و فن کی خسروی سید تقی عابدی
ایک مرد آہنی سید تقی عابدی

پاکستان آمد پر ڈاکٹر صدف نقوی صدر شعبہ اردو گورنمنٹ کالج ویمن یونیورسٹی، فیصل آباد، پاکستان، نے ان کا انٹرویو کیا:۔

ڈاکٹر صاحب یہ مرثیہ جو ہے خاص طور پر انیس اور دبیر کے حوالے سے آپ کیا سمجھتے ہیں دونوں میں سے کس کا مقام زیادہ ہے؟

دیکھیے مسئلہ کیوں کہ موضوع ایک ہے دونوں بڑے شاعر ہیں۔ دونوں کا تعلق لکھنو سے ہے۔ دونوں نے اپنے چاہنے والے کے گروپ انیسہ اور دبیریہ بنائے لیکن مفتی میر عباس کے جب کسی شخص کی چاہت نمکین ہو اور جب کسی شخص کی چاہت شیریں ہو یعنی کوئی شیریں کا عاشق ہو کوئی نمکین کا عاشق ہو تو ان دونوں کے درمیان تقابل کرنا دشوار ہوگا۔ تو انیس اور دبیر کا مسئلہ یہ ہے اگرچہ یہ دونوں مرثیہ کے شاعر ہیں لیکن ان کے جو اسلوب ہیں ان کے جو زادیے ہیں وہ بالکل جدا ہے۔ تو انصاف یہ ہے کہ ان کا تقابل نہ کیا جائے الگ الگ مقام رکھا جائے۔ اور جو ان سے لطف اندوز ہوتے ہیں وہ دوسرے سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے تو اسی وجہ سے میں یہ کہتا ہوں کہ میری ایک آنکھ انیسہ ہے اور ایک آنکھ دبیریہ ہے۔ ہم لوگ اردو کے لوگ ہیں ہمارا مقصد یہ ہے کہ اردو کے گیسو سنواریں اور یہ دونوں جو ہیں اردو کی آنکھیں ہیں۔ تو اس لحاظ سے دونوں عظیم شاعر ہیں۔ دونوں فصیح و بلیغ شاعر ہیں۔ دونوں کے پاس مضامین نوع کے انبار ہیں ایک کو دوسرے پر ترجیح دینا انصاف نہیں۔

2۔ ڈاکٹر وزیر آغا نے لکھا ہے کہ جو انیس نے مراثے لکھے ہیں صبح کے منظر کی انہوں نے عکاسی کی ہے۔ شام کے منظر کی عکاسی نہیں کی تو اس کی کیا وجہ ہے؟

وزیر آغا صاحب نے کہا ہے لیکن میں عرض کروں گا کہ واقعہ کربلا میں صبح عاشور، اذانِ علی اکبر، لشکر حسینی کا لشکر، یزید کے روبرو ہونا یہ سب مسائل صبح کے تھے۔ میں نے ایک مضمون لکھا ہے جس میں اکیس صبحیں صرف مرزا دبیر کی ہیں۔ دبیر عجیب شاعر ہیں۔ دبیر کے پچاس کے قریب مرثیے صرف لفظ صبح سے شروع ہوتے ہیں۔ انیس نے اپنے مرثیوں میں بھی صبح کے منظر کی عکاسی یوں کی ہے۔

جب قطع کی مسافت شب آفتاب نے
جلوہ کیا سحر کے رخِ بے حجاب نے
دیکھا سوئے فلک شہ گردوں رکاب نے
مڑ کر سدا رفیقوں کو دی اس جناب نے
آخر ہے رات حمد و ثنائے خدا کرو
اُٹھو فریضہ سحری کو ادا کرو

صبح کی جو ترکیب استعمال کی گئی ہیں۔ وہ انیس ہو یا دبیر۔ اور صبح کی جو کیفیت ہے کہ شبنم گر رہی ہے۔ پرندے چہک رہے ہیں۔ نسیم چل رہی ہے۔ لوگ اپنے کام میں مصروف ہیں۔ چونکہ یہ کام ایک صبحِ عاشور کی صبح ہو رہے ہیں۔ ایسا بھی نہیں کہ شام کے مناظر پیش نہیں کیے گئے ہیں۔ لیکن وہ محدود ہیں۔ جیسے شام، ''شام جب ہوئی تو زنداں کے در پر'' شعر یاد نہیں ہے۔ لیکن میں بتا رہا ہوں کہ شاعر نے یہ کہا کہ جب اندھیرا ہوا تو سکینہ نے دیکھا کہ ہر ایک اپنے بستر پر لیٹا ہوا ہے تو اس اندھیرے میں اس شام میں ہاتھ دیوار پر رکھتے رکھتے پہنچی ہے۔ دربانوں پر ہوتے ہوئے میں اپنا درد بتانے آئی ہوں۔ یہ صحیح ہے اس قدر عناوی تو شام پر نہیں ہے۔ لیکن شام غریباں کے جو مناظر ہیں وہ میری نظر میں چار مصرعوں کا یا غزل کی ہیت کا سلام ہو یا وہ مرثیہ جو تمہارے اردو ادب میں چودہ شعر سے لے کر آٹھ سو تر پن (853) تک مرثیہ اس وقت تک مطبوعہ موجود ہے۔ ان سب میں صبح کے مضامین زیادہ ہیں۔ اور شام کے مضامین کم ہیں۔ اس مرثیے کا بند دیکھیے:

بین تھا سکینہ کا شام ہونے والی ہے
کب تک آؤ گے بابا، شام ہونے والی ہے
عصر کے اجالے میں گھر لٹا کے بیٹھے ہیں

پھر نہ لوٹ لیں اعدا شام ہونے والی ہے

ایک چار سالہ بچی کی جو کیفیت ہے درد سے بھری چیز ہے تو اس کو ہماری اردو ادب میں شامل اس عورت کے گھر پر جو مشکل کھڑی ہے کہ اردو اب نے اس کو جذب کیا۔ اس پر اعتراض ہے کہ وہاں پر پرندوں کا چہکنا کیا کام ہے۔ وہاں پر خوشبوئے گل کا کیا کام ہے۔ لیکن لوگ یہ نہیں کہتے کہ یہ منظر نگاری نہیں یہ شاعری بھی ہے۔ تو انیس نے پہلے جواز حاصل کیا کہ جب واقعہ کربلا میں نواسہ رسول ﷺ کے قدم پڑے تو اس وجہ سے کربلا کی ہر چیز تازہ دم ہوگئی۔

چھپنا وہ ماہتاب کا وہ صبح کا ظہور
یادِ خدا میں زمزمہ پردازی طیور

یعنی شاعر نے ایک جواز حاصل کرلیا۔ امیجری باب کھول دینے پر شاعری کا کمال ہے تو کہنے کا مطلب یہ ہے کہ مرثیے کو تاریخ کی طرح سننا چاہیے۔

جنگل سے آئی فاطمہ زہرا کی یہ صدا
امت نے مجھ کو لوٹ لیا واحمد

"باقیات اقبال" کے حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

۱۹۵۲ سے باقیات اقبال کے حوالے سے انور حارث نے: مجموعہ "رختِ سفر" جو کہ 40 صفحوں پر ہے شائع ہوا۔ سب سے زیادہ اہمیت اس کو دیتا ہوں۔ میں اس کا مطالعہ کرتا ہوں نوٹس اور حوالے لیتا ہوں۔

باقیاتِ اقبال تدوین ہے، باقیات تالیف نہیں ہے۔ تشریح ہے تفسیر ہے۔ جب ان تینوں کو ملاتے ہیں تو تخلیق بن جاتی ہے۔ ''رختِ سفر'' سے لے کر جب ہم پہنچتے ہیں۔ صابر حسین کلوروی کی کتاب ''باقیات اقبال'' تک جو ایک باہوش محقق ہیں۔

صابر حسین کلوروی نے اخبارات اور رسائل کے جو 63 نام دیے جن میں 40 سے 45 تک رسالہ ایسے ہیں جن میں صرف اقبال کی نظم شائع ہوئی ہے۔ بہر حال شمع سے شمع جلتی ہے۔ میرے بعد بھی بہت کتابیں آئیں گی لیکن صابر کلوروی کی کتاب ایک مینار رہے گی۔ "باقیات اقبال" میں کچھ ایسا کلام ہے جو متروک ہے لیکن سارے کو متروک کہنا مناسب نہیں اقبال نے تمام نظمیں جو انجمن حمایت اسلام کی کہیں یا وہ نظمیں جو کسی ایک شخصیت یا تقریب کے لیے لکھیں ان کو شامل نہیں کیا۔

اقبال کے ہاتھ میں دیوان حافظ ہے۔ ایک دیوان غالب پھر اقبال نظم طباطبائی سے بھی رہنمائی لیتے ہیں۔ اقبال نے پنجاب ٹیکسٹ بک بورڈ کے کہنے پر بچوں کے لیے نظمیں لکھیں۔ جن کا اقبال کو معاوضہ دیا گیا۔ ان پر اقبال کا نام نہیں تھا۔ اقبال نے 13 نظمیں لکھیں۔ ان میں سے ایک بھی نظم اقبال کے کلام میں شامل نہیں ہے۔ شریعت شعر میں آپ شعر کسی کو نہیں دے سکتے۔ آپ دیکھیں کہ "باقیات اقبال" کے حوالے سے "عورت" اور "کشودکار" جیسی نظمیں سامنے آئیں۔ اگر اقبال کو یہ نظمیں مل جاتی تو وہ ضرور شائع کرتے۔

بیا تا ازیں انجمن بگزریم
ازیں کاخ وکوئے کہن بگزریم

(آؤ اس محفل سے نکل جائیں، ان محلوں اور پرانے گلیوں کوچوں سے نکل جائیں۔)

دگر خیمہ در کربلائے زنیم
بایں بے نوائی نوائے زنیم

(کربلا کے میدان میں خیمہ نصب کریں اس بے آسرائی میں ہمت کا نعرہ لگائیں۔)

نوائے کہ آتش کند خاک را
نوائے کہ واسوز دافلاک را

(وہ نعرہ جو خاک کو آگ کردے، وہ نعرہ جو آسمانوں کو جلا دے)

نوائے کہ بے ساز تقدیر نیست
نوائے کہ بے ضرب شبیر نیست

(وہ نعرہ جو بغیر عمل اور تقدیر کے نہیں، وہ نعرہ جو ضربت شبیرؑ کے بغیر نہیں۔)

اگر بندہ ایں نوائے زند
چو یزداں جہاں آفرینی کند

(اگر بندہ ایسا نعرہ لگائے تو وہ بھی پروردگار کی طرح دُنیا پر حکمرانی اور فتح حاصل کرسکتا ہے)

اس طرح کی نظموں کو ہم ردی کی ٹوکری میں نہیں ڈال سکتے کیونکہ یہ اقبال شناسی میں اہم کردار ادا کرسکتی ہے

اگر اقبال نے دانستہ طور پر ان اشعار کو اپنے متداول کلام میں شامل نہیں کیا تو ہم کیوں

انھیں باقیات کے عنوان سے شائع کریں؟

شعر شاعر کی ملکیت اور تخلیق ہے۔ شاعر کو پورا حاصل ہے کہ ان میں ترمیم کرے اسے تشہیر کرے یا اس کو ضائع کر دے۔ یہ سب عمل وہ اس وقت تک کر سکتا جب تک وہ زندہ ہے مگر شاعر دولت اور جائیداد کی طرح اپنے اشعار کو کسی اور کے نام نہیں کر سکتا۔ شریعت شاعری میں شعر کسی کو دینا جائز نہیں ہمیں پتا ہے بعض شاعروں نے اپنا پیٹ پالنے کے لیے شاعروں کو اپنے شعر بیچے جو اگرچہ مخمل میں ٹاٹ کے پیوند بن کے ظاہر ہوئے لیکن بعد میں بہت مقامات پر

نکال دیے۔

یہ عجیب ہے کہ کوئی شاعر شعر چھپنے کے بعد اس کو کتاب سے نکال دے۔ اگرچہ تخلیق شاعر کی ملکیت ہے لیکن اس سے استفادہ کرنا ہر صاحب ذوق کا حق بھی ہے۔ چناں چہ اگر شعر کسی رسالے، میگزین کتاب، روداد میں چھپ چکا ہے یا کسی صوتی آلے میں ریکارڈ ہو چکا ہو تو عوام کو روکا نہیں جا سکتا۔ ہر بڑے شاعر کے ساتھ ان کی زندگی کے بعد باقیات کا عمل جاری و ساری رہا۔ غالب کے اردو اشعار کی اعداد ساڑھے چار ہزار کے قریب پہنچ چکی ہے اس طرح اقبال کے متداول کلام کو جب ان کے باقیات سے مقابلہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ اقبال نے 42 فیصد کلام اردو میں شامل نہیں کیا۔ میر انیس اور مرزا دبیر اور درجنوں پر شعرا کے کلام ہمیں آئے دن ملتے رہتے ہیں، جن کو نوادرات کے نام سے شائع کیا جاتا ہے اور لوگ اس کا استقبال بھی کرتے ہیں۔

پس معلوم ہوا اقبال نے تحریری طور پر کوئی خاص ممانعت نہیں کی البتہ زندگی میں متعدد بار اس روش کو روکا کہ ان سے بغیر پوچھے ان کے اشعار شائع نہ کیے جائیں باقیات کے کلام کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اقبال کی نظروں سے کچھ کلام چھپا رہا ورنہ اس کو اقبال ضرور شائع کرتے یہ کلام معیاری اور کسی سقم کے بغیر شائع یا بیاضوں میں محفوظ ہو چکا تھا۔ شاید یہ کلام نظر انداز ہونے کی وجہ سے شائع نہ ہوا۔

ڈاکٹر صدف نقوی کی کتاب "رئیس شہر سخن" جو کہ صاحب اسلوب شاعر "رئیس وارثی" پر مشاہیر کے لکھے گئے 15 مضامین پر مشتمل ہے۔ اس حوالے سے آپ کیا کہیں گے؟

میں عرض کر رہا ہوں کہ میرے کوئی پینتیس سالہ روابط رئیس وارثی صاحب سے رہے ہم نے درجنوں آپ کے باہم مشاعرے پڑھے اردو مرکز نیویارک ہے یہ اس زمانے سے جب آپ نوجوان تھے کیونکہ یہ اس خاندان سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے والد اور ان کے بھائی دونوں نعت گو مشہور تھے اور میں نے آج سے کوئی 25 سال پہلے ان کی نعتیہ شاعری پر کولمبو یونیورسٹی میں لیکچر دیا تھا۔ اردو کی جو تاریخ لکھی جائے گی

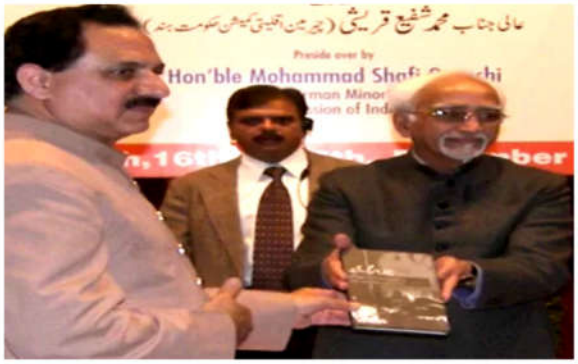

ممکن نہیں بغیر رئیس وارثی اور نصیر وارثی کے ذکر کے وہ کامل ہو سکے اور اب "ورثہ" ادبی جریدہ جو شائع کر رہے ہیں وہ انڈیا، پاکستان اور نیویارک سے بیک وقت شائع ہو رہا ہے۔ شب و روز اردو ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ کسی لحظہ ان کو آرام نہیں ہے۔ بہترین شاعر ہیں اور ان کا اب نعتیہ مجموعہ آ رہا ہے" کائنات دل" میں اس پر بھی رئیس وارثی کو مبارک باد پیش کرتا ہوں اور رئیس وارثی کو بھی یہ ایک انوکھا کام ہے اور کام اسی طریقے سے آگے کرتے ہیں ہم نے بتایا جیسا کہ مل کر اردو کا کام کیے ہیں اور یہ اردو دان 45 یا 46 سال سے یا اس سے کم نیویارک میں مقیم ہے یہ کام کر رہے

ہیں۔ میں پورے طریقے سے اس کا استفادہ کروں گا اسی وجہ سے آپ مضامین دیکھ رہے ہیں کہ وہ ضمیر جعفری ہو یا امجد اسلام ہو یا جو شاعر ہو کیونکہ ان شاعروں میں شرکت کرتے تھے رئیس صاحب ان کے بارے میں گفتگو کرتے تھے یہ پورا منظر نامہ میرے سامنے میرے سامنے ہے میں ڈاکٹر صدف نقوی کو اس کتاب پر مبارک باد پیش کرتا ہوں۔

حالیہ دنوں میں ڈیجیٹل پلٹ فارمز اور انٹرنیٹ کی آمد نے اردو سوانح عمری کے منظر نامے کو مزید تبدیل کر دیا ہے۔ سوانحی معلومات اب آسانی سے آن لائن قابل رسائی ہے، اور لوگوں کی زندگی کی کہانوں کو محفوظ کرنے اور ان کا اشتراک کرنے کے لے، ڈیجیٹل آرکاوئیز بنانے کا بڑھتا ہوا رجحان ہے۔

گوشہ ء مضامین

ٹیگور کی آفاقی شخصیت

مصیف الرحمٰن
علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ، انڈیا

ٹیگور کی خلاقانہ طبیعت میں اوائل عمر ہی سے فطرت کی بے بہا فیاضیاں روحانی نغمگی، معرفت کی تلاش وجستجو اور ویشنو شعرا کے صوفیانہ کلام سے گہرا عشق، عارفانہ مزاج، مطالعہ کا شوق، کلاسیکی صوفی شعرا کے کلام سے گہری ذہنی وابستگی نے ٹیگور کی آفاقی شخصیت کی تکمیل میں اہم کردار ادا کیا۔

ٹیگور کے والد دیبندر ناتھ ٹیگور کی تربیت اور گھر کے علمی وروحانی ماحول نے ان کے ادبی وتخلیقی مزاج کو اور بھی جلا بخشی کیونکہ وہ خود بھی علمی اور روحانی مزاج کے حامل تھے۔ سیاحت سے انہیں گہری دلچسپی تھی۔ قلندرانہ مزاج رکھتے تھے اور صوفی منش انسان واقع ہوئے تھے۔ یہ خانوادہ اپنی زمیندارانہ شان، علمی بصیرت اور تخلیقی شناخت کے لیے بڑی قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ان کے والد کی تمام عمر روحانیت کی تلاش وجستجو میں گزری۔ بنگالی، سنسکرت، ہندی اور فارسی زبانوں پر انہیں دسترس حاصل تھی۔ فنون لطیفہ سے انہیں بڑا لگاؤ تھا۔ مسلمانوں کے تخلیق کردہ ادب سے بھی انہیں بہت دلچسپی تھی۔ وہ شیرازی، حافظ اور مولانا روم کی متصوفانہ شاعری سے بہت متاثر تھے۔ ٹیگور کے والد کا ان کے بچپن ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔

آسودہ حال گھرانے میں ٹیگور کا جنم ہوا۔ چودہ بہن بھائی تھے۔ ٹیگور کی دیکھ ریکھ نوکروں کے ذمہ تھی۔ اسی لیے وہ گھر کی چار دیواری میں رہ کر باہری دنیا سے ہمیشہ بے خبر رہے۔ کمرے کی کھڑکی سے کھڑے ہو کر گھنٹوں قدرت کی بے بہا فیاضیوں اور فطری مناظر سے لطف اندوز ہوتے رہتے تھے۔ انہوں نے اپنے والد کے ساتھ پنجاب اور ہمالہ کے خوبصورت پہاڑی علاقوں کی سیاحت کی تھی۔ ٹیگور کی ابتدائی شاعری ۱۸۷۳ء میں متعدد جگہوں پر ہمالہ کی خوبصورت وادیوں کا ذکر ملتا ہے۔

۱۸۷۸ میں ان کے بڑے بھائی نے انہیں بیرسٹر بنانے کی غرض سے ہندوستان سے باہر بھیجا لیکن ۱۸۸۰ میں وہ سند لیے بغیر ہی وطن واپس لوٹ آئے۔ انگلستان کی فضا انہیں راس نہیں آئی لیکن ٹیگور کا یہ سفر ضایع نہیں گیا۔ وہاں ان کی ملاقات لندن یونیورسٹی کے پروفیسر ہینری میور سے ہوئی۔ ان کے لیکچروں نے انہیں بہت متاثر کیا اور وہیں سے وہ اپنی شاعری میں ایک مخصوص رنگ اور سیمابی کیفیت پیدا کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۸۷۷ کے 'بھارتی' رسالے میں بھانوسمہا کے تخلص سے نظمیں شائع کرائیں۔ اگرچہ بچپن ہی سے انہیں روبی کے نام سے جانا جاتا رہا۔

ٹیگور عالم انسانیت میں محبت کے قائل تھے۔ وہ خدا کی سرزمین پر انسانوں کو خوش خرم دیکھنا چاہتے تھے اور شعر ونغمہ اور موسیقی کے بیش بہا خزانے سے اس کے دامن کو مالا مال کرنا چاہتے تھے۔ ٹیگور نے خود کو بنیادی طور پر شاعر کہا ہے۔ ٹیگور کا بیان ہے۔

''میں مختلف طریقوں سے ظاہر ہونے والی آواز ہوں، میں اس لامحدود کی آواز ہوں جس کے بے شمار پہلو ہیں اور یہ سب پہلو مختلف النوع ہیں''۔

۱۹۱۰ء میں ٹیگور کا عظیم شعری مجموعہ 'گیتا نجلی' کے نام سے شائع ہوا۔ ۱۹۱۱ میں اس کا انگریزی ترجمہ انڈین سوسائٹی لندن نے کروایا اور ٹی ایس ایلیٹ کے دیباچہ کے ساتھ ۱۹۱۲ میں شائع ہو کر منظر عام پر آیا۔ ۱۳ نومبر ۱۹۱۳ کو انہیں گیتا نجلی پر نوبل پرائز سے سرفراز کیا گیا۔ ۱۹۱۵ میں انہیں ''سر'' کے خطاب سے نوازا لیکن انہوں نے جلیانوالہ حادثہ کے خلاف ۱۹۱۹ء میں یہ خطاب واپس کر دیا۔

۱۸۶۱ء میں پیدائش ہوئی۔ ۱۹۴۱ء میں وفات پائی۔ ٹیگور نے اپنی زندگی کے آٹھ دہائیوں کے سفر میں بنگلہ ادب کو گہرے فکر وخیال اور بیش بہا خزانوں سے سیراب کیا۔ عالمی جنگ کی تباہ کاری دیکھی، ۱۹۱۷ کا پہلا اشتراکی انقلاب دیکھا اور ظلم وستم اور لوٹ مار کے خلاف ٹیگور نے فیصلہ کن جنگ شروع کی۔

شاعری میں ٹیگور کے کارنامے ان کے گیت ہیں۔ حب الوطنی ایک فطری صفت اور عمل کے طور پر رونما ہوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ فراق گورکھپوری کا خیال ہے۔

''ٹیگور ہندوستانی تہذیب کی وراثت، محفل، دربار کے خاص طور طریقے، بنگال کے عوام کی زندگی کے سہج حقائق اور جدید یورپ کی قوت عمل اور توانا عقلیت کے امتزاج سے رابندر ناتھ کی شاعری رونما ہوئی، وہ سبھی تہذیبوں کے حقدار ہیں''۔ (دیباچہ ایک سو ایک نظمیں مترجم فراق گورکھپوری۔ ساہتہ اکیڈمی، نئی دہلی)

ٹیگور کی ادبی زندگی ساٹھ سال کے عرصہ کو محیط ہے۔ انہوں نے ہندوستان کی قدیم تہذیب کے بہتر عناصر کو قبول کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس کی مثال وشو بھارتی سے دی جاسکتی ہے۔ ان کے تمام تصورات کی بنیاد وطنیت پر تھی۔ اسی لیے انہوں نے آزادی ہند کی حمایت میں گیت اور نظمیں تخلیق کیں۔ ان کے یہاں باطنیت اور تصوف

Mysticism کا تخیل بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ وہ ہمیشہ حسن کی تلاش میں رہے اور اپنے گردوپیش کے سیاسی ماحول اور تحریکات سے بھی باخبر رہے۔ تعلیمی امور میں بھی ان کا دخل رہا۔ ٹیگور کی سیاسی تحریکات سے وابستگی کا آغاز ۱۹۰۵ سے متعین کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت تقسیم بنگال کے خلاف سیاسی تحریکیں زور پکڑ رہی تھیں۔ ٹیگور ان تحریکوں میں شامل رہے۔ ٹیگور کو لوک مانیہ تلک نے ہندوستان میں جاری جدوجہد آزادی کی کامیابی کے حصول کے لیے یورپ میں سفیر کی حیثیت سے سفیر بنا کر بھیجنے کا ارادہ کیا۔ جس کے ذریعہ دیگر ممالک کے عوام کو ہندوستان کے ثقافتی ورثہ سے واقف کرسکیں اور ہندوستان کے لیے خیر سگالی کا جذبہ بیدار کرسکیں۔ جلیانوالہ باغ ۱۹۱۹ کے عظیم سانحہ کے بعد ٹیگور نے ''سر'' کا خطاب واپس کرتے ہوئے کہا تھا۔

''وقت آ گیا ہے کہ جب اعزاز کے تمغے ہمارے جذبہ غیرت وحمیت کو ذلت وتحقیر کے مقابلے میں زیادہ تیز کر دیتے ہیں اور جہاں تک میری ذات کا تعلق ہے میں یہ چاہتا ہوں کہ تمام امتیازی اعزاز واکرام سے علیحدہ ہو کر اپنے ہم وطنوں کے ساتھ کھڑا ہو جاؤں''۔

ٹیگور کے بلند تخیلات میں حب الوطنی کا جذبہ پوشیدہ تھا۔ انہوں نے ہندوستان کی زمین پر اپنے دل کی دنیا کو آباد کرنے کے لئے تصور اور حب الوطنی کے باغ لگائے۔ اپنی ایک نظم میں فرماتے ہیں کہ میرے دل میں ذرا بھی بہشت کی آس نہیں ہے۔

ٹیگور نے اپنی عمر کے آخری دور میں جو نظمیں تخلیق کیں ان میں اپنی مٹی سے عقیدت کا اظہار کیا ہے۔ وہ اپنی ایک نظم ''شرن'' میں فرماتے ہیں

''ان کی وفات کے بعد جب دنیا میں ان کا جسم خاکی باقی نہ رہے گا۔ اس وقت اگر کوئی ان کی یاد سے اپنے دل کو تازہ رکھنا چاہے تو اسے چاہیے کہ وہ اس سرزمین کے درختوں مٹی اور گھاس وغیرہ سے اظہار محبت کرے۔ اس طرح وہ شاعر کو یاد رکھ سکے گا''۔

نظم شیریں ذرات ارضی میں فرماتے ہیں۔

''یہ زمین شہد جیسی مٹھاس سے بھری ہوئی ہے۔ اس کے ذرات قند پارے ہیں''۔

ٹیگور نے اپنے نظریۂ وطنیت میں عظمت آدم کو اولیت دی تھی۔

تین ہزار نظمیں تخلیق کیں۔ ٹیگور ایک عملی شاعر اور مفکر دانشور تھے۔ گیتا نجلی کا مترجم YEATS ہے۔ گیتا نجلی گیتوں کا مجموعہ ہے۔ (Song Offering)۔

ٹیگور کی فکر انگیز تخلیقات اور اعلیٰ خیالات واقدار عظمتِ رفتہ کی نہ صرف یادوں کو تازہ کرتے ہیں بلکہ انسانی جذبے کو نئی منزلوں سے روشناس کراتے ہیں۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ

''انسانوں کے دلوں کے ساتھ مل کر ایک ہو جانے کے لیے میرا دل روتا ہے۔

Man is Born Free But is Every Where In Chain

حیرت کی بات یہ ہے کہ ٹیگور کی قدر و قیمت اور اہمیت کا اندازہ ہندوستانیوں کو یورپین نے دلایا اور ''نوبل انعام'' بھی دیا۔

انہوں نے اپنی نظموں میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

''ہمارے ملک کی پکار، روٹی، زندگی، روشنی، آزادی، طاقت، محبت، خوشی اور ہمت کی پکار ہے''۔

ٹیگور کو قومیت کے تصور کی سخت گیری اور سرحدوں میں قید دنیا پسند نہیں تھی۔ شاعری کے علاوہ ٹیگور ایک عظیم فکشن نگار بھی تھے۔ آٹھ ناول اور ایک سو کے قریب کہانیاں لکھیں۔ ان کا ناول گورا، اور کہانی ''کابلی والا'' بہت مشہور ہوئی۔

رابندر ناتھ ٹیگور نام نہاد دیش بھگتی، اور اندھی قوم پرستی کے مخالف تھے۔ گیتوں کے ذریعہ ملک وقوم کو امن وآشتی کا پیغام دیا اور اپنی گراں قدر تحریروں اور تخلیقات کے ذریعہ عوام وخواص اور خصوصاً معاصر دانشوروں کو متاثر کیا۔ اقبال، پریم چند، گاندھی جی اور دیگر بنگلہ اسکالران کے اہم معاصرین میں تھے۔

گورودیو نے اپنی گراں قدر تحریروں کے ذریعہ ہندوستانی ادبیات کے ذہنی افق کو بلندی عطا کی۔

سوشل میڈیا پر اردو زبان وادب کے فروغ میں مختلف ادبی گروپس اور فورمز کا کردار قابلِ ستائش ہے۔ فیس بک، واٹس ایپ اور انسٹاگرام پر متعدد ادبی گروپس موجود ہیں جہاں پر لوگوں کو اردو زبان وادب سے متعلق گفتگو کرنے، کلام شیئر کرنے اور دیگر ادبی مواد پڑھنے کا موقع ملتا ہے۔ ان گروپس میں نہ صرف مشاعروں کا اہتمام کیا جاتا ہے بلکہ نئے لکھاریوں کی بھی حوصلہ افزائی کی جاتی ہے۔

سوشل میڈیا نے اردو ادب کے موضوعات کو بھی وسیع تر کیا ہے۔ اب ادب میں صرف روایتی موضوعات پر ہی نہیں بلکہ موجودہ دور کے اہم مسائل جیسے کہ ماحولیاتی تبدیلیاں، خواتین کے حقوق، معاشرتی ناہمواری اور مذہبی برداشت پر بھی لکھا جا رہا ہے۔ یہ نئے موضوعات نوجوان نسل کو زیادہ متاثر کرتے ہیں اور اردو ادب میں نئی سوچ کو فروغ دینے کا باعث بنتے ہیں۔

مراثی انیسؔ میں ذکر اطفال اسیران کربلا

ڈاکٹر ریحان حسن
شعبہ اردو و فارسی، گورونانک دیو یونیورسٹی، امرت سر (پنجاب)

ہر انسان بچوں سے محبت کرتا ہے یہ ایک ایسا فطری جذبہ ہے کہ جس کے تحت وہ بچوں پر تشدد برداشت نہیں کرسکتا شاید اسی لیے دنیا بھر میں معصوم بچوں پر تشدد کو سنگین جرم قرار دیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ بچوں سے مزدوری کرانے والوں کے خلاف کڑے قانون بھی بنائے گئے ہیں کیوں کہ بچوں سے مزدوری ان میں ذہنی، جسمانی، معاشرتی اور اخلاقی نقصانات کا باعث بنتی ہیں۔ یوں تو دنیا کے تمام مذاہب میں بچوں کے حقوق کی حفاظت پر زور دیا گیا ہے۔ لیکن اسلام نے بچوں کے حقوق کو پورا کرنے کی تاکید جس طرح کی ہے اس کی نظیر ہمیں دیگر مذاہب میں نظر نہیں آتی۔ اسلام نے بچوں کے ساتھ نیک سلوک اور رحم کرنے کا حکم کچھ یوں دیا ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

احبوا الصبیان وارحموھم، واذا وعدتموھم ففوا لھم، فانھم لا یرون الا انکم ترزقونھم۔ بچوں سے محبت کرو اور ان پر رحم کرو۔ جب ان سے وعدہ کرو تو پورا کرو کیوں کہ وہ یہی سمجھتے ہیں کہ تم ہی انہیں رزق دیتے ہو۔

بالخصوص یتیم بچوں کے حقوق کی حفاظت و نگہداشت پر قرآن کریم میں سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں تیئس مقامات پر ہمیں یتیم کا ذکر ملتا ہے۔ جس میں حسن سلوک، اموال کی حفاظت، بچوں کے ساتھ زیادتی اور حقوق و مال غضب کرنے والے پر وعید کی گئی ہے۔ اسلام نے بچوں کے حقوق کی ضمانت اس کی پیدائش سے پہلے دیتے ہوئے مثالی تہذیب کی بنیاد رکھی ہے۔ اگر ہم لٹریچر کا مطالعہ کریں تو بچوں پر ہونے والے ظلم و زیادتی کا ذکر مختلف زبانوں کے ادباء اور شعراء کے یہاں مل جائے گا۔ لیکن اردو شعراء میں انیسؔ نے جس انداز سے بچوں پر ہونے والے ظلم کو مراثی میں نظم کیا ہے اس کی نظیر ہمیں دیگر زبانوں میں بہت کم دیکھنے کو ملے گی۔ اردو شاعری میں بچوں پر ہونے والے ظلم و تشدد کے خلاف انیسؔ نے جس انداز سے صدائے احتجاج بلند کیا ہے وہ بچوں کے حقوق کی حمایت میں آواز اٹھانے والوں کیلئے نمونہ عمل ہے۔ حضرت امام حسین کے ہمراہ جو اطفال تھے ان کی شجاعت، صبر، استقلال اور بہادری و جاں نثاری کا ذکر انیسؔ نے اپنے مراثی میں اس انداز سے کیا ہے کہ وہ انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے بالخصوص ان پر روا ہونے والے جبر و ظلم کی داستان کو جس انداز سے انیس نے بیان کیا ہے وہ بچوں کے حقوق کی آواز اٹھانے والوں کے لئے ایسا اثاثہ ہے کہ جو اقوام متحدہ کے کارکنان کے لئے بھی بیحد مفید ہے۔ اطفال کربلا میں امام محمد باقرؑ، جناب قاسمؑ، جناب عون و محمدؑ، جناب علی اصغرؑ، اور جناب سکینہؑ پر ہونے والے تشدد کو انیسؔ نے جس دلدوز انداز میں نظم کیا ہے وہ خوابِ غفلت میں پڑے ہوئے انسان کو بیدار کرنے کے ساتھ ساتھ ظالموں کے خلاف صدائے احتجاج اور اظہار نفرت کرنے پر انسان کو مجبور کر دیتا ہے۔ اطفالِ کربلا میں حضرت علی اصغرؑ کے بعد جناب سکینہؑ پر ہونے والے جبر و تشدد کو انیسؔ نے نظم کرنے میں جو جوہر کمال دکھایا ہے وہ قابل غور ہے۔ کمسن بچی کے سفر کی صعوبتیں، موسم کی شدت اور بھوک اور پیاس کی تکالیف، باپ اور بھائی کے قتل ہونے اور اسیری میں لا متناہی مصائب و شدائد کو برداشت کرنے کی جو مثال انیسؔ نے پیش کی ہے اس کی نظیر تاریخ عالم و آدم پیش کرنے سے قاصر ہے۔

میر انیسؔ نے اطفال کربلا کی اسیری کے درمیان اضطراب و بے قراری اور بے کسی کی کیفیت کو اس طرح نظم کیا ہے کہ جبر و تشدد کی منہ بولتی تصویریں نظروں کے سامنے آگئی ہیں۔

وہ قافلہ دمشق کی جانب ہوا رواں
نیزوں پہ تھے شہیدوں کے سر ہائے خونچکاں
رسّی لیے تھے اونٹوں کی سجادؑ ناتواں
ہے ہے حسینؑ کہتی تھیں سر کھولے بیبیاں
بچے بھی ماں کی گودیوں میں بے قرار تھے
عابدؑ پیادہ پا تھے، ستم گر سوار تھے

حضرت امام حسینؑ کی ایک کنیز شیریں تھیں۔ انہیں امام عالی مقام نے آزاد کرتے وقت یہ وعدہ کیا تھا کہ وہ ان کے یہاں مہمان بن کر ضرور آئیں گے اس وعدہ کے بعد وہ اپنے شوہر کے ساتھ کوفہ چلی گئیں لیکن وہ حضرت امام حسینؑ کی آمد کی ہمیشہ منتظر رہتیں۔ ایک دن اس نے سنا کہ کوفہ میں کوئی قافلہ آنے والا ہے۔ جب قافلہ قلعہ شیریں کے قریب پہونچا تو شیریں نے اہل قافلہ اور حضرت امام حسینؑ کے سر کو مطلقاً نہ پہچانا۔ اس موقع پر انیسؔ نے قافلہ میں شامل بیبیوں اور بچوں کی پیاس کی کیفیت کو کچھ یوں نظم کیا ہے۔

آگے بڑھا عزیز تو دیکھا یہ اُس نے حال
کچھ بیبیاں ہیں خاک نشیں کھولے سر کے بال
روتے ہیں مارے بھوک کے اطفال خردسال

اک نوجوان ضعف کی شدت سے ہے نڈھال
طاقت نہیں جو دھوپ سے آ بیٹھے چھاؤں میں
گردن میں بھاری طوق ہے زنجیر پاؤں میں

ظاہر ہے کہ بھوک سے زیادہ پیاس کی اذیت ناقابل برداشت ہوتی ہے۔ میدان کربلا میں ننھے ننھے بچوں کی پیاس سے جو کیفیت تھی اسے انیسؔ نے بڑے ہی دلدوز انداز میں نظم کیا ہے بالخصوص اسیری کے درمیان بچوں کی پیاس سے جو حالت ہوگئی تھی انیسؔ نے اس انداز سے بیان کیا ہے کہ انسان بلبلا اٹھتا ہے وہ کہتے ہیں:

اونٹوں پہ جبی زادیاں تھیں گردنیں ڈالے
اور پیاس سے بچے تھے زبانوں کو نکالے
عابدؑ تھے بندھے ہاتھوں سے زنجیر سنبھالے
دل میں بھی پھپھولے تھے کفِ پا میں بھی چھالے
منزل پہ اُتر کر بھی نہ سوتے تھے سحر تک
بابا کے لئے شام سے روتے تھے سحر تک

شدت عطش سے بچوں کے منہ سے زبان کا نکل آنا، شدت عطش کی ایسی کیفیت کو بیان کرتا ہے کہ جسے سن کر ہر صاحب ضمیر کا دل تڑپ اٹھتا ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ اطفال کربلا کے مصائب وشدائد کو انیسؔ نے مراثی میں جس انداز میں نظم کیا ہے اسے پڑھ کر قاری پر جو غم والم کی کیفیت طاری ہوتی ہے وہ ناقابل بیان ہے۔ بطور ثبوت یہ بند ملاحظہ ہو۔

رانڈوں کی چھاتیوں سے لپٹے ہوئے تھے اطفال
ہونٹ گلبرگ سے سوکھے ہوئے رخ دھوپ سے لال
اشک آنکھوں میں بھرے پیاس کے مارے بے حال
راہ کی گرد سے آلودہ جھنڈولے وہ بال
دل دھڑکتے تھے پڑے خوف سے چہرے فق تھے
جور اعدا سے کئی بچوں کے چہرے فق تھے
تھیں کئی لڑکیاں چھوٹی کئی لڑکے چھوٹے
آنسو آنکھوں میں بھرے ضبط کئے سہمے ہوئے
گورے گورے وہ گلے اور گریبان پھٹے
نرگسی آنکھوں سے تھے ماؤں کی صورت تکتے
مانگ سکتا تھا نہ رو کر کوئی بچہ پانی
ڈر کے اعدا سے ہوا جاتا تھا زہرہ پانی

مرثیہ کے بند کے ہر مصرع میں اطفال کربلا پر ہونے والے جبر وتشدد اور ظلم کی ایسی داستان کو بیان کیا گیا ہے کہ جو انسانی قلوب کو بے قرار کر دیتا ہے۔ قید خانہ میں اطفال کربلا کی حالت زار کو انیسؔ نے متعدد مراثی میں بیان کیا ہے اس حوالے سے مرثیہ کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

ان باتوں سے رو دیتے تھے ناموس پیمبرؐ
تھا فرش فقط خاک کا بالش تھا نہ بستر
بچوں کو نہ کھانا تھا نہ پانی تھا میسر
سایا بھی نہ تھا دھوپ میں سب جلتے تھے دن بھر
ہر شام مصیبت تھی غریب الوطنی میں
ہو جاتی تھی رانڈوں کو سحر سینہ زنی میں

مذکورہ بالا مرثیہ کے بند کے ہر مصرع سے بچوں کے رنج وتعب اور کلفتوں کا اظہار جس انداز سے ہوا ہے وہ ہر انسان کے ضمیر کو جھنجھوڑ کر رکھ دیتا ہے۔ انیسؔ کا کمال یہ ہے کہ ایام اسیری میں اطفال کربلا پر روا رکھے گئے شدائد ومصائب کو مرثیوں میں کچھ ایسے انداز سے بیان کیا ہے کہ بچوں کی کلفتوں کا احساس قاری کو بخوبی ہو۔ بطور ثبوت مرثیہ کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو:

رسی میں ہے جکڑے ہوئے الماس سے بازو
اور نرگسی آنکھوں سے پرے بہتے ہیں آنسو
ان بی بیوں کے ساتھ ہیں بچے کئی مہرو
کیا چاند سے چہروں پہ بھلے لگتے ہیں گیسو
ایک ایک کا منہ رو رو کے تکتے تھے وہ بچے
اور بھوک کے صدمے سے بلکتے تھے وہ بچے

انیسؔ نے اس بند میں ننھے ننھے بچوں کے بازوؤں کو رسیوں سے جکڑنے کی کیفیت کو بیان کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ اطفال کربلا نے بھوک اور پیاس کی جس طرح اذیت کو برداشت کیا ہے کہ وہ ناقابل معافی جرم ہے۔

میر انیس نے واقعہ کربلا کے بیان میں بچوں کے مصائب وشدائد کو بیان کرنے میں جس ہنرمندی کا ثبوت بہم کیا ہے وہ قابل غور ہے۔ وہ بیشتر مراثی میں ایسے الفاظ کا انتخاب کرتے ہیں کہ بچوں کی تکالیف اور مصائب وشداد کا منظر نگاہوں کے سامنے پھر سکے۔

یہ کہتے تھے اور روتے تھے ناموس پیمبرؐ
تھا فرش فقط خاک کا بالیں تھا نہ بستر
بچوں کو نہ کھانا تھا نہ پانی تھا میسر
سایہ بھی نہ تھا دھوپ میں سب جلتے تھے دن بھر

ہر شام مصیبت تھی غریب الوطنی میں
ہو جاتی تھی رانڈوں کو سحر سینہ زنی میں

انیسؔ نے اطفال کربلا کے پر ہونے والے جبر وظلم کی داستان کو بیان کرتے ہوئے یہ باور کرایا ہے کہ لامتناہی مصائب وشدائد میں بھی بچوں کے ہاتھ سے صبر کا دامن نہیں چھوٹا تھا۔ واقعہ کربلا کے بعد بچوں پر ہونے والے مظالم کو دیکھ کر جب مائیں بے قرار ہوتی تھیں تو وہ بچے ماں کی تکالیف کا احساس کر کے صبر کی تلقین کرتے تھے۔ انیسؔ نے بچوں کی ماں سے فطری محبت کو دکھاتے ہوئے اطفال کربلا کے مظالم کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

چاند سے چہرے سے اک اک کے یتیمی تھی عیاں
کئی فاقے جو کئے تھے تو نہ تھی تاب وتواں
بیبیاں ان کی غریبی پہ جو کرتی تھیں فغاں
جوڑ کر ہاتھ وہ کہتے تھے نہ روؤ اماں
کھینچ کر تیغ نہ پھر تم کو ڈرا دے کوئی
نوک نیزے کی نہ شانے پہ چبھائے کوئی

ظاہر ہے کہ قافلہ اہل بیتؑ کو ایسے گھر میں مقید کیا گیا تھا کہ جہاں نہ سورج کی روشنی تھی اور نہ ہی ہوا۔ ایسے قید خانہ میں تو بڑوں کا رہنا بھی دشوار ہوتا ہے تو بچوں کی کیا حالت ہوتی ہوگی۔ ذہن انسان ان مصائب کو سن کر مفلوج ہو جاتا ہے چنانچہ انیسؔ نے قید خانہ میں بچوں کی حالت زار کو کچھ اس طرح بیان کیا ہے کہ انسان کے ہوش و حواس گم ہو جاتے ہیں بطور ثبوت یہ بند ملاحظہ کیجیئے۔

اس شب کا اندھیرا تھا شب گور سے بدتر
بچوں کا یہ عالم تھا کہ تھے مضطر وششدر
سہمی ہوئی کہتی تھی یہ شبیرؑ کی دختر
دم گھٹتا ہے اماں مجھے تم لے چلو باہر
کھلوا دو ذرا حجرے کو اب ہونٹوں پہ جاں ہے
اس گھر میں ہوا بھی نہیں یہ کیسا مکاں ہے

انیسؔ نے مرثیہ کے اس بند میں بچوں کے ساتھ ہونے والے مظالم کو بے نقاب کرتے ہوئے بچوں کی فطری جبلت اور اطفال کربلا کو مثالی پیکر بنا کر پیش کیا ہے۔ جیسا کہ عرض کیا گیا ہے کہ انیسؔ نے بھوک اور پیاس سے پیدا ہونے والی کیفیات کو مراثی میں جا بجا نت نئے انداز سے نظم کیا ہے۔ تا کہ قاری کو بھوک اور پیاس کی اذیت کا احساس ہو سکے۔ وہ فاقوں کے نتیجے میں ہونے والی حالت کو تین سال کی کمسن بچی جناب سکینہؑ کے حوالے سے اس طرح بیان کرتے ہیں:

مرجاتا ہے جو پھر اسے زنداں سے ہے کیا کام
یاں بعد فنا بھی نہیں مطلق مجھے آرام
زنداں میں حرم روتے ہیں میرے سحر وشام
بچے مرے چلاتے ہیں لے لے کے مرا نام
فاقوں سے سکینہ کا مری رنگ جو فق ہے
اے ہند مری روح کو واللہ قلق ہے

یہ صداقت ہے کہ اطفال کربلا کو اثناء اسیری بھوک اور پیاس کی جس اذیت سے دوچار ہونا پڑا اس کیفیت کو انیسؔ سے بہتر کوئی اور شاعر نظم نہ کر سکا بالخصوص حضرت سکینہؑ کی بھوک اور پیاس کی شدت کو جس انداز سے انہوں نے بیان کیا ہے وہ ہر صاحب دل کو بے قرار کر دیتا ہے۔ انیسؔ باپ کی زبان سے بیٹی کی پیاس کی تکلیف کو کچھ یوں بیان کرتے ہیں۔

یہ سن تین برس کا اور تشنہ دہانی
ہو جاتی ہے غش مانگتے ہی مانگتے پانی
ہر بار گھڑ کتے ہیں اسے ظلم کے بانی
کیا ضد ہے کہ بچوں کے بھی ہیں دشمن جانی
کی جاتی نہیں بات بھی اس تشنہ دہن سے
ننھا سا گلا شمر نے باندھا ہے رسن سے

باپ کی زبان سے بیٹی کی شدت عطش کی یہ کیفیت انسانوں کے قلوب کو برما دیتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بچوں پر تشدد دنیا کے ہر گوشے میں ایسا سنگین جرم ہے۔ کہ جس کی تلافی ناممکن ہے۔ لیکن افسوس کہ یہ ظلم بھی اطفال کربلا کے ساتھ روا رکھا گیا حتیٰ کہ باپ اور بھائیوں کی شہادت کے بعد قیدی بنا کر ان پر نت نئے ظلم کے پہاڑ توڑے گئے۔ انیسؔ نے امام حسینؑ کی زبان سے تین سال کی کمسن بچی پر جو ظلم کے پہاڑ ڈھائے گئے اسے کچھ اس طرح بیان کیا ہے:

کیا کہوں ننھے سے بچوں پہ جو ہے ظلم وستم
نام لے کر مرا روتی ہے سکینہؑ ہر دم
مارتے ہیں اُسے جھنجلا کے طمانچے اظلم
کان بھی زخمی ہیں گالوں پہ بھی ہے اس کے ورم
آج جو اس مری پیاری پہ ستم ہوتے ہیں
یہ مری روح پہ واللہ الم ہوتے ہیں

انیسؔ نے مسدس کے آخری مصرع میں کمسن بچی پر ہونے والے ظلم کو بیان کرنے کے بعد باپ کی قلبی کیفیات کو جس پیرائے میں بیان کیا ہے اس کی مثال اردو

شاعری میں شاذ ہی ملے گی۔

دربار میں جب ایک دشمن دیں تلوار لے کر جناب زینبؑ کو قتل کرنے کے لئے آگے بڑھتا ہے تو یہی ننھے ننھے بچے بالخصوص جناب سکینہؑ یزیدیوں کو اس فعل سے باز آنے کا موجب بنتی ہیں۔ انیسؔ نے اس واقعہ کو جس انداز سے بیان کیا ہے وہ بچی کی پھوپھی سے بے پایاں محبت کا ایسا اظہار ہے کہ جو رہتی دنیا تک کے لئے نمونہ عمل ہے۔

بلبلانے لگے یہ دیکھ کے ننھے بچے
پیٹ کر سر کو سکینہؑ نے کہا ہاتھوں سے
میری بے کس پھوپھی اماں میں تمہارے صدقے آپ کے بدلے ستم گر مری گردن کاٹے

اب کہاں ہیں شہ والا جو بچاویں تم کو
ہائے جیتے نہیں بابا جو بچائیں تم کو

اطفال کربلا میں جناب سکینہؑ کی ذات گرامی ایسی ہے کہ جن پر یزیدیوں کے ہاتھوں بے پناہ ظلم کے پہاڑ توڑے گئے انیسؔ نے ان مظالم و شدائد کو جس طرح بیان کیا ہے وہ ہر صاحب دل کو تڑپا دیتا ہے۔ دیکھیئے انیسؔ نے تین سال کی کمسن بچی پر ہونے والے مظالم کو کس دلدوز انداز میں نظم کیا ہے:

ہے اسی رسی میں ننھا سا سکینہؑ کا گلا
دم گھٹا جاتا ہے آنکھوں سے رواں ہیں آنسو
چاک کُرتے کا گریباں ہے پریشاں گیسو
سوجے تو گال ہیں کانوں سے ٹپکتا ہے لہو
آہ ہر گام پہ سینے سے نکل جاتی ہے
جب گھڑکتے ہیں ستم گر تو دہل جاتی ہے
ماں سے کرتی ہے اشارہ وہ گرفتار ستم
رسی کھلوا دو نہیں گھُٹ کے نکل جائے گا دم
رو کے وہ کہتی ہے مجبور ہوں میں کشتہ غم
ہائے بچی تری قسمت میں تھا یہ درد و الم
صدقے اماں یہ گرہ عقدہ کشا کھولے گا
بی بی اس عقدہ مشکل کو خدا کھولے گا

میر انیسؔ کے مرثیہ کے ہر مصرع میں بالخصوص بند کے آخری مصرع میں کمسن بچی پر ہونے والے مظالم و شدائد کو جس انداز سے بیان کیا گیا ہے وہ ہر صاحب ضمیر کے دل کو مضطرب کر دیتا ہے۔ باپ اور بیٹی کی محبت مثالی ہوتی ہے بالخصوص باپ کو بیٹی سے جو بے انتہا محبت ہوتی ہے اس پر بیٹی کو ناز بھی ہوتا ہے اور فخر بھی۔ جس کے نتیجے میں بیٹی اپنے باپ سے دل کھول کر ہر وہ بات کر لیتی ہے جو کسی اور سے نہیں کر سکتی۔ انیسؔ چونکہ ماہر فطرت تھے لہٰذا انہوں نے اپنے ماہر فطرت ہونے کا ثبوت مراثی میں جا بجا بہم کیا ہے۔ انیسؔ کی فطرت شناسی کا یہ ثبوت ملاحظہ کیجئے:

کہیں دربار میں اماں وہ اگر مجھ کو ملے
دیکھنا کرتی ہوں کیسے شہ والا سے گلے
وہ خبر لیویں نہ، گردن مری رسی سے چھلے
اُس کو یوں بھولتے ہیں باپ سے بچہ جو ملے
وجہ کیا کون سی تقصیر پہ منہ موڑا ہے
سیلیاں کھانے کو اعدا میں مجھے چھوڑا ہے

مراثی انیس میں جناب سکینہؑ کے مصائب و شدائد کے بیان میں انیس نے جس ماہر فطرت ہونے کا ثبوت بہم کیا ہے اس کی مثال ہمیں اردو شاعری میں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ بطور ثبوت مرثیہ کا یہ بند بھی ملاحظہ ہو۔

سر پیٹ کے ماں کہتی تھی ہے ہے میں کروں کیا مظلومی پہ اس بچی کے پھٹتا ہے کلیجا
اس قید میں گذرا ہے ابھی فاقہ پہ فاقا اے لوگو! سکینہؑ کا مری دم ہے نکلتا
بند آنکھیں ہیں منہ کھولو مری ماہ جبیں ہے
کیا منہ میں چواؤں کہیں پانی بھی نہیں ہے

جناب سکینہؑ کی مظلومی و بے کسی انیسؔ کے مرثیہ کے ہر مصرع سے ہویدا ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ انیسؔ نے بیشتر مراثی میں جناب سکینہؑ کے مظالم و شدائد کا بیان بڑے ہی دلدوز انداز میں کیا ہے بالخصوص

جس طشت طلا میں رکھا تھا سر سرور

ایسا مرثیہ ہے کہ جس میں جناب سکینہؑ پر ہونے والے مظالم کو پڑھ کر انسان خون کے آنسو رونے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اگر یہ کہا جائے تو شاید غلط نہ ہوگا کہ یہ پورا مرثیہ بچوں پر ہونے والے مظالم و شدائد کے خلاف کھلا احتجاج ہے۔ اس کے علاوہ

جب قیدیوں کو خانہ زنداں میں شب ہوئی
بچوں کے مارے خوف کے حالت عجیب ہوئی

بھی ایسا مرثیہ ہے کہ جس میں انیسؔ نے بچوں پر ہونے والے مصائب و شدائد کو بہترین پیرائے میں بیان کیا ہے بالخصوص جناب سکینہؑ کے مصائب کی کیفیات کو جس طرح بیان ہے اسے پڑھ کر انسان سے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے لگتا ہے۔ اس مرثیہ میں زندان کے اندھیرے میں بچوں کے بچھڑنے کی کیفیت کو نظم کرتے ہوئے بچوں کی حالت خصوصاً امام محمد باقرؑ اور جناب سکینہ کو زبان سے کچھ یوں بیان کیا گیا ہے:

بانوں کے اس بیاں پہ بلکتے تھے سب حرم
باقرؑ پکارتے تھے کہ کیونکر جئیں گے ہم
چلاتی تھی سکینہؑ کہ گھٹتا ہے میرا دم
زنداں کا در بھی ہوگیا معمولی ہے ستم
کھولے گا قفل کون جو عباسؑ آئیں گے
لو اب پدر کدھر سے مرے پاس آئیں گے

اطفال کربلا کے مصائب وشدائد کی کلام انیسؔ میں ایسی لاتعداد مثالیں موجود ہیں۔ بالخصوص بچوں کی بھوک اور پیاس کی شدت اور قید خانہ کی اذیت کو جس فنکارانہ انداز میں انیسؔ نے بیان کیا ہے وہ انیسؔ کے ماہر فطرت اور ''ایک رنگ کا مضمون ہو تو سو رنگ سے باندھوں'' کی بہترین مثالیں ہیں۔

مراثی انیسؔ کے مندرجہ بالا بندوں کے مطالعے کے پیش نظر بلا جھجک یہ کہا جاسکتا ہے کہ انہوں نے مراثی میں جس انداز سے بچوں کی تکالیف کو بیان کیا ہے پوری اردو شاعری میں ہنوز اس کی نظیر نہیں ملتی۔ اس طرح انیسؔ اچھے مرثیہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ حقوق اطفال کے ایسے علم بردار ہیں کہ جس کی مثال دنیائے شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔

اردو مزاحیہ کالم نگاری کی روایت پاکستان اور ہندوستان میں پروان چڑھ رہی ہے، بہت سے ہم عصر ادیبوں نے اپنے پیشروؤں کی وراثت کو جاری رکھا ہوا ہے۔ سوشل میڈیا پلیٹ فارمز کی مقبولیت نے اردو مزاح نگاروں کی ایک نئی نسل کو بھی جنم دیا ہے جو ان پلیٹ فارمز کا استعمال اپنے دلچسپ مشاہدات کو وسیع تر سامعین کے ساتھ شیئر کرتے ہیں۔

حافظ اور عمر خیام جیسے فارسی شاعروں نے انسانی وجود کی پیچیدگیوں، زندگی کی عارضی نوعیت اور روحانی روشن خالی کی جستجو کے اظہار کے لے شراب کو بطور علامت استعمال کیا ہے۔ یہ روایت بغیر کسی رکاوٹ کے اردو شاعری میں ضم ہوگئی تھی، جس نے موضوع کے طور پر شراب کی پائیدار موجودگی میں حصہ ڈالا تھا۔

اردو شاعری میں شراب کے عام ہونے کی ایک وجہ اس کا الٰہی نشہ کے خیال سے وابستہ ہونا ہے۔ کسی محبوب کی محبت یا اعلیٰ روحانی سچائی کی تلاش میں اپنے آپ کو کھو دینے کا تصور اکثر شراب کے استعارے سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ ترک کرنے، ہتھیار ڈالنے اور ماورائی ہونے کی حالت کی علامت ہے۔

انشائیہ کے بانی ڈاکٹر وزیر آغا

واجدہ تبسم

اُردو ادب کی تاریخ میں ڈاکٹر وزیر آغا کا نام دو حیثیتوں میں ہمیشہ زندہ رہے گا۔ ایک تو انہوں نے اُردو ادب میں انشائیے کی صنف کو فروغ دینے کے لیے ایک تحریک کی سطح پر کام کیا۔ اور دوسرے اُنہوں نے اُردو تنقید کو جدید نفسیاتی مباحث سے روشناس کرایا۔

وزیر آغا 1922ء میں سرگودھا کے ایک دور افتادہ گاؤں وزیر کوٹ 56 جنوبی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم دیہاتوں میں حاصل کی۔ ایم۔اے (معاشیات) گورنمنٹ کالج لاہور سے کیا۔ 1956ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ بعنوان ''اُردو ادب میں طنز و مزاح'' کی ڈگری حاصل کی۔

وزیر آغا کی کل طبع زاد کتابوں کی تعداد 60 کے قریب ہے۔ ان کے فن پر جامعات میں خاصہ کام ہوا ہے۔ ان کی مشہور تصنیفات میں

''اُردو ادب میں طنز و مزاح''
''اُردو شاعری کا مزاج''
''مسرت کی تلاش''
''چہک اُٹھی لفظوں کی چھاگل''
''گھاس میں تتلیاں''
''دستک اس دروازے پر''
''شین سفر''
''شام کی منڈیر سے''
''شام دوستاں آباد''
''اُردو انشائیے کے خدوخال''
''چنا ہم نے ایک پہاڑی راستہ''
''روڈ رولر سے پگڈنڈی تک''
''معنی اور تناظر''
''تنقیدی مضامین''
''ہم آنکھیں ہیں''
''مجید امجد کی داستانِ محبت''

''عجب ایک مسکراہٹ''

''تنقید اور احتساب''

''تحقیقی عمل''

''یہ آواز کیا ہے''

''آدھی صدی کے بعد''

''چٹکی بھر روشنی''

''نظمِ جدید کی کروٹیں''

''تصوراتِ عشق و خرد اقبال کی نظر''

''غالب کا ذوقِ تماشہ''

''نئے مقالات''

''پگڈنڈی'' وغیرہ شامل ہیں۔

اپنے مداحوں کے لیے وزیر آغا نے اپنے حالاتِ زندگی بھی ایک ایک کتاب کی صورت میں محفوظ کر دیئے ہیں۔ سوانح عمری کا نام ہے: ''شام کی منڈیر سے''۔ پاکستان میں بھی وزیر آغا کے فن پر 14 کتابیں شائع ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں ان کے فن پر بہار یونیورسٹی مظفر پور سے پروفیسر عبدالواسع کے زیرِ نگرانی تحقیقی مقالے ''وزیر آغا کا فن'' پر بی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری حاصل ہو چکی ہے۔ جس طرح مولانا صلاح الدین احمد نے اپنے وقت کے بہت سے نوجوان ادیبوں اور شاعروں کی سرپرستی کی اور انہیں گمنامی سے نکال کر شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں لا کھڑا کیا ٹھیک اُسی طرح اُن کے شاگردِ خاص رشید وزیر آغا نے بھی اپنے رسالہ اوراق کے ذریعہ بہت سے نوجوانوں کے ذوقِ تحریر کی آبیاری کی۔ وہ کافی عرصہ تک گورنمنٹ کالج سرگودھا میں اعزازی مدرّس کے طور پر بھی خدمات انجام دیتے رہے۔

انشائیے کی ترویج میں اُن کے ادبی رسالہ اوراق نے انتہائی اہم خدمات سرانجام دی ہیں۔ وزیر آغا نے نہ صرف خود انشائیہ لکھتے تھے؛ بلکہ نوجوان ادیبوں کو اس کی ترغیب بھی دیتے تھے۔ اوران کے معیاری انشائیے اپنے رسالہ میں باقاعدگی سے شائع کرتے تھے۔ بہت سے ادیبوں کو یہ شکوہ رہا کہ وزیر آغا نے ان کی تحریر کو بطورِ انشائیہ قبول نہیں کیا' بلکہ مزاحیہ مضمون کا عنوان دے کر شائع کیا۔ اس سلسلہ میں وزیر آغا کا موقف انتہائی واضح تھا۔ وہ ہر ہلکی پھلکی یا مزاحیہ تحریر کو انشائیہ قرار دینے پر تیار نہ تھے، کیونکہ اُن کے بقول انشائیہ میں ایک خاص طرح کی ''ذہانت کی چمک'' ہونا ضروری تھا۔

ڈاکٹر وزیر آغا اُردو انشائیہ کی کہانی میں لکھتے ہیں کہ:

جب 1940ء کے لگ بھگ اُردو انشائیہ اپنے بھرپور انداز میں اُبھر کر سامنے آیا اور اُردو انشائیوں کا پہلا مجموعہ بھی شائع ہو گیا تو پوری اُردو دنیا میں انشائیہ کی جڑوں کی تلاش کا سلسلہ شروع کر دیا گیا۔ اِنہی دنوں میں نے اُردو انشائیہ کے اِمتیازی اوصاف کو واضح کرنے کے لیے متعدد مضامین لکھے اور ایک مضمون میں جو علیگڑھ میگزین انشائیہ نمبر میں چھپا اِس بات کی طرف اشارہ کیا کہ انشائیہ کے عناصر تو تقسیمِ ہند سے پہلے کی غیر افسانوی نثر میں جا بجا مل جاتے ہیں، لیکن سر سید احمد خاں کے مضامین سے لے کر تقسیم ملک تک مضامین کے انبار میں کوئی ایسی تحریر موجود نہیں ہے جسے مکمل طور پر انشائیہ کا نام دیا جا سکے۔ 'اُردو کے معاملہ میں تقسیمِ ہند سے پہلے ہر قسم کے مضامین کو بطورِ اسیز (Essay) پیش کرنے کی کوشش کی گئی تھی، البتہ تقسیمِ ہند کے بعد انگریزی کے Light یا Personal Essay کے تتبع میں ایسی تحریریں وجود میں آئی ہیں جو تقسیمِ ہند کے پہلے کے مضامین سے صنفی اعتبار سے مختلف تھیں۔ لہٰذا میں نے کہا کہ 'اِس بات کی ضرورت ہے کہ اِس نومولود کو ایک نئے نام سے موسوم کیا جائے، تا کہ اذہان پر اِس کی انفرادیت کا احساس مرتسم ہو سکے اور اُسے دوسری اصناف نثر سے الگ کرنے میں کامیاب ہوں۔ اپنے اِس موقف کو عملی جامہ پہنانے کے لیے میں نے انگریزی کے Personal یا Light Essay کے لیے متبادل اُردو لفظ کی تلاش شروع کی' تا کہ وہ غلط فہمیاں لفظ Essay سے انگریزی ادب میں پیدا ہوئی تھیں، اُردو میں بھی پیدا نہ ہو جائے مگر وہی ہوا جس کا ڈر تھا۔ اِدھر ہم نے Personal Essay کے لیے ''انشائیہ'' کا لفظ تجویز کیا، اور اِدھر لوگوں نے اِس لفظ کو ساری غیر افسانی نثر کے لیے مختص کرنا شروع کر دیا''۔ (ڈاکٹر وزیر آغا/ اردو انشائیہ کی کہانی/ انشائیہ کے خدوخال ص ۴۱۔ ۴۰/ ۱۹۹۰ء لاہور)

اِنشائیہ نگاری وزیر آغا کی

وزیر آغا بنیادی طور پر ناقد ہیں، وزیر آغا کو یہ اِمتیازی حیثیت حاصل ہے کہ اُن کی شخصیت میں شامل تخلیقی توانائی اور تنقیدی صلاحیت نے نہ صرف مغربی اُصولِ انشائیہ نگاری کا تعارف کرایا بلکہ تخلیقی سطح پر اِنشائیہ تحریر کیئے۔ اِن کی پہلی تحریر 'گرمی کی آغوش میں' اور 'ادبِ لطیف' لاہور، اگست 1955ء میں شائع ہوئی۔

انشائیہ کا پہلا مجموعہ 'خیال پارے' 1961ء میں منظرِ عام پر آیا۔ اور وزیر آغا کی اِدارت میں شائع ہونے والا ادبی جریدہ: اوراق، لاہور انشائیہ کے فروغ میں پیش پیش رہا۔ اِسی جریدہ 'اوراق' کی وجہ سے نئی نسل کے انشائیہ نگار وجود میں آئے۔ وزیر آغا اِس تحریک کے سالارِ کارواں خیال کیئے جاتے ہیں۔

خیال پارے شائع ہوا تو اس پر تبصرہ کرتے ہوئے خلیل الرحمن نے لکھا:

وزیر آغا کے انشائیوں کا پہلا مجموعہ خیال پارے، آغا صاحب کے پچیس انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ اِس مجموعہ کے پڑھنے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اِس صنف کے

خدوخال متعین کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔(خلیل الرحمن اعظمی/مضامین نو/ص:۱۶۵/ ۱۹۷۷ء/علی گڑھ)

وزیر آغا کے انشائیوں میں طنز ومزاح مقصود بالذات نہیں ہے،خیال پارے اور چوری سے یاری تک' کے بعد شائع ہونے والے مجموعہ 'دوسرا کنارہ' میں شوخی و شگفتگی پائی جاتی ہے۔اِن کے ہاں تخیلات کا اظہار بالواسطہ طور پر ہوتا ہے۔اِن کے شعور کی جڑیں بڑی گہری اور تہذیبی ورثہ سے پیوست ہیں۔

انشائیہ 'حقہ پینا' کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''سگریٹ پینا ثقافت کی رو سے ایک بے ثمر عمل ہے، کیونکہ یہ انسان کو ہوا میں تحلیل کر دیتا ہے۔جب کوئی سگریٹ سلگاتا ہے تو سگریٹ کے مرغولوں کے ساتھ ساتھ تخیلات کی ایک دُنیا آباد کر لیتا ہے اور پھر اِن تخیلات میں یوں کھوجاتا ہے کہ اِسے گردوپیش کا ہوش نہیں ہوتا۔سگریٹ تو ہائیڈروجن گیاس سے بھرا ہوا وہ غبارہ ہے جو اِنسان کو تو آسمان کی طرف اُڑا لے جاتا ہے اور زمین اس کے پاؤں تلے سے نکل جاتی ہے؛ جبکہ حقہ اِسے زمین کی سوندھی سوندھی باس سے آشنا کرتا ہے اور زندگی پر اِس کی گرفت مضبوط ہوتی جاتی ہے''۔

(ڈاکٹر وزیر/حقہ پینا/دوسرا کنارہ/۱۹۸۲ء/ص ۳۴/لاہور)

انشائیہ میں انشائیہ کی شخصیت کی جھلک واضح ہوتی ہے اور اس میں شخصیت بھی اہمیت کی حامل ہے۔اِس کا مشاہدہ، مطالعہ، تہذیب وتمدن، فکر وغیرہ شخصیت کی ہیئت ضرور ہوتی ہے۔انشائیہ آزادی میں غلامی اور آزادی کے تصورات کو خوبصورت انداز میں پیش کیا ہے'وزیر آغا کا اقتباس پیش ہے:

''آزادی چاکِ ابر میں جھانکتا ہوا برق کا کوندا ہے۔یہ ایک ایسا متور لمحہ ہے کہ جس کے دونوں طرف تاریکی کے سمندر موجزن ہیں۔جب کوئی فرد یا قوم آزادی کی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی ہے تو اِس خوش فہمی کے ساتھ کہ اس منزل سے آگے آزادی ہی آزادی ہے، روشنی ہی روشنی ہے، حالانکہ اِس کے بعد بھی وہی پہلے سی غلامی اور تاریکی ہے، جس سے نجات پانے کے لیے اِس نے آزادی کی آرزو کی تھی۔آزادی آزاد ہونے میں نہیں آزادی کی اس خواہش میں ہے جو دل کے نہاں خانہ سے اُڑ کر آزادی مانگنے والے کے ہونٹوں کے محراب پر چند لفظوں کے لیے آبیٹھتی ہے اور پھر چند اماموں تک پہنچنے کے لیے کہرام برپا کر دیتی ہے۔''

(ڈاکٹر وزیر/حقہ پینا/دوسرا کنارہ/۱۹۸۲ء/ص ۳۴/لاہور)

انشائیہ کے افق پر پہلے صرف وزیر آغا کا ہی نام جگمگاتا نظر آتا تھا، یہ تقریباً 1958ء کی بات ہے پھر آہستہ آہستہ اس افق پر کئی اور ستارے جگمگانے لگے۔

قتیل شفائی کی فلمی شاعری کی ایک خاصیت یہ بھی ہے کہ اس میں عام انسان کے جذبات اور احساسات کو بڑے عام فہم انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ان کے گیت دل کے قریب محسوس ہوتے ہیں اور ان میں کہیں نہ کہیں سننے والا اپنے جذبات کی جھلک پاتا ہے۔ان کے اشعار میں ایک ایسی گہرائی اور رومانیت ہے جو دل کو بے اختیار اپنی جانب کھینچ لیتی ہے۔

شوشل میڈیا نے اردو زبان کو دورِ جدید میں زندہ رکھنے اور اس کے فروغ میں بنیادی کردار ادا کیا ہے۔آج کے دور میں فیس بک، ٹوئٹر، انسٹاگرام، یوٹیوب اور واٹس ایپ جیسی سوشل میڈیا ویب سائٹس نے اردو کے لئے ایک نئی زمین فراہم کی ہے۔سوشل میڈیا پر اردو میں شاعری، افسانہ، ناول، مزاحیہ تحریریں، تبصرے اور مختلف موضوعات پر مکالمہ بڑے پیمانے پر دیکھا جاسکتا ہے۔اردو میں لکھنے اور پڑھنے والے حضرات کے لئے یہ پلیٹ فارمز نہایت مفید ثابت ہوئے ہیں۔

رزمیہ شاعری کا تسلسل معاشرتی اقدار اور تہذیبی روایات کو زندہ رکھنے کا ایک مؤثر ذریعہ رہا ہے۔یہ صرف جنگی میدانوں تک محدود نہیں بلکہ فرد اور معاشرے کے درمیان پائی جانے والی کشمکش، ناانصافی کے خلاف آواز اور حق کے لیے جدوجہد کی صورت میں بھی ابھرتی ہے۔رزمیہ شاعری نے ہمیشہ قوموں کو بیدار کیا اور ان میں عزم واستقلال پیدا کرنے میں کلیدی کردار ادا کیا۔

مرزا سودا کی شاعری میں صنف کی بنیاد پر امتیاز کا بھی ذکر ملتا ہے۔ان کے کلام میں ہمیں عورتوں کے ساتھ ہونے والے معاشرتی اور سماجی ناانصافیوں کا ذکر ملتا ہے۔اس زمانے میں عورتوں کو اکثر سماجی لحاظ سے کم تر سمجھا جاتا تھا اور انہیں ان کے حقوق سے محروم رکھا جاتا تھا۔سودا نے ان مسائل کو اپنی شاعری میں اجاگر کیا اور معاشرتی انصاف کی ضرورت پر زور دیا۔

قیامِ یورپ اور علامہ اقبالؒ کی ماہیت قلبی

طارق محمود مرزا۔ آسٹریلیا

علامہ اقبالؒ ۱۹۰۵ میں اعلیٰ تعلیم کے لیے یورپ تشریف لے گئے۔ اگرچہ ہندوستان سے ایم اے پاس کر کے گئے تھے پھر بھی یورپی درس گاہوں کی ضرورت کے مطابق انھوں نے ٹرنٹی کالج سے ۱۹۰۶ء میں بی اے کا امتحان پاس کیا۔ ۱۹۰۸ میں انھوں نے مڈل ٹمپل (Middle Temple) سے قانون کی ڈگری حاصل کی۔ اس دوران میں میونخ یونیورسٹی جرمنی سے پی ایچ ڈی کا امتحان پاس کیا۔ یوں انھوں نے تین برسوں میں تین ڈگریاں حاصل کیں جن کے موضوعات ایک دوسرے سے یکسر مختلف تھے۔ یہ ان کی ذہانت اور فطانت ظاہر کرتی ہیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ان تین برسوں میں پڑھائی میں کس قدر مصروف و مشغول رہے۔ اس کے باوجود نہ صرف انھوں نے یورپ کے فلسفیوں، شاعروں اور ادیبوں کا بہ نظرِ غائر مطالعہ کیا بلکہ بحیثیت مجموعی ان کی سوچ اور فکر کو بخوبی جان لیا۔ اس کا اظہار ان کے کلام میں جا بجا موجود ہے۔

عذاب دانش حاضر سے باخبر ہوں میں
کہ میں اس آگ میں ڈالا گیا ہوں مثلِ خلیل

اقبال دیارِ غیر میں رہتے ہوئے ہر وقت مسلمان اور ملت اسلامیہ کی فکر میں گم رہتے۔ ان کے اس دَور کے کلام سے صاف مترشح ہے کہ اقبال کی راہیں متعین ہو چکی ہیں۔ بلکہ اپنی قوم کی منزل اور ان کے نصب العین کا بھی تعین کر چکے ہیں۔ اب اس پر خطر راہ پر خود بھی چلنا تھا اور قوم و ملت کی بھی راہنمائی کرنی تھی۔ اقبال میں مغرب زدگی نہ پہلے تھی نہ قیامِ یورپ کے دوران آئی۔ مغربی تہذیب سے مرعوبیت یا اندھی تقلید کا تو سوال ہی نہیں پیدا ہوا کیونکہ وہ طالب علم اور محقق تھے۔ یورپ کا ظاہری تماشا ضرور دیکھا مگر محققانہ نظر سے۔ اُنھیں ان میں خوبیاں بھی دکھائی دیں اور ان کی رُوح کے خالی پن کا بھی ادراک ہوا۔

یورپ میں بہت روشنیِ علم و ہنر ہے
حق یہ ہے کہ بے چشمۂ حیواں ہے یہ ظلمات

یورپ میں رہ کر اقبال کے ذہن و دل میں جو انقلابی تبدیلی آئی بلکہ ان کی کایا پلٹی، وہ ان کا وطن پرستی سے انحراف تھا۔ اسکی وجہ بھی یورپ بنا کیونکہ وہاں وطن پرستی کی جو لہر چلی تھی اس کی وجہ سے مختلف اقوامِ یورپ ایک دوسرے کے دشمن بن گئے تھے۔ وطن پرستی اور اس کے نتیجے میں پنپنے والی باہمی دشمنیاں انھی کو خاک و خون میں نہلانے والی تھی۔ اقبال نے اس کی پیشن گوئی کر دی تھی اور جو چند سال بعد پہلی عالمگیر جنگ کی صورت میں سچ ثابت ہوئی۔ اقبال کا شعر ہے:

ہوتی ہے ترک کلیسا سے حاکمی آزاد
فرنگیوں کی سیاست ہے دیو بے زنجیر

راقم ۲۰۰۰ء میں یورپ کے سیاحتی دورے پر گیا تو بالخصوص ہائیڈل برگ کی اس گلی میں بھی گیا جو اقبال کے نام سے موسوم ہے۔ میں سیاحوں کے ایک گروپ کے ہمراہ محوِ سفر تھا۔ سوئزرلینڈ کے حسین شہر لیوژرن سے سفر کرتے ہوئے ہم ہائیڈل برگ میں رُکے۔ ہائیڈل برگ میں ہمارا قیام محض چند گھنٹے کا تھا جبکہ ہماری منزل میونخ تھی۔ ہماری کوچ ایک دریا کے کنارے رُکی جس کے دونوں اطراف انتہائی دلکش مناظر تھے۔ ہماری گائیڈ نے جونہی بتایا کہ یہ دریائے نیکر ہے تو میرے خیال میں فوراً اقبال کی مشہور نظم ''دریائے نیکر کے کنارے'' آ گئی۔ بہترین فطرت نگاری کے ساتھ سکوت اور خامشی کا یوں نقشہ کھینچا ہے کہ نظم پڑھتے ہوئے انسان شجر و حجر کی طرح خود کو اس خاموش منظر کا حصہ سمجھنے لگتا ہے۔

خاموش ہے چاندنی قمر کی
شاخیں ہیں خموش ہر شجر کی

میں گلی کے کنارے کھڑا تقریباً ایک صدی قبل کے ان لمحات کو ذہن میں لانے کی کوشش کر رہا تھا جب وہ عظیم فلسفی شاعر اس گلی میں سے گزرتا ہوگا۔ سامنے دریائے نیکر محوِ خرام ناز ہوگا۔ دوسری جانب سبزے کی چادر میں لپٹا کہسار (Konigstuhl) جھانکتا ہو گا۔ ان دلفریب مناظر کو دیکھ کر اقبال کے شاعرانہ احساسات اور جذبات کی کیفیت کیا ہوتی ہوگی۔ یہ دلکش اور رنگین نظارے ان کے شاعرانہ تخیل کو کس قدر مہمیز دیتے ہوں گے۔ پھر یہ خیال آتا کہ شاعر کے تصورانہ تخیل میں جو منظر بسے ہوتے ہیں کوئی خارجی منظر ان کا نعم البدل نہیں ہوسکتا۔ شاعر کے تخیل میں ایک جہاں آباد ہوتا ہے۔ وہ جب چاہتا ہے اس میں سے اپنا من چاہا منظر منتخب کرتا ہے اور اس کی تصویر کشی کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی مثال خود علامہؒ کی نظم ''ہمالہ'' ہے اس میں کوہسار کی جو منظر کشی کی گئی ہے وہ بے مثل ہے۔ قاری اس میں کھو کر رہ جاتا ہے اور خود کو اس کوہ و دمن کا حصہ محسوس کرنے لگتا ہے۔ یہ اقبالؒ کا حسن تخیل اور شاعرانہ کمال تھا۔ ورنہ جب یہ شہرہ آفاق نظم تخلیق ہوئی اس وقت تک ہمالہ تو درکنار انھوں نے کوئی پہاڑ بھی نہیں دیکھا تھا۔ اسے داخلی منظر نگاری بھی کہتے ہیں۔ عمر بڑھنے کے ساتھ ساتھ اقبال خارجی مناظر سے داخلی مناظر کی طرف مائل ہوتے گئے۔ ان کی خارجی منظر نگاری عمومی طور پر ان کے پہلے دورِ شاعری تک محدود ہے۔ اقبال خارجی مناظر کو بھی داخلی مناظر کے اظہار کا

ذریعہ بنا دیتے تھے۔ مثلاً مسجد قرطبہ کی ظاہری شان وسطوت بیان کرتے ہوئے اپنی قوم کے لیے بصیرت افروز پیغام بھی دے دیا۔

جس میں نہ ہو انقلاب موت ہے وہ زندگی
رُوح اُمم کی حیات کشمکشِ انقلاب

عام شعرا اور اقبالؒ میں یہی فرق ہے کہ وہ مسلمانوں کے عظیم ماضی کی اس نشانی کے منظر سے اپنے فلسفیانہ خیالات کو شعری جامہ پہنا دیتے ہیں۔ عام شاعر اس سے منظر نگاری یا پھر زیادہ سے زیادہ احساسِ زیاں کی شاعری کرتا مگر اقبال نے اس میں فلسفہ زمان و مکاں بیان کر دیا۔ تاہم اقبال کے شاعرانہ تخیل کی حد کہیں بھی حقیقت سے متجاوز نہیں ہوتی۔ ان کا فلسفہ بھی حیات کے پوشیدہ مگر حقیقی رموز آشکار کرتا ہے۔

یورپ میں قیام کا زمانہ (۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک) اقبال کی شاعری کا دوسرا دور سمجھا جاتا ہے۔ وہاں تعلیم حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ انھیں یورپ کی تہذیب وتمدن اور ان کے سیاسی، سماجی اور اقتصادی افکار جاننے کا موقع ملا۔ ان کے قلب وذہن میں تہذیبِ یورپ کا جو تصور تھا وہ پاش پاش ہو گیا اور اس کے اندر سے مشرقی تہذیب و تمدن کا سورج طلوع ہوا۔ انھوں نے یورپ میں بیٹھ کر بین الاقوامی مسائل خصوصاً اسلامی دنیا کے حالات کا بھرپور جائزہ لیا۔ ملتِ اسلامیہ کا شاندار ماضی، ناگفتہ بہ حال اور مخدوش مستقبل نے ان کے ذہن ودل میں بے چینی پیدا کر دی۔ ان کی دُور بین نگاہوں نے مسلمانوں کی خواب غفلت دیکھ لی تھی اس پر ان کی قلب ورُوح بے چین ہو گئی۔ اس کا اظہار ان کی شاعری میں بھرپور انداز میں ہوتا ہے۔:

دلِ مردہ دل نہیں ہے اسے زندہ کر دوبارہ
کہ یہی ہے اُمتوں کے مرضِ کہن کا چارہ

اُمتِ مسلمہ کے زوال، اس کے اسباب اور اس کے بہتر مستقبل کے لیے جتنا علامہؒ نے سوچا اور لکھا شاید ہی کسی مسلم اسکالر نے اتنا لکھا ہو۔ وہ عام مسلمان کو مردِ مومن بنا کر دُنیا کی امامت کے لیے تیار کرنا چاہتے تھے۔ ان کے کلام میں ایسی تاثیر موجود ہے کہ کسی بھی باشعور شخص کے ذہن ودل میں انقلاب پیدا کر سکے۔ ان کا فکر انگیز کلام تا قیامت دلوں کو گرماتا رہے گا۔ ان کا ایمان افروز شعر دیکھیے:

آج بھی ہو جو براہیم کا ایماں پیدا
آگ کر سکتی ہے اندازِ گلستاں پیدا

اقبال کی شاعری کی خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ دیدۂ اُمیدی، ہمایوں افزائی اور روشن مستقبل کے خواب سے کبھی دست بردار نہیں ہوتے۔ حالات جیسے بھی ہوں اقبالؒ اُمت کو روشن مستقبل کی اُمید دلاتے ہیں:

نکل کے صحرا سے جس نے رُوما کی سلطنت کو اُلٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے، وہ شیر پھر ہشیار ہو گا

یورپ میں اقبالؒ کی جو ماہیت قلبی ہوئی اس سے ان کی شاعری میں مزید نکھار آ گیا۔ انھیں باہر جا کر احساس ہوتا ہے کہ ہندوستانی مسلمانوں کی بقا اور نجات وطنیت میں نہیں بلکہ اسلام کی ڈور کو مضبوطی سے تھامنے میں ہے۔ انھوں نے یہ بھی دیکھا کہ مغرب جو قوم پرستی میں سب سے آگے ہے وہاں قومیت کے نام، پر استحصال اور ملک گیری کی جیسے دوڑ لگی ہے۔ انگلستان، فرانس، پرتگال اور ہالینڈ جیسے ملکوں نے اسلحے اور سازشوں کے بل بوتے پر آدھی سے زائد دنیا کو غلامی کے پنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ وہ ان غلام اقوام کا آخری قطرہ خون بھی چوسنے پر لگے تھے۔ اس معاملے میں ان ممالک کے درمیان جیسے مقابلہ ہو رہا تھا۔ خود اقبالؒ کا دیس ہندوستان بھی انگریزوں کے قبضہ استبداد میں لہو لہان تھا۔ انگریز اس سونے کی چڑیا کا آخری پر تک نوچ لینا چاہتے تھے۔ جبکہ ہندوستانیوں کی اکثریت جنگل کے دَور کی زندگی جی رہی تھی۔ نہ تعلیم کی سہولتیں، نہ علاج معالجے کا بندوبست، نہ رسل ورسائل کا انتظام۔ حتیٰ کہ عوام کی اکثریت کو دو وقت کی روٹی بھی میسر نہیں تھی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ غلامی کی مشکیں اس طرح کس لی گئی تھیں کہ قدم قدم پر ہندوستانیوں کو اس غلامی کا احساس دلایا جاتا تھا۔ ہندوستانیوں کو ایک عام انگریز کیسامنے سرنگوں بیٹھنا پڑتا تھا۔ اقبال اسی ہندوستان سے جب انگریزوں کے اپنے ملک جاتے ہیں تو انھیں احساس ہوتا ہے کہ ہندوستانیوں کے ساتھ کتنا ناروا سلوک ہو رہا ہے۔ انھوں نے اپنے عوام کے لیے الگ قوانین بنا رکھے ہیں اور غلام اقوام کے لیے الگ قوانین بنا رکھے ہیں جو سراسر ظلم وانصافی پر مبنی ہیں۔ اقبال جیسا حساس شاعر، مفکر اور فلسفی یہ حالات دیکھتا ہے تو اس کے اندر ایک انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ ایسا انقلاب جو اسے اس ظالمانہ نظام سے، اس منافقانہ تہذیب وتمدن سے اور جور وجفا پر مبنی نظام سیاست سے انتہائی برگشتہ کر دیتا ہے۔ انھوں نے یورپی اقوام کی قوم پرستی کے نتائج دیکھے تو سوچا اگر یہی قومیت کا انجام ہے تو اس سے توبہ ہی بھلی۔

یورپ کی فضاؤں میں پنپنے والی اس ذہنی اور قلبی ماہیت کے بعد اقبال وطن کے اس طرح بت بنا کر پوجنے کو اسلام کی عالمگیر روح کے منافی خیال کرنے لگے۔ انھوں نے بڑی خوبصورتی سے اپنے اس خیال کا اظہار کیا ہے۔:

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

اس کے بعد اقبال تادمِ مرگ امّتِ محمدی کی ترجمانی کرتے رہے۔ کیونکہ وہ بخوبی جان گئے تھے کہ اُمّت مسلمہ کی بقا اخوت واتحاد میں مضمر ہے۔ اسے قومیتوں میں تقسیم کرنا

وحدتِ دینی کو پارہ پارہ کرنا ہے۔ اس تقسیم در تقسیم سے وہ نحیف ہو کر غیروں کے دستِ نگر بنے رہیں گے۔ کاش اقبال کی یہ فکر اسلامی حکمرانوں کے قلب و ذہن میں جگہ پا سکے۔

خالد معین معتبر شاعر سے معتبر ناول نگار تک

ڈاکٹر ارشد رضوی

یہ وہی قصہ ہے، وہی پرانا قدیم قصہ جسے بار بار دہرایا گیا ہے لیکن جب یہ قصہ خالد معین جیسے تخلیق کار تک پہنچا تو اس کی تقدیر بدل گئی، دو ہی تو باتیں ہوتی ہیں یا تو قصہ تخلیق کار کی تقدیر بدل دیتا ہے یا تخلیق کار قصے کی، خالد معین نے اس بار بار ہونے والے قصے کی تقدیر بدل دی ہے کہ خالد معین دیکھتے ہی پہچانا جاتا ہے، تخلیق کے نشے میں ڈوبا زندہ زندہ سا۔ ہر لحہ اپنی وحشتوں اور محبتوں کا بوجھ اٹھائے اپنی بھاری بھاری آنکھوں سے دیکھتا ہے، یہ دیکھنا معمولی نہیں، غیر معمولی ہوتا ہے کہ وہ کیسے اپنے سامنے والی سانس لیتی شخصیت پر اثر انداز ہوا اور اسے سمیٹ لے۔ اسے یہ فن ودیعت ہوا ہے، بہت زیادہ محبت کرنے کا فن جو اس کی وحشت میں ڈوبی ہوئی ہے یہ کوئی معمولی وحشت نہیں، برسوں سے اس کے پیچھے لگی ہے، کوئی اور ہوتا تو ڈر جاتا لیکن یہ تو خالد معین ہے، اس نے ترچھی لمبی آنکھوں والی وحشت کو گلے لگایا ہے، سینچا ہے کہ اب وہ ایک مبہوت کر دینے والی خوبصورتی بنی اس کے چہرے سے عیاں ہے۔

وہ بے پناہ صلاحیتوں کا شاعر ہے۔ ایک ایسا شاعر جو اس صنعتی کاسموپولیٹن شہر کی بدصورتی میں پھول اُگاتا پھرتا ہے، دیکھا جا سکتا ہے کے شہری زندگی میں حیاتی خوبصورتی مر رہی ہے کچھ حصے تو نجانے کب کے مر بھی چکے لیکن دیکھتا ہوں اور تسلیم کرتا کی میرا دوست شاعر اپنے آپ میں دھمال ڈالتا، روز ایک نئی دنیا تخلیق کرتا ہے، تخلیق کی بارشوں میں نہاتا ایسے خواب دیکھتا ہے جن کی تعبیر دیکھنے کو وہ زندہ ہے۔ جاگتی آنکھوں سے زندہ رہتے ہوئے اس نے نثار ہونے کا بھی ثبوت دیا ہے، وہ لکھتا رہتا ہے، دوستوں پر، مصوری پر، شہر کے سوتے جاگتے رویوں پر کہ تخلیقی وفور اس میں پور پور سمایا ایسے دیکھائی پڑتا ہے جیسے گھنے جنگل میں اُگ لگی ہو۔ لیکن اُس شام، جو رات بن رہی تھی اس نے مجھے اپنے تخلیقی کرب کے نئے رخ سے متعارف کروایا، یہ ناول تھا اس کی بے پناہ آبیاری کا ثبوت جو بارش بن کر اس کے اندر ہوتی رہی ہے اور اب پھولوں کی کیاری بنی مہک رہی ہے، ایسی مہک جو عام طور پر موتیائی ہوا اور شام کے آتے ہی پھیل جائے۔ ویسے بھی وہ شام کا رسیا ہے میں نے اس شام میں ہی اسے دیکھا کی اس کے ہاتھ چمک رہے تھے اور آنکھوں کے کونوں پر شراب کے قرمزی قطرے رکھے تھے۔

وفور میں نے دوسری شام ہی پڑھ لیا تھا اور جیسے جیسے بڑھتا جاتا تھا جملوں کی کشش مجھے

اردو، ایک ایسی زبان جو جغرافیائی اور ثقافتی حدود سے ماورا ہے، اسے بے شمار ادبی روشن خیالوں نے مالا مال کیا ہے جنہوں نے اس کی نشو ونما اور ارتقا میں اپنا کردار ادا کیا ہے۔ ان بلند پایہ شخصیات میں سے ایک نام جو نمایاں ہے وہ فراق گورکھپوری کا ہے جو ایک ممتاز نقاد، شاعر اور مفکر ہیں۔ اردو ادب میں ان کی گہری بصیرت اور تنقیدی ذہانت نے اردو ادبی تنقید کے منظر نامے پر انمٹ نقوش چھوڑے ہیں۔ یہ مضمون اردو ادب کے ایک ممتاز نقاد کے طور پر فراق گورکھپوری کی زندگی، شراکت اور میراث پر روشنی ڈالتا ہے۔

زبان کی تعریف یوں کی جا سکتی ہے کہ یہ انسانی اظہار کا وہ ذریعہ ہے جس کے ذریعے انسان اپنے خیالات، جذبات، اور احساسات کو دوسروں تک پہنچاتا ہے۔ زبان مختلف علامتوں، الفاظ، اور قواعد کا مجموعہ ہوتی ہے جو کسی مخصوص معاشرت یا قوم کے افراد کے درمیان رابطے کو ممکن بناتی ہے۔ زبان کے ذریعے لوگ ایک دوسرے کے ساتھ بات چیت کرتے ہیں، علم منتقل کرتے ہیں، اور ثقافتی ورثہ محفوظ رکھتے ہیں۔ زبان صرف الفاظ اور جملوں کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اس میں اشارے، علامات، اور طرز ادائیگی بھی شامل ہوتے ہیں، جو انسانوں کے درمیان معنی خیز رابطے کو ممکن بناتے ہیں۔ زبان نہ صرف سماجی تعلقات کی بنیاد ہے بلکہ یہ علم، سوچ، اور تخلیقی عمل کا بھی اہم ذریعہ ہے۔ ہر زبان اپنے مخصوص صوتی نظام، لغت، اور گرامر رکھتی ہے جو اسے دوسری زبانوں سے منفرد بناتی ہے۔

مولانا حالی ایک شاعر اور سوانح نگار تھے جو اپنی تصنیف کے لیے مشہور تھے، جو مشہور شاعر سر محمد اقبال کی سوانح عمری ہے۔ "حیات جاوید" کو اردو کی جامع سوانح عمری کی ابتدائی مثالوں میں سے ایک سمجھا جاتا ہے اور اقبال کی زندگی، افکار اور خدمات کے بارے میں بصیرت فراہم کرتا ہے۔ ان ابتدائی اردو سوانح نگاروں نے اردو ادب میں سوانح نگاری کی فروغ پذیر روایت کی بنیاد رکھی۔ ان کے کاموں نے نہ صرف قابل ذکر افراد کی زندگیوں کو دستاویزی شکل دی بلکہ اردو زبان کی ثقافتی اور فکری ترقی میں بھی اہم کردار ادا کیا۔ اس بنیاد پر لکھنے والوں کی بعد کی نسلوں نے اردو سوانح عمری کے دائرہ کار کو وسیع کرتے ہوئے مضامین اور موضوعات کی ایک وسیع رینج کو شامل کیا۔

اپنی گرفت میں لیتی جاتی تھی، جیسے میں نے کہا یہ بھی قصہ تھا عورت اور مرد کا قصہ اور تنہائی کا کوویڈ، چاروں اور پھیلا اپنے کیکٹسی پنجوں سے کرید تا تھا، ویسے بھی تنہائی عورت اور مرد کے لیے اکسیر ہے۔ اور خالد نے اسی پھیلی ہوئی تنہائی میں عورت اور مرد کے اس قدیم قصے کو نیا ذائقہ دیا ہے۔ یہ ذائقہ زبان کی نوک پر کافی دیر دھرا رہتا ہے کہ عورت اور مرد کے درمیان جس روحانی جذبے کو اس نے لکھا ہے وہ آج کے مادی رویوں میں بہر حال قید ہے اور مرد کی ازلی خواہش، کہ عورت کی بے پناہ کشش سے بھرا بھرا جسم اسی سے مخاطب ہو، پھر خالد کی نثاری کا جادو ہے کہ وہ جانتا ہے، مرد اور عورت کے درمیان اس کشش کے کتنے رنگ ہیں، ویسے بھی دیکھا گیا ہے کہ وہ رنگوں کے رموز جانتا ہے، اس نے پر کشش رنگوں کو اس قدر قریب سے دیکھا ہے کہ یہ سانس لیتے رنگ اس کی تحریر کا حصہ بن گئے ہیں، ویسے بھی ایسی تحریریں جان لیوا ہوتی ہیں لیکن خالق کہاں مرتا ہے ہوسکتا ہے کاغذ میں لکھی گئی تنہائی خالق کی ذات کا حصہ بن گئی ہو، تنہائی جس کے لمبے زہریلے ناخن بدن پر نشان ڈالتے جاتے ہوں، میں نے خالد کی شفاف جلد پر ایسے ہی نشان دیکھے ہیں، یہ تخلیق کے بعد کا عذاب ہیں جیسے شراب پینے کے بعد دیر تک چہرہ کسی ایسے خیال کے ہاتھ چڑھ جاتا ہے کہ چھپائے نہیں چھپتا۔

ناول پڑھ کر میں نے خالد کو کچھ اور جانا، کچھ مختلف، کچھ تنہا، جس پر وحشتیں حملہ آور ہوں ویسے تو یہ حملے اس پر ہمیشہ سے ہوتے رہے ہیں، اس کی شاعری اس کے مزاج پر اپنا اثر چھوڑتی رہی ہے کہ میں نے اسے پچھلے کئی برسوں سے ایک شاعر ہی مانا ہے۔ ایک ایسا شاعر جسے لفظوں کی برہنگی کو لباس پہنانا آتا ہے کہ بے لباسی دیکھنے کی خواہش لاکھ سر اٹھاتی ہو، خالد انہیں بہر حال لباس پہنا تا رہتا ہے کہ وہ وصل سے زیادہ ہجر کا شاعر ہے، پھر دیکھتا ہوں وہ اپنے اندرون کو بدل رہا ہے، اس کے اندر کچھ انگڑائی لے رہا ہے۔ یہی جذبہ لیے وہ چوٹ کھائے آسمان پر آنکھ لگائے واپس لوٹتا ہے، تخلیقی جذبے سے سرشار اس نے پھر کچھ حاصل کر لیا ہے، اس کے ہاتھوں میں چمک ہے، اس تخلیق کی جسے اس نے لکھا ہے اور چہرے پر خراشیں ہیں کہ لکھتے لکھتے کبھی کبھی اس کے ہاتھ چہرے تک بھی گئے ہیں، لیکن دیکھا گیا ہے وہ تخلیق زدہ چہرہ لیے اپنے سونپے گئے کام میں مشغول ہے۔ ہماری بہت سی ساتھ گزاری ہوئی شامیں، جب جاتی دھوپ اس کے چہرے پر چمک رہی ہو اور رتجگوں سے بھری راتیں جب چاند کی چمک اس کے چہرے پر گھل رہی ہو تو وہ تخلیق کار ہی لگا ہے، جس کا حسن چمک چمک کر اپنی پہچان دے رہا ہو اور انہی تخلیق کے جان لیوا لمحوں سے گزرتا گزرتا وہ ناول تک پہنچا ہے جس میں مرد اور عورت ایک دوسرے کو پانے کی خواہش میں بھٹکتے ہیں، میں نے کہا نہ یہ خواہش پرانی ہے، ہر لمحہ وقوع پذیر ہوتی خواہش کب سے پیچھے لگی ہے کہ پیچھا نہیں چھوڑتی کہ تنہائی کے کیکٹسی زخمی کیے دیتے ہیں، خالد معین نے اسی مرد اور عورت کے زخم کو وا کیا ہے، کچھ اس طرح کہ یہ انگار نہیں سرخ پھول کی طرح کھلا ہے، جس کی خوشبو کے سب ہی اسیر ہیں، ویسے وہ خود بھی کسی سرخ پھول کی طرح کھل کر سب سے واضح نظر آتا ہے کہ تخلیقی وفور کسی شعلے کی طرح اس کے چہرے پر تڑپ رہا ہے، وہ جانتا ہے کہ اسے اسی عذاب کے ساتھ رہنا ہے اور اسی عذاب کے ساتھ رہتے رہتے وہ مسکرانے کا ہنر جان گیا ہے کہ وہ خالد معین ہے، خالد معین جس کی وحشتیں اس کا حسن ہیں اور صفحوں پر لکھی آتے جاتے لوگوں کو مسحور رکھتی ہیں۔

سوانح عمری ایک ادبی صنف ہے جس میں کسی فرد کی زندگی کے حالات، واقعات، کامیابیاں، مشکلات، اور تجربات کا تفصیلی بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں اُس فرد کی پیدائش سے لے کر موت تک کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی جاتی ہے۔ عصر حاضر میں ڈیجیٹل دور نے اردو سیرت کی روایت کو مزید بدل دیا ہے۔ سوانحی معلومات آن لائن آسانی سے دستیاب ہیں، اور ڈیجیٹل پلیٹ فارم زندگی کی کہانیوں کو محفوظ کرنے اور پھیلانے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کا ایک عظیم نام ہیں جنہوں نے نہ صرف اردو زبان و ادب کو نئی جہتیں دی بلکہ علمی و تحقیقی روایت کو بھی فروغ دیا۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے ادیب، نقاد، مترجم، محقق اور دانشور کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ ان کی علمی خدمات اور تخلیقی کارنامے اردو ادب کی تاریخ کا لازمی حصہ ہیں۔ اس مضمون میں ہم ان کی شخصیت اور فن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کریں گے تا کہ ان کے ہمہ جہت علمی و ادبی کردار کی گہرائی کو سمجھا جا سکے۔

مشرف علی فاروقی، ایک ہم عصر اردو-انگریزی مصنف، نے اپنی تخلیقات میں تاریخی اور افسانوی شخصیات کو تلاش کیا ہے۔ ان کے ناول اکثر تاریخی واقعات اور شخصیات سے متاثر ہوتے ہیں، فکشن کو سوانح حیات کے عناصر کے ساتھ ملاتے ہیں۔

اسلم فرخی اردو کے ممتاز دانشور، نقاد اور ادبی شخصیت تھے۔ اگرچہ وہ بنیادی طور پر سوانح نگار نہیں ہیں، اردو ادب میں ان کی وسیع شراکتوں میں تنقیدی مضامین اور تجزیے شامل ہیں جو سوانح سمیت مختلف ادبی اصناف کی تفہیم کو تقویت بخشتے ہیں۔

بانو قدسیہ، جو ایک نامور مصنفہ اور ڈرامہ نگار ہیں، نے اپنے ناولوں اور ڈراموں میں انسانی حالت کا جائزہ لیا۔ اگرچہ سختی سے سوانحی نہیں، اس کے کاموں میں اکثر اس کے کرداروں کی زندگیوں اور تعلقات کے بارے میں گہری بصیرت ہوتی ہے۔

علیگڑھ کے دو ہمعصر شاعر (جذبی اور مجاز)

ڈاکٹر تبسم جہاں
(اسسٹینٹ پروفیسر، شعبۂ اردو علیگڑھ مسلم یونیورسٹی علیگڑھ)

مجاز (پیدائش۔ اکتوبر ۱۹۱۱ء) جذبی (پیدائش اگست ۱۹۱۲ء) سے ایک برس بڑے تھے اور آگرہ میں دونوں گیارھویں درجے میں ہم جماعت تھے جہاں جذبی کی مجاز سے دوستی ہوئی۔ جذبی لکھتے ہیں:

''سینٹ جانس کالج میں داخل ہوئے کوئی مہینہ بھر گزرا تھا کہ ایک دن کلاس میں ایک صاحب سے جو میرے پاس بیٹھے ہوئے تھے گفتگو کے دوران میں معلوم ہوا کہ وہ لکھنؤ سے تشریف لائے ہیں، لکھنؤ میں انھوں نے امین آباد ہائی اسکول میں تعلیم پائی تھی اور وہیں سے ہائی اسکول کیا تھا۔ مجھے یاد آیا کہ جھانسی میں میرے ایک دوست جو ساتویں درجہ میں میرے ساتھ تھے کسی وجہ سے لکھنؤ چلے گئے تھے اور امین آباد ہائی اسکول میں داخلہ لے لیا تھا، میں نے ان سے اس واقعہ کا ذکر کیا، وہ بولے وہ تو میرے عزیز دوستوں میں تھے، بس یہی واقعہ ان سے دوستی کی بنیاد بن گیا۔ معلوم ہوا کہ ان کا نام اسرار الحق ہے ردولی کے رہنے والے ہیں۔'' [۱]

یہیں یہ دونوں نوجوان اپنے وقت کے مشہور شاعر فانی کی قربت میں آئے۔ ان سے ان کا کلام سنا اور انھیں اپنا کلام دکھایا۔ یہ زمانہ ۱۹۳۰ء کے آس پاس کا ہے۔ اسی کالج میں مشاعرہ ہوا اور یہیں مجاز نے غزل پڑھی جس پر انھیں گولڈ میڈل ملا۔ جس کا مطلع تھا۔

؎ یوں ہی بیٹھے رہو بس در دِ دل سے بے خبر ہو کر
بنو کیوں چارہ گر تم کیا کرو گے چارہ گر ہو کر

پھر یہ دونوں نوجوان شاعر ایک ساتھ فیل ہو کر جدا ہو گئے۔ جذبی لکھنؤ پہنچے اور مجاز علی گڑھ۔ اس زمانے کے علی گڑھ میں وہ نوجوان اکٹھا ہو گئے تھے جنھیں مستقبل میں ممتاز ترقی پسند شاعر اور ادیب ہونا تھا۔ اختر حسین رائے پوری، سبط حسن، حیات اللہ انصاری، جاں نثار اختر، سردار جعفری، جذبی اور مجاز کی ابتدائی شعری کاوشوں سے علی گڑھ کی ادبی فضا اپنا رنگ بدل رہی تھی۔ تاریخ کے پروفیسر محمد اشرف انگلستان سے لوٹ آئے تھے اور یونیورسٹی میں ترقی پسند خیالات کا ماخذ اور مرکز تصور کیے جاتے تھے۔ غالباً انھیں کے زیرِ اثر اختر حسین رائے پوری کا مضمون ''ادب اور زندگی'' ۱۹۳۲ء میں شائع ہوا۔ یہی زمانہ ہے جس کے آس پاس سجاد ظہیر کا مجموعہ ''انگارے'' شائع ہوا تھا۔ علی گڑھ میں ترقی پسندی کی دھوم تھی اور ابھی یہ نوجوان ترقی پسندی کے وسیع تر مفہوم سے پوری طرح واقف نہیں ہوئے لیکن روایت سے بغاوت زندگی سے محبت اور خوش آئند مستقبل کی آرزو ان سب کے کلام میں مشترک قدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس لیے جو پہلی صفت جذبی اور ان کے علی گڑھ کے معاصر شعراء میں مشترک کہی جاسکتی ہے وہ ترقی پسندی کا یہی تصور ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔

چند دنوں کے بعد مجروح سلطان پوری جگر صاحب کی معیت میں علی گڑھ آ گئے تھے اور رشید احمد صدیقی صاحب کے یہاں قیام پذیر تھے۔ جیسے جیسے نوجوان ترقی پسند شعراء کا یہ کارواں آگے بڑھا ان کے تخلیقی شعور کی بالیدگی نے انھیں اپنی راہ منتخب کرنے میں مدد کی اور جب بالآخر ان شعراء نے اردو کے ادبی افق پر اپنی جگہ بنائی تو معلوم ہوا کہ مشترک صفات کے باوجود اپنی ذاتی پسند و رجحان کے سبب یہ سب شعراء ایک دوسرے سے کسی نہ کسی سطح پر مختلف تھے۔ مثلاً سردار جعفری اپنے ترقی پسند خیالات کی شدت اور طرزِ اظہار کے مخصوص خارجیت کے سبب بحیثیت نظم نگار بہت مشہور ہوئے جب کہ مجاز، جذبی اور مجروح سلطان پوری اپنی غزلوں کے حوالے سے زیادہ مقبول و مشہور ہوئے۔

مجاز اور جذبی میں دوسری قدر مشترک ان کی ''رومانیت'' تھی۔ اگرچہ اس میں بھی ایک لطیف فرق یہ ہے کہ مجاز جس نوع کی عشقیہ رومانیت کا شہید ہے وہ جذبی کے یہاں نہیں ملتی۔ ممکن ہے کہ مجاز اپنے بالکل ابتدائی زمانے میں اختر شیرانی کے طرز سے متاثر ہوئے۔ لیکن یہ مشاہدہ بھی صرف ان کی نظموں تک محدود ہے۔ غزل میں ان دونوں کے درمیان فرق و امتیاز کلاسیکی طرزِ اظہار سے ان کی قربت یا نوعیت کی بنیاد پر کیا جاسکتا ہے۔ مثلاً جذبی کی غزلوں میں کہیں کہیں ایسے اشعار بھی ملتے ہیں جن پر تصوف کا اثر واضح طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

؎ تیرے جلووں کی حد ملی تو کب
ہوگئی جب نظر بھی لامحدود

؎ احساسِ فنا بھی مجھے احساسِ بقا ہے
یہ کون سرِ بزم مجھے دیکھ رہا ہے

؎ تمہارے حسن کے جلووں کی شوخیاں تو بہ
نظر تو آتے نہیں، دل یہ چھائے جاتے ہیں

اس نوع کے متصوفانہ اشعار مجاز کے کلام میں نہیں ملتے۔ اس کے مقابلے میں محبوب

سے ربط کی نوعیت اور عشق کے معاملات مجاز کا محبوب موضوع ہیں۔ مجاز کی غزلوں سے بعض اشعار ملاحظہ ہوں۔

؎ کچھ تمہاری نگاہ کافر تھی
کچھ مجھے بھی خراب ہونا تھا
پھر مری آنکھ ہوگئی نمناک
پھر کسی نے مزاج پوچھا ہے
مجھ کو یہ آرزو وہ اٹھائیں نقاب خود
ان کو یہ انتظار تقاضا کرے کوئی
ہم نشیں دل کی حقیقت کیا کہوں
سوز میں ڈوبا ہوا اک ساز ہے

ان مثالوں سے یہ نتیجہ نکالنا ٹھیک نہ ہوگا کہ مجاز نے خود کو صرف معاملاتِ حسن و عشق تک محدود رکھا۔ ان کی ترقی پسند فکر کا اظہار ان اشعار میں بھی ہوتا ہے جس میں روایتی بیان کے پردے سے ان کی ترقی پسند فکر کی شعائیں دکھائی دیتی ہیں۔

؎ بہت مشکل ہے دنیا کا سنورنا
تری زلفوں کا پیچ و خم نہیں ہے
بہت کچھ اور بھی ہے اس جہاں میں
یہ دنیا محض غم ہی غم نہیں ہے
بخشی ہیں ہم کو عشق نے وہ جرأتیں مجاز
ڈرتے نہیں سیاستِ اہلِ جہاں سے ہم

جذبی کی غزلوں میں بھی اظہار و بیان کا سلیقہ تقریباً ایسا ہی ہے۔ البتہ انھوں نے اپنے لیے جو لفظیات منتخب کیں اس کا مزاج و کردار مجاز سے مختلف تھا۔ مثلاً جذبی کے کلیات میں سفر و منزل کے استعارے جس تواتر سے آئے ہیں وہ مجاز کے کلام میں نہیں ہیں۔ جذبی کی لفظیات پر روایتی شعری زبان کا اثر بھی مجاز سے زیادہ ہے مزید یہ کہ جذبی کی غزلوں کا عاشق محبوب کے لیے انتہائی تعلق کے باوجود خود اپنی کیفیتوں کے بیان پر زیادہ مرتکز ہے۔

؎ سنبھلنے دے ذرا بیتابیِ دل
نظر آتے ہیں کچھ آثارِ منزل
منزلِ عشق پہ یاد آئیں گے کچھ راہ کے غم
مجھ سے لپٹی ہوئی کچھ گردِ سفر بھی ہوگی
پابندِ وفا رو لے اب ضبطِ محبت کو
ہنستی ہوئی آتی ہے وہ دور سے رسوائی
کیفیتِ ہجراں کی معراج ہے اے جذبی
محفل میں نظر آئے جب عالمِ تنہائی

اس کے مقابلے میں مجاز کی غزلوں کے اوصاف بیان کرتے ہوئے پروفیسر محمد حسن کہتے ہیں کہ:

''یہ مترنم خروش یہ مہذب اور نغمہ بار غنائیت مجاز کے کلام کی خصوصیت ہے۔'' ۲؎

غزلوں کے علاوہ کلام کی غنائیت مجاز کی نظموں میں بھی اعلیٰ سطح پر نمایاں ہے۔ ویسے بھی مجاز نے غزلیں کم اور نظمیں بہت کہی ہیں اور مجاز کی نظمیں بشمولِ جذبی اپنے تمام معاصرین میں سب سے زیادہ مقبول بھی ہیں۔ آوارہ، رات اور ریل، نورا، ننھی پجارن، نذرِ علی گڑھ، نوجوان خاتون سے، آہنگِ نو، بول اری او دھرتی بول اور اندھیری رات کا مسافر جیسی مجاز کی بہت ساری نظمیں حد سے زیادہ مقبول تھیں۔ ان کی مقبولیت میں ان کے موضوع کے علاوہ نظموں کے آہنگ کو بھی بہت دخل ہے۔ نذرِ علی گڑھ جس کے انتخاب سے علی گڑھ یونیورسٹی کا ترانہ مرتب ہوا ہے اپنی خوش آہنگی کے سبب اردو دنیا میں اب بھی سب سے مقبول نظم کہی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ مجاز کی نظم 'رات اور ریل' کا آہنگ بھی غیر معمولی طور پر خوش گوار ہے اور اس میں مجاز نے تشبیہوں اور پیکروں کے ذریعے وہ نقشہ مرتب کر دیا ہے جو ان کے معاصرین میں کسی سے نہ ہوسکا۔

؎ پھر چلی ہے ریل اسٹیشن سے لہراتی ہوئی
نیم شب کی خامشی میں زیرِ لب گاتی ہوئی
ڈگمگاتی ، جھومتی، سیٹی بجاتی، کھیلتی
وادی و کہسار کی ٹھنڈی ہوا کھاتی ہوئی
تیز جھونکوں میں وہ چھم چھم کا سرودِ دل نشیں
آندھیوں میں مینہ برسنے کی صدا آتی ہوئی
ٹھوکریں کھا کر، لچکتی ، گنگناتی، جھومتی
سرخوشی میں گھنگروؤں کی تال پر گاتی ہوئی
ناز سے ہر موڑ پر کھاتی ہوئی سو پیچ و خم
اک دلہن اپنی ادا سے آپ شرماتی ہوئی
مرغزاروں میں دکھاتی جوئے شیریں کا خرام
وادیوں میں ابر کے مانند منڈلاتی ہوئی
اک پہاڑی پر دکھاتی آبشاروں کی جھلک
اک بیاباں میں چراغِ طور دکھلاتی ہوئی

جستجو میں منزلِ مقصود کی دیوانہ وار
اپنا سر دھنتی فضا میں بال بکھراتی ہوئی

اور ایک اسی نظم پر کیا موقوف ہے مجازؔ کی نظموں کا آہنگ ان کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جو ان کے معاصرین سے ان کو ممتاز کرتی ہے۔

مجازؔ کی نظم نگاری کے سلسلے میں ان کی نظم 'آوارہ' کا ذکر ضروری ہے۔ جذبیؔ صاحب کے مطابق مجازؔ نے یہ نظم پہلی مرتبہ پروفیسر احمد علی کے گھر ایک نشست میں سنائی۔ اس محفل کا ذکر کرتے ہوئے جذبیؔ صاحب لکھتے ہیں۔

''جب یہ محفل گرم ہوئی تو مجھ سے احمد علی نے بہ اصرار شعر سنانے کی فرمائش کی۔ میں نے بہت دنوں سے کچھ نہیں کہا تھا، بڑی بے دلی سے ایک پرانی غزل سنا دی۔ اس کے بعد مجازؔ کو تکلیف دی گئی۔ میں نے پوچھا ادھر تم نے کچھ کہا ہے؟ مجازؔ بولے کہ ہاں ایک نظم کہی ہے، وہی سناتا ہوں، عنوان ہے ''آوارہ''۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مجازؔ پڑھ رہے تھے اور ہم سب ایک محویت کے عالم میں خاموش بیٹھے تھے، نظم ختم ہوئی، تھوڑی دیر کے بعد ہم دونوں احمد علی سے رخصت ہوئے، سڑک پر آئے، مجازؔ نے پوچھا نظم کے بارے میں کیا خیال ہے، میں نے کہا مجازؔ فرسٹ کلاس نظم ہے۔ مجازؔ چلتے چلتے رک گئے، ان کا چہرہ سڑک کی دھندلی روشنی میں چمک رہا تھا، کہنے لگے جذبیؔ یہ تم کہہ رہے ہو؟ میں نے کہا ہاں میں کہہ رہا ہوں۔ وہ جانتے تھے کہ میں داد اسی وقت دیتا ہوں جب کوئی شعر مجھے واقعی پسند آجائے۔'' ۳؎

مجازؔ کی نظم ''آوارہ'' اس خاص زمانے میں نئی نسل کی کیفیات کی بہترین ترجمان ہے۔ اس لیے اسے جس صاحبِ ذوق نے سنا پسند کیا۔ عصمت چغتائی نے مجازؔ پر اپنے مشہورِ زمانہ مضمون ''عشقِ مجازی'' میں اس نظم کی غیر معمولی تاثیر کا واقعہ بیان کیا ہے۔ یونیورسٹی کی چھٹیوں کے زمانے میں ہوسٹل خالی ہو جاتے ہیں۔ گرلس ہوسٹل میں بھی صرف وہی دس پانچ لڑکیاں بچتی ہیں جو نہ اپنے گھر جا سکیں اور نہ اپنے کسی رشتہ دار کے یہاں جا سکیں۔ شروع کے دو ایک دن گپّوں میں گزر جاتے ہیں لیکن پھر طبیعت پر ایک بیزاری کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اب یہاں سے یہ واقعہ عصمت چغتائی سے سینے۔

''اور یہ سب لڑکیاں بھی یہی سوچ رہی تھیں۔ چار دن چھٹیوں کے گزر گئے چار اور گزر جائیں گے۔ پھر چار دن اور رہ جائیں گے اور یونہی یہ لمبے بیکار بے رنگ دن اور یہ تھکی تھکی شامیں یہ ان تھک رینگتی ہوئی قطار!

اس نا امیدی اور غریب الوطنی کے احساس نے کچھ اس درجہ محبوس کیا کہ بے اختیار آہیں نکل گئیں۔

''اب کے گرمیوں میں ماموں ابا کے پاس چلی جاؤں''۔ اختر نے ترکیب سوچی۔ ''اور ہم تو پہاڑ پر جایا ہی کرتے ہیں'' رضیہ نے اطلاع دی۔

''کلیاں بڑی اچھی جگہ ہے'' عالیہ ہمیشہ اڑتی تھی۔ مگر محمودہ؟ کالی آنکھوں، کالے بالوں اور کالی رنگت والی محمودہ؟ اس کا کیا ہوگا۔ جس کا نہ کوئی گھر تھا اور نہ رشتہ دار بورڈنگ ہی اس کا گھر تھا وہی لمبا چوڑا مقبرے کی طرح سنسان ہوسٹل جہاں وہ چھٹیاں گزارا کرتی تھی۔ پھر گھٹن اور بڑھ گئی۔ خاموشی گہری ہوگئی۔ ایک خلا سا دلوں میں پھیلنے لگا۔ اسی خلاء میں آواز آئی۔

''اے غمِ دل کیا کروں'' چونک کر جو ہم نے دیکھا تو یہ چاکلیٹ جیسی سوندھی رنگت والی محمودہ تھی جو ہم سب سے دور دری کے کونے پر ہاتھوں کا تکیہ سر کے نیچے رکھے اپنی آنسو بھری آواز میں گنگنا رہی تھی۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اے وحشتِ دل کیا کروں''

یہ روپہلی چھاؤں یہ آکاش پر تاروں کا جال
جیسے صوفی کا تصور جیسے عاشق کا خیال
آہ لیکن کون جانے کون سمجھے جی کا حال
اے غمِ دل کیا کروں اے وحشتِ دل کیا کروں

کچھ سوتی ہوئی لڑکیوں کے سپنے بکھر گئے کلبلا کر اُٹھ بیٹھیں محمودہ کی آواز جذبات کی فراوانی سے اور سہم گئی ؎

اک محل کی آڑ سے نکلا وہ پیلا ماہتاب
جیسے ملّا کا عمامہ جیسے بنئے کی کتاب
جیسے مفلس کی جوانی جیسے بیوہ کا شباب
اے غمِ دل کیا کروں۔ اے وحشتِ دل کیا کروں

پھر تو ستارے ٹوٹنے لگے موتیوں کی لڑیاں ٹھیس سے بکھر کر دو پٹوں میں الجھ گئیں۔ سینوں میں ہوکیں اٹھنے لگیں۔ لیکن جب

شعلے بھڑک اٹھے۔ پیمانے چھلک پڑے اور سینوں کے زخم مہک اٹھے تو ڈرامہ شاعری کی حدوں سے گزر کر بھونڈے قسم کی بھوں بھوں میں پھسل آیا۔ وہ دھوم دھام کی صف ماتم بچھی کہ محرم ماند پڑ گئے۔ سرور سے گزر کر الہڑ بازی پر نوبت آ پہنچی۔ نہایت غیر شاعرانہ قسم کی سوں سوں۔'' ۴؎

یہ تو گرلس کالج ہوسٹل کی لڑکیاں تھیں ملک کا ہر نوجوان اسی بے کیفی کا شکار تھا کہ اب اس کے پاس کوئی مقصد نہیں کوئی تحریک نہیں اور نہ دل میں کسی نوع کا جوش باقی رہا تھا۔

جذبی کی نظم ''موت'' کا مقابلہ 'آوارہ' سے کیا جاتا ہے۔ جو کسی طرح مناسب نہیں۔ 'موت' میں دنیا کے حسن، اس کی خوبصورتی اور شاعر کے لیے اس کی پسندیدگی کا بیان ہے جب کہ 'آوارہ' نوجوان کی بے کیفی، بے مقصدی اور ان کے بے معنی پن کی تصویر کشی کرتی ہے۔ البتہ جس خصوصیت میں ان دونوں نظموں کا مقابلہ کیا جاسکتا ہے وہ ان کی روانی اور خوش آہنگی ہے۔

عزیز احمد کو یہ نظم پسند نہیں اس لیے کہ انھیں اس نظم میں کہیں انقلاب کی آواز سنائی نہیں دیتی۔ عزیز احمد لکھتے ہیں:

''انقلاب کا پیغام حیات افروز اور حیات انگیز ہے۔ وہ موت سے چند لمحوں کی عشرت کے لیے دریوزہ گری نہیں کر سکتا۔ انقلاب یہ نہیں کہہ سکتا

میں تھکا ہارا تھا، اتنے میں جو آئے بادل
کسی متوالے نے چپکے سے بڑھا دی بوتل
اُف وہ رنگین پُر اسرار خیالوں کے محل
ایسے دو چار محل اور بنالوں تو چلوں۔'' ۵؎

جذبی نے نظمیں کم کہی ہیں اور ان میں بھی کئی تو واقعاتی نظمیں ہیں اور بعض مناظرہ کا رنگ رکھتی ہیں۔ مجاز کی طرح کوئی محبوب یا لڑکی ان کی کسی نظم کا موضوع نہیں تو جذبی کی نظموں میں عشقیہ جذبات کی وہ فراوانی بھی نہیں جو مجاز کی نظموں میں ہے۔

جذبی اپنے ہم عصروں میں مجاز کو غالباً سب سے زیادہ پسند کرتے تھے۔ ان سے انھیں تعلق بھی بہت تھا۔ انھوں نے مجاز کے انتقال پر ایک بہت پُر اثر نظم بھی کہی تھی۔

آج اک جادۂ پُر پیچ کا راہی گُم ہے
اِک حریفِ الم لامتناہی گُم ہے
ایک سودائے تعمیرِ گلستاں مفقود
ایک آوارۂ طوفانِ تباہی گُم ہے

اِک دہکتا ہوا شعلہ نہیں مے خانے میں
اِک مہکتی ہوئی سرشار نگاہی گُم ہے
حُسن والوں کی جبینوں کا اجالا اوجھل
عشق والوں کے نصیبوں کی سیاہی گُم ہے

علیگڑھ کی درسگاہ میں ان دونوں نے صرف اپنے منتخب مضامین کا سبق ہی نہیں پڑھا بلکہ ایک وسیع کائنات کے حسن کے انجذاب اور اس کے تخلیقی اظہار کا سلیقہ بھی سیکھا۔ ان کی غزلیں اور نظمیں ان کی اپنی تخلیقی ترجیحات کی نمایندگی کرتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ہی ان کے کلام میں وسیع النظری اور تحسینِ حسن کی جو فضا ملتی ہے اِن دونوں شاعروں کے یہاں قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتی ہے کہ اس زمانے میں یہی علیگڑھ کا امتیاز تھا۔

حواشی:

(۱) مجاز کی زندگی کا ایک ورق۔ معین احسن جذبی۔ مشمولہ۔ فکر و نظر۔ ۲۰۰۰ء شمارہ۔ ۲۔ ص۔ ۷۷، ۷۸

(۲) معاصر ادب کے پیش رو۔ محمد حسن۔ ص۔ ۵۷

(۳) مجاز کی زندگی کا ایک ورق۔ معین احسن جذبی۔ مشمولہ۔ فکر و نظر۔ ۲۰۰۰ء۔ شمارہ۔ ۲۔ ص۔ ۸۱

(۴) عشقِ مجازی۔ عصمت چغتائی۔ مشمولہ۔ کلیاتِ مجاز۔ اسرار الحق مجاز۔ ص۔ ۵۸، ۵۹

(۵) ترقی پسند ادب۔ عزیز احمد۔ ص۔ ۱۱۳

میر ببر علی انیس نے مرثیہ نگاری میں ایک بے مثال مقام حاصل کیا ہے۔ ان کی مرثیہ نگاری نے اردو ادب میں ایک نئی جہت کا اضافہ کیا۔ انیس کے مرثیے اپنی زبان کی خوبصورتی، تفصیل، اور جذباتی اثرات کے باعث خاص شہرت رکھتے ہیں۔ انیس کے مرثیوں میں عموماً حضرت امام حسینؑ اور کربلا کے واقعات کو موضوع بنایا گیا ہے۔ ان کی شاعری میں ان واقعات کی تفصیل، کرداروں کی عکاسی، اور جذبے کی شدت اس قدر موثر ہے کہ سننے والے ان واقعات کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھنے کا احساس کرتے ہیں۔ میر انیس نے مرثیہ نگاری کو ایک اعلیٰ فن کے درجے تک پہنچایا اور اس صنف کو شاعری کی دیگر اصناف کے برابر مقام دلایا۔ ان کے مرثیوں میں نہ صرف واقعات کی تاریخی صحیت پائی جاتی ہے بلکہ ان میں فنی خوبصورتی بھی موجود ہے جو ان کی شاعری کو یادگار بناتی ہے۔

عصمت چغتائی کی ناول نگاری

ڈاکٹر عبدالرشید منہاس
شعبۂ اُردو جموں یونیورسٹی، جموں

عصمت نے جب اپنی ادبی زندگی کا آغاز کیا تب ترقی پسند تحریک اپنے عروج پر تھی۔ اسی دوران اور اسی سے چند سال قبل اردو ادب میں کئی اہم اور نتیجہ خیز تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں۔ رومانیت آہستہ آہستہ کم ہوتی جا رہی تھی اور حقیقت نگاری کا رجحان بڑھ رہا تھا۔ جدید تعلیم اور بالخصوص مغرب کے زیر اثر ادیبوں میں اب زندگی پر غور و فکر کرنے کا حوصلہ بڑھ رہا تھا اس کا اظہار ''انگارے'' میں سامنے آیا۔ ''انگارے'' میں دس کہانیاں شامل تھیں ان کہانیوں میں ایسے موضوعات شامل تھے جن پر قلم اٹھانا غیر اخلاقی اور غیر ادبی تصور کیا جاتا تھا۔ ان کہانیوں میں دولت کی غلط تقسیم، جھوٹی مذہبیت، نفسیاتی اور جنسی الجھنیں جیسے موضوعات شامل تھے۔ ان کہانیوں میں کئی گھناؤنے موضوعات پیش کیے تھے جو اس زمانے میں ہندوستانی سماج میں پائے جاتے تھے۔ خلیل الرحمن اعظمی یوں رقم طراز ہیں:

> ''جھوٹی مذہبیت، ریاکاری، تہذیب و شائستگی کا سوانگ وطن پرستی اور توم پرستی کے ڈھونگے ان سب پر ''انگارے'' کے مصنفین نے اپنے طنز کے تیر برسائے۔''[۱]

اس طرح سماج میں اس طرح کی کہانیاں مقبولیت حاصل نہ کر سکیں۔ ''انگارے'' میں شائع ہونے والی ان کہانیوں کی سخت مخالفت ہوئی انگارے کو ضبط کر لیا گیا اس سے ''انگارے'' کی شہرت میں مزید اضافہ ہوا۔ اگر چہ یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ انگارے فنی نقطہ نظر سے کوئی اہم کارنامہ نہیں تھا لیکن ''انگارے'' کی کہانیوں کے موضوعات اور اظہار کی بے باکی نے نئے ادیبوں کے لیے راہیں ہموار کر دیں خلیل الرحمن اعظمی لکھتے ہیں:

> ''یہ سارے افسانے خام ہیں لیکن ان کی اہمیت کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ پہلی بار ہمارے افسانہ نگاروں نے اس بند کو توڑنے کی کوشش کی جس کی وجہ سے سماج کے بہت سے اہم اور پیچیدہ مسائل ابھی تک فن کے حدود میں داخل نہیں ہوئے تھے یا عرض ممنوعہ قرار دیے جاتے تھے۔''[۲]

''انگارے'' کی اشاعت کے چند سالوں بعد ترقی پسند تحریک کا آغاز باقاعدہ طور پر ایک مینی فیسٹو کے طور پر عمل میں آیا۔ ترقی پسند تحریک کے دور میں حقیقت نگاری کو کافی فروغ ملا چونکہ حقیقت نگاری ترقی پسند تحریک سے قبل ہی ادب کا حصہ رہی تھی۔ نذیر احمد، راشد الخیری اور اولین ناول نگاروں کے یہاں حقیقت نگاری کا رجحان نظر آتا ہے۔ ان ناول نگاروں کے ساتھ ساتھ اولین خواتین ناول نگاروں کے ہاں بھی حقیقت نگاری کا رجحان ملتا ہے اس طرح ترقی پسند حقیقت نگاری نے زندگی کم اصل رنگ میں پیش کیا۔ ادھر مارکسی تحریک نے سرمایہ دار طبقے کے خلاف آواز بلند کی۔ جدید تعلیم اور مغربی تہذیب کے اثر سے نئی نسل اور نوجوانوں میں بالخصوص جھوٹی مذہبیت اور اخلاق پر بندشوں سے آزادی حاصل کرنے کا رجحان بڑھنے لگا اس جدید تعلیم اور مغربی اثرات سے علم نفسیات میں نوجوان نسل دلچسپی لینے لگی اس طرح ادب میں ایک نیا اور اہم موضوع جنس داخل ہوا۔ اس جنسی حقیقت نگاری کے لیے راستے ہموار ہوئے اس طرح اس جنسی حقیقت پر سب سے پہلے جو اہم نام ادب میں ہمارے سامنے آتے ہیں ان میں سعادت حسن منٹو، محمد حسن عسکری اور عصمت چغتائی اہمیت کے حامل ہیں۔

منٹو اور عصمت کی کہانیاں جنسی حقیقت نگاری کی بہترین مثالیں ہیں ان کی زیادہ تر کہانیوں کا موضوع جنس ہے۔ ان دونوں افسانہ نگاروں نے جنسی حقیقت نگاری کو اس قدر بے باکی کے ساتھ پیش کیا کہ دونوں پر بعد میں مقدمہ چلا اور سرکاری مقدم دائر ہو گیا اور انہیں عدالت میں پیش ہونا پڑا۔ عصمت کی کہانیوں کا موضوع زیادہ تر متوسط مسلم گھرانے کی لڑکیوں کی جنسی خواہشات ہے جسے جنسی زندگی بھی کہا جا سکتا ہے۔ عصمت نے علم نفسیات کا گہرا مطالعہ کیا اور جنسی زندگی کا مطالعہ و مشاہدہ بھی کیا۔ نوجوان لڑکیوں کی زندگی کو گرل ہاسٹل میں رہ کر قریب سے دیکھا جنسی زندگی کا بھرپور نقشہ عصمت کی کہانیوں میں کھینچا گیا ہے۔ عصمت نے اپنے گھریلو ماحول سے بہت کچھ مواد حاصل کیا جو ان کی کہانیوں کا بعد میں موضوع بنا۔ افسانوں کے علاوہ عصمت نے ناول نگاری میں کمال حاصل کیا۔ ''ضدی''، ''ٹیڑی لکیر''، ''معصومہ''، ''سودائی''، ''عجیب آدمی''، ''دل کی دنیا''، ''ایک قطرہ خون'' وغیرہ ان کے بہترین ناول ہیں۔

''ضدی'' عصمت کا پہلا ناول ہے یہ ناول 1941 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک فلمی انداز میں رومانی کہانی ہے جس میں محبت کی روایتی داستان کو پیش کیا گیا ہے۔ اس کہانی کا ہیرو ''پورن'' ہے جو ایک امیر طبقے سے تعلق رکھتا ہے جبکہ اس ناول کی ہیروئن ''آشا'' نام کی لڑکی ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتی ہے۔ ان دونوں کی محبت کی داستان موت کے المیہ پر ختم ہوتی ہے اس ناول کی کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ خود عصمت نے اپنے اس ناول پر یوں اظہار خیال پیش کیا ہے وہ کہتی ہیں کہ:

''اس ناول میں کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ وہ ناول میں نے چار پانچ لڑکیوں کے ساتھ مل کر لکھا تھا۔ پہلے نوٹس لکھے انہیں ڈسکس کیا ہم اس زمانے میں ''اپنا کرینیا'' ''دیوداس'' اور ایک کتاب سے متاثر ہوئے تھے۔ سوچا الاؤ فلم کے لیے ایک کہانی لکھیں اور پیسہ کمائیں۔ ہم پانچ لڑکیوں نے جن میں میری دوست اور کزن شامل تھی وہ کہانیاں بنائی اور محسن عبداللہ کو جو اس زمانے میں بمبئی ٹائرز میں نوکر تھے روانہ کر دی انہیں کہانی ناپسند ہوئی۔ تب ہم نے شاہد احمد دہلوی کو لکھا۔ انہوں نے کہانی کو ناول کی شکل میں لکھنے کا مشورہ دیا۔ چنانچہ میں نے تین چار دن کے اندر اسے ناول کی شکل میں لکھنے کا مشورہ دیا جس میں جملہ حقوق کے عوض مجھے سو روپے ملے جو ہم پانچ لڑکیوں نے آپس میں بانٹ لیے بیس روپے ہاتھ آئے جو اس زمانے میں بہت تھے۔ ہم خوش تھے کہ ہم نے سو روپے میں اپنی کتاب بیچی۔''۳؎

''ضدی'' کے بعد عصمت چغتائی کا دوسرا ناول ''ٹیڑی لکیر'' منظر عام پر آیا۔ اس ناول کے بارے میں عام رائے یہ ہے کہ عصمت کا یہ ناول ایک نفسیاتی ناول ہے۔ جس میں شمن کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے یعنی اس ناول میں شمن کی نفسیات کو پیش کیا گیا ہے۔ جو بچپن سے ہی کج روی کا شکار ہے۔ اس کی پرورش ایسے گھر میں ہوئی جہاں سے اس کی زندگی کے ٹیڑھا پن آتا ہے۔ اس ناول پر عصمت نے یوں اظہار خیال کیا ہے وہ کہتی ہیں:

''شمن کی کہانی کسی ایک لڑکی کی کہانی نہیں ہے یہ ہزاروں لڑکیوں کی کہانی ہے جب وہ پابندیوں اور آزادی کے بیچ ایک خلا میں لٹک رہی ہیں۔''۴؎

اس ناول میں عصمت نے شمن کی نفسیاتی الجھنوں کے ساتھ ساتھ ہی اس کے داخلی زندگی کو بھی بھرپور انداز میں پیش کیا ہے اور شمن زندگی کا ایک بہترین اشعارہ بن کر ہمارے سامنے آئی ہے۔ اس ناول پر نیلم فرزانہ یوں رقم طراز ہیں:

''عصمت شمن کے کردار کا نفسیاتی تجربہ کرتے ہوئے اس کی داخلی زندگی کو گرفت میں لیتی ہیں اور شمن اپنی مخصوص خصوصیات کی بنا پر ایک منفرد کردار بن کر ابھرتی ہے، معاشرہ جزوی حیثیت سے سامنے آتا ہے لہذا ہم اس ناول کو خالص نفسیاتی ناول نہیں کہہ سکتے جس ماحول میں شمن کی نفسیات پروان چڑھی ہے۔ اس کا اس کے مخصوص مزاج کی تشکیل میں اہم حصہ ہے۔ اس لیے اسے صرف نفسیاتی نہ کہہ کر سماجی نفسیاتی (Socio Psychology) ناول کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔''۵؎

''ٹیڑی لکیر'' میں شمن کے علاوہ بھی کہیں کردار ہے جن کی نفسیاتی زندگی کو عصمت میں بڑے فنکارانہ انداز میں اس ناول میں پیش کیا ہے۔

''ٹیڑی لکیر'' کے بعد ''معصومہ'' 1961ء منظر عام پر آیا۔ اس ناول میں بمبئی کے ماحول کو پیش کیا گیا ہے جس میں فلم انڈسٹری اور سیٹھ ساہوکاروں کی زندگی کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے اور ہم بمبئی کی زندگی اور وہاں کے ماحول سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ معصومہ کے کردار کا سہارا لے کر بمبئی کے ماحول کو بڑے موثر انداز میں اس ناول میں پیش کیا ہے۔ عصمت نے بمبئی آنے کے بعد وہاں کے ماحول سے متاثر ہو کر یہ ناول لکھا۔ اس ناول کے بارے میں عصمت خود یوں رقم طراز ہیں:

''یہاں بمبئی آنے کے بعد کمیونسٹ پارٹی سے میرا واسطہ پڑا اور مجھے سیاست اور اکونومکس کا بھی تجربہ ہوا۔ پتہ چلا کہ سیکس اور اس کی گھٹن ہی اتنا اہم موضوع نہیں ہے بلکہ بہت سے اور موضوع ہیں اور پھر ان میں ان موضوعات کو چھونے کی کوشش کی۔ بمبئی کے ماحول کو پیش کیا۔ میرا ایک ناول ''معصومہ'' بمبئی کے ماحول پر لکھی گئی ہے۔''۶؎

''معصومہ'' کے بعد ''سودائی'' 1964 میں منظر عام پر آیا۔ یہ ایک کمرشل ناول ہے اس پر فلم بھی بنائی گئی جسے پہلے ''بزدل'' کے نام سے فلمایا جا چکا ہے۔ اس ناول کی کہانی اور اس کی پیشکش کا انداز بھی فلمی ہے۔ سورج اس ناول کا مرکزی کردار ہے جس پر اس ناول کی پوری کہانی کا تانا بانا تیار کیا گیا ہے۔

''سودائی'' کے بعد ''عجیب آدمی'' فلمی دنیا کے متعلق ہے اس ناول میں ایک کردار دھرم دیو کے ذریعے پوری فلمیں دنیا کے ماحول اور وہاں کے کام کاج ،طریقہ کار کو سامنے لایا گیا ہے۔

سودائی کے بعد ''دل کی دنیا'' منظر عام پر آیا۔ یہ ایک سماجی ناولٹ ہے جس میں عصمت نے اس دور کے خاندان اور معاشرے میں پائے جانے والے فرسودہ رسم ورواج کو ایک لڑکی کے کردار کے ذریعے پیش کیا ہے جو اپنے شوہر کی بدسلوک کی کا شکار ہے جو اس پر نگاہ کرم نہیں بلکہ برا سلوک کرتا رہتا ہے۔ قدسیہ بیگم اس کا مرکزی کردار ہے جس پر ناول کی کہانی کی بنیاد رکھی گئی ہے۔ ناول کی یہ ہیروئن قدسیہ بیگم ذہنی توازن کا شکار رہتی ہے جسے ناول نگار نے بڑے موثر انداز میں اس ناول میں پیش کیا ہے۔

اس کے بعد ''ایک قطرہ خون'' 1976 میں منظر عام پر آیا۔ باقی تمام ناولوں سے ہٹ کر ایک نئے موضوع پر عصمت نے قلم اٹھایا جسے ادب میں تاریخی ناول کے نام سے جانا جاتا ہے۔ ایک قطرہ خون کا موضوع وقعات کربلا ہے جو اسلامی

تاریخ میں ایک اہم حادثہ مانا جاتا ہے۔ تاریخی ناول لکھنے کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ تاریخی ناول نگار ماضی کے کسی بڑے واقع ہو یا پھر ماضی کے ایک پورے دور کو نئے سرے سے قارین کے سامنے پیش کردے تا کہ قارین اپنے اسلاف کے کارناموں سے واقفیت حاصل کرسکے یا کوئی درس سیکھ سکیں۔ دوسرا یہ کہ تاریخی ناول میں تاریخی ناول نگار اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، تہذیبی صورتحال کو واضح کرنے کے لیے ماضی کے تاریخی وقات کو پیش کرے۔

جوناتھن نیلڈ (Jonathan Nield) نے تاریخی ناولوں کے بارے میں یوں کہا ہے وہ کہتا ہے:

> ''ایک ناول تاریخی اس وقت ہوسکتا ہے جبکہ اس میں ایسی تاریخی شخصیتیں اور واقعات شامل کیے جائیں جن کی شناخت باسانی ہوسکتی ہو۔''۷

اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ عصمت چغتائی نے اردو ادب کے لیے کئی ناول اور ناولٹ لکھے لیکن ان تمام ناولوں میں ''ٹیڑی لکیر'' ان کا اہم ناول ہے جسے ان کے فن کا نقطہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ ان کے نالوں کی زبان بڑی اہمیت رکھتی ہے۔ عصمت ایک مخصوص زبان کا استعمال اپنے ناول اور افسانوں میں کرتیں ہیں۔ ان کی ناولوں کی زبان پر ظ۔ انصاری نے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح سے کیا ہے: ''انہیں لکھنا آتا ہے، افسانہ بنانا آتا ہے چکیلی دھاردار زبان آتی ہے۔ نشتر چھبونا آتا ہے اور یہ سارے ہنر وہ اپنے مشاہدے اور مطالعے کی محدود دنیا میں خوب دکھا چکی ہیں۔ ان کا ادبی کیریئر یہی سے شروع ہوا ہے اور یہیں سے انجام کو پہنچتا ہے۔''۸

اس کے علاوہ عصمت کے مختصر ناولوں میں ''عجیب آدمی''، ''جنگلی کبوتر'' اور ''باندی'' وغیرہ بھی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ تینوں 1970 میں منظر عام پر آئے۔ ان میں شہر کی زندگی اور فلمیں اسٹار کی زندگی کو موضوع بنایا گیا ہے اور عورت کے استحصال کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ کہا جاسکتا ہے کہ عصمت نے اپنے ادبی سفر میں چھ طویل اور چار مختصر ناول تحریر کیے جن کا میں اظہار کر چکا ہوں۔ ان کے ناولوں میں زندگی کی مختلف رنگا رنگیاں پائی جاتی ہیں۔ کئی طرح کی ذہنی الجھنیں ہیں جو عورت کو بالخصوص جکڑے ہوئے ہیں جن سے وہ روز بروز دوچار ہورہی ہے۔ ان کی ناول نگاری پر پروفیسر سیما صغیر نے یوں اظہار خیال پیش کیا ہے وہ کہتی ہیں:

''عصمت کے ناولوں کے مطالعے سے جو منظر نامہ ابھرتا ہے وہ یہ کہ ان کے یہاں فضا اور ماحول خاص اہمیت رکھتے ہیں قصہ کہانی ضمنی حیثیت اختیار کرلیتے ہیں وہ فضا و ماحول کی صورتحال کے مطابق کردار خلق کرتی ہیں۔ حقیقی فعال کردار سیاہ و سفید رنگوں کی امیزش سے مزین مثلاً ثمن کے کردار کے مطالعے میں بچپن سے بڑھاپے تک کے تمام حرکتوں کو گہری نظر سے دیکھتے ہوئے اس حقیقت کو اجاگر کیا گیا ہے کہ گھریلو زندگی کی نفسیات اور ماحول کے اثرات کردار سازی کی بنیاد ہیں۔''۹

عصمت نے جن موضوع پر بھی لکھا کھل کر لکھا چاہے وہ توہمات ہو یا تعصّبات، حسد ہو، جنس ہو یا تنگ نظری ہو تمام مسائل کو سامنے لانے کی بھر پور کوشش کی ہے اور وہ اس میں کئی حد تک کامیاب نظر آتی ہیں۔ بالخصوص عصمت نے جس طرح سے نسوانی کرب کو اپنے ناولوں میں پیش کیا ہے کوئی دوسرا ناول نگار یہاں تک رسائی حاصل نہیں کرسکتا۔

حواشی

۱۔ خلیل الرحمن اعظمی، اردو میں ترقی پسند ادبی تحریک، ص ۱۸۰
۲۔ ایضاً، ص ۱۸۱۔
۳۔ نیلم فرزانہ، بحوالہ اردو ادب کی اہم خواتین ناول نگار، ص ۸۱۔
۴۔ ایضاً، ص ۸۲۔
۵۔ ایضاً، ص ۸۳۔
۶۔ ایضاً، ص ۹۶۔
۷۔ ڈاکٹر سمیع الزماں، اردو ادب میں تاریخی ناول کا ارتقاء، ص ۳۵
۸۔ ظ۔ انصاری، کتاب شناسی، ص ۲۳۶
۹۔ پروفیسر سیما صغیر، تانیثیت اور اردو ادب، ص ۸۹

اقبال کے والد شیخ نور محمد، کشمیر کے سپرو برہمنوں کی نسل سے تھے۔ غازی اورنگ زیب عالمگیر کے عہد میں ان کے ایک جد امجد نے اسلام قبول کیا۔ اقبال کے آباء واجداد اٹھارویں صدی کے آخر یا انیسویں صدی کے اوائل میں کشمیر سے ہجرت کر کے سیالکوٹ آئے اور محلہ کھیتیاں میں آباد ہوئے۔ بزرگوں نے کشمیر چھوڑا تو سیالکوٹ میں آ بسے۔ شیخ نور محمد کے والد شیخ محمد رفیق نے محلہ کھٹیکاں میں ایک مکان آباد کیا۔ کشمیری لوئیوں اور دُھسّوں کی فروخت کا کاروبار شروع کیا۔ اقبال کے والد اور ان کے چھوٹے بھائی شیخ غلام محمد یہیں پیدا ہوئے، پلے بڑھے۔ بعد میں سیج رام سپرو بازار چوڑیگراں میں اُٹھ آئے جواب اقبال بازار کہلاتا ہے۔ ایک چھوٹا سا مکان لے کر اس میں رہنے لگے اور مرتے دم تک یہیں رہے۔ اقبال کے دادا سیج رام سپرو کی وفات کے بعد شیخ نُور محمد نے اس سے ملحق ایک دومنزلہ مکان اور دو دکانیں خرید کر مکانیت کو بڑھالیا۔

علی بن احمد محتشم کاشانی اور میر ببر علی انیس

کی شاعری کا تقابلی مطالعہ

سلیمان زارع (ایران)

با نام حسین گر سخن آغاز شود
مہرش زدل سوختہ ابراز شود

یعنی: حسین کے نام سے جب بات شروع ہوجائے ان کی محبت ہر غمزدہ اور غمناک دل میں بھی ظاہر ہوجائے گی۔

میری مادر زبان ترکی ہونے کی وجہ سے ہوسکتا ہے میرے بیان اور میری لکھائی میں غلطیاں نظر آئے اور کچھ ہو تو اس لیے آپ سے معافی مانگتا ہوں اور اپنی باتون کو علامہ اقبال کے شعر سے شروع کر رہا ہوں جو فرماتے ہیں:

انداز بیان گر چہ بہت شوخ نہیں ہے
شاید کہ اتر جائے تیرے دل میں میری بات

جب فارسی وارد و شعراء کی شاعری کے بارے میں مطالعہ کرتے رہتے ہیں نہ صرف محتشم کاشانی اور انیس کے اشعار میں مماثلت اور یکسانیت ملتے ہیں بلکہ دوسرے شعرا جیسے حافظ شیرازی اور غالب دہلوی، امیر خسرو دہلوی اور سعدی، حافظ شیرازی اور خواجہ میر درد وغیرے کے اشعار میں بھی یکسانیت ملتے ہیں۔ مثال کے طور پر تصوف کے بارے میں حافظ کا شعر ہے:

آسمان بار امانت نتوانست کشید
قرعہ فال بہ نام من دیوانہ زدند

(دیوان حافظ، غزل 189)

یعنی: آسمان امانت کا بوجھ نہ اٹھا سکا/ مجھے دیوانے کے نام پر، انہوں نے فال کا قرعہ نکال دیا۔

یہی بات کو غالب اس طرح بیان کرتے ہیں:

گرنی تھی ہم پہ برق تجلّی نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ ظرف قدح خوار دیکھ کر

(غالب)

خواجہ میر درد بھی اس بارے کہتے ہیں:

ارض وسما کہاں تری وسعت کو پا سکے
میرا ہی دل ہے کہ جہاں تو سما سکے

(خواجہ میر درد)

ریا کار واعظ کے بارے میں غالب اور حافظ شیرازی کی مشترک بات یہ ہے:

کہاں مے خانہ کا دروازہ غالبؔ اور کہاں واعظ
پھر اتنا جانتے ہیں کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

(غالب)

حافظ شیرازی بھی اس طرح کہتے:

واعظان کاین جلوہ در محراب و منبر می کنند
چون بہ خلوت می روند آن کار دیگر می کنند

(دیوان حافظ، غزل 199)

یعنی: یہ واعظ حضرات جو کہ محراب اور منبر پر جلوہ گری کرتے ہیں جب تنہائی میں جاتے ہیں تو کچھ اور کام کرتے ہیں۔

(منہ میں رام رام بغل میں چھری)

ایران کے معروف اور مشور مرثیہ گو علی ابن محتشم کاشانی صفویہ دور میں صف اول کے شعراء میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ 1528ء کاشان میں پیدا ہوئے اور 1588ء وہی کاشان میں وفات پائی۔ وہ شاہ طہماسب کے دربار سے وابستہ رہے۔ شاہ طہماسب محتشم سے ہمیشہ اچھا سلوک کرتا تھا اور بہت مہربانی سے پیش آتا تھا۔ محتشم کاشانی نے جو مراثی لکھے ہیں ان میں لوازم مرثیہ گوئی بدرجہ اتم پائے جاتے ہیں ہے۔ ان کے سب سے زیادہ دلچسپ مرثیہ محرم کی آمد کے بارے میں ہے جو کہتے ہیں:

باز این چہ شورش است کہ در خلق عالم است
باز این چہ نوحہ و چہ عزا و چہ ماتم است

یعنی (پھر یہ کیا شور وغل ہے جو اہل عالم کے درمیان ہے؟ پھر یہ کیا نوحہ اور کیا عزا اور کیا ماتم ہے؟

باز این چہ رستخیز عظیم است کز زمین
بی نفخ صور خاستہ تا عرش اعظم است

یعنی (پھر اہل زمین کے درمیان یہ کیا اعظیم رستاخیز ہے جو نفخ صور اسرافیل کے بے غیر عرش اعظم تک اس کی آواز آتی ے)

گر خوانمش قیامت دنیا بعید نیست
این رستخیز عام کہ نامش محرم است

یعنی (اگر اس کا نام قیامت بتاؤں بے جا نہیں اس رستاخیز کو جو اس کا نام محرم ہے۔

محمد قلی قطب شاہ (1565/1612) جو سلطنت قطب شاہی کے پانچویں سلطان تھے محتشم کاشانی کی زمین میں اپنے فارسی مرثیہ میں محرم کی آمد کو اس طرح بیان کرتے ہیں:

بازاین چہ ماتم است کہ پشت جہان شکست
صد تیر آہ در جگر آسمان نشست

یعنی (پھر یہ کیا ماتم ہے جو دنیا کی پشت اور کمر اس کی وجہ سے ٹوٹ گئی اور صد تیر آہ آسمان کے جگر میں لگ گئی۔

بازاین چہ ماتم است کہ از جوش العطش
خوناب گریہ در گلوی تشنگان نشست

یعنی (پھر یہ کیا ماتم ہے جو العطش کے جوش سے پیاسے والے کے گلے میں رونے کی شدت سے خوناب ہے۔

محرم کی آمد کے بارے میں انیس کا شعر ہے:

اے یارو محرم کا مہینہ آیا
سر پیٹو غم شاہ مدینہ آیا
کیا بیٹھے ہو سر پر خاک اڑاؤ لوگو
احمد کا تباہی میں سفینہ آیا
اے اہل عزا عزا کا دن آپہونچے
غم کی راتیں بکا کے دن آپہونچے
فریاد کہ فاطمہ کی بستی اجڑی
آبادی کربلا کے دن آپہونچے

محتشم کاشانی اور انیس کے اشعار میں مشترک رزم نگاری بھی موجود ہے:
محتشم کاشانی امام حسین کی تلوار کو اس طرح مدح کرتے ہیں:

تیغت اگر رسد بہ زمین سازدش دو نیم
دار دنشان ضربت شمشیر بوتراب

(یعنی: اے حسین اگر آپ کی تلوار کرہ ارض پر لگ جائے اس کو دو ٹکرا کرے گی/ کیونکہ آپ کے ضرب لگانے میں بوتراب کا نشانہ اور مضبوطی ہے۔

درر زم از ہزار چہ رستم عجب بود
کارند در مقابل یک حملہ تو تاب

(یعنی: لڑائی ور زم میں اگر ایک ہزار رستم آپ کے مقابل اور سامنے ہو ان میں سے ایک بھی تاب نہیں لائے گا۔

میر انیس بھی امام حسین کی تلوار کو اس طرح مدح کرتے ہیں:

جو صف تیغ شاہ آجاتی تھی
اڑ جاتے تھے سر، شکست پا جاتی تھی
مشہور ہے تلوار کو کھا جاتا زنگ
وہ تیغ تو مورچہ کو کھا جاتی تھی

محتشم کاشانی اور انیس کے اشعار میں امام حسین (ع) کے سینے پر گھوڑے دوڑانے کے بارے میں مشترک بیان:
اس بارے میں محتشم کا شعر ہے:

این سرور، سینہ زہراست کز ستم
سینہ پر علمش از ہر سو لگد کوب بلاست

یعنی: امام حسین کے سینے کے اوپر جو دشمن گھوڑے دوڑاتے ہیں حضور (صلی اللہ علیہ والہ وسلم) کی بیٹی زہرا کے سینے کی طرح ہے۔ انیس بھی اس بارے میں کہتے ہیں:

گھوڑے دوڑاہ چاندسی سینوں پر
سبزے کی طرح گلوں کو پامال کیا

اصحاب امام حسین (ع) کی عطشانی کے بارے میں بھی محتشم کاشانی اور انیس کے اشعار میں مشترک شعر ہے؛:
محتشم کا کہنا ہے:

بودند دیو ودد ہمہ سیراب و می مکید
خاتم زقحط آب سلیمان کربلا

(یعنی: دیو ودد سب نے پانی پیا لیکن سلیمان کربلا نے عطشانی کی شدت سے اپنی انگھوٹی کو اپنے ہونٹ پر رکھا تھا۔

زان تشنگان نوز بہ آسمان میرسد
فریاد العطش ز بیابان کربلا

یعنی: وہ کربلا والے کی عطشانی کی آواز ابھی تک آسمان تک ے بیابان کربلا سے۔
انیس کا کہنا ہے:

اعداء نے پیا بید اور باطیا پانی
لشکر نے حسین کے نہ پایا پانی
بازو بھی کٹائے بازوی میر ورنے
اس پر بھی مگر ہاتھ نہ آیا پانی

محتشم کاشانی کے اشعار میں ایک بیت کا شعر ہے جب اس بیت کو پڑھتے ہیں تو دبیر کا شعر یاد آتا ہے جو کہتے ہیں:
محتشم کاشانی کا شعر ہے:

خواہی کہ پائی بندي اگر جبرئیل را
دست فرشتگان شود از حکم رشتہ تاب

دبیر کا شعر ہے:

شمشیر بہ کف دیکھ کر حیدر کے پسر کو
جبرائیل لرزتے ہیں سمیٹے ہوئے پر کو

سرسید کو پاکستان اور بھارتی مسلمانوں میں ایک موثر شخصیت کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور اکثر دوقومی نظریہ کا بانی تصور کیا جاتا ہے۔ کچھ لوگ اس سے اختلاف کرتے ہیں اور تاریخی بددیانتی کرتے ہوئے دوقومی نظریے کو سترہویں صدی کے غیر اہم کردار حضرت مجدد الف ثانی کے سر منڈھ دیتے ہیں۔ جس کا کوئی ٹھوس علمی ثبوت موجود نہیں ہے بلکہ اثر اور متاثر کی اتنی نسبت ہے جتنی کہ سکندر اعظم اور نپولین میں موجود ہوسکتی ہے۔ سرسید کی اسلام کو سائنس اور جدیدیت کے ساتھ ہم آہنگ بنانے کے لیے عقلیت پسند (معتزلہ) روایت کی وکالت نے عالمی طور پر اسلامی اصلاح پسندی کو متاثر کیا اور ناقابل تلافی نقصان دیا۔

محقق ایک شخص یا فرد ہے جو علمی یا عقائدی تحقیق کرتا ہے۔ محقق عموماً مخصوص موضوع یا مسئلے کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لیے مواقعت رکھتا ہے۔ اس کی تعریف کے مختلف پہلوؤں میں شامل ہوسکتے ہیں: وہ تحقیقاتی تربیت یا تعلیم حاصل کرنے والا شخص، جس کا مقصد نئی معلومات حاصل کرنا ہو، اور جو عموماً اپنی تحقیقات کو اطلاعاتی منبعوں، تجربے اور دوسرے محققین کی رائے سے پیش کرتا ہے۔

ابوالخیر کشفی (۱۹۲۵-۲۰۱۰ء) ایک معروف اردو شاعر اور تحقیق کار تھے۔ ان کا حقیقی نام محمد اختر الدین تھا لیکن وہ اپنے پین نام سے معروف ہوئے۔
ابوالخیر کشفی نے اردو ادب کے مختلف شعبوں میں اپنی خدمات پیش کیں ہیں۔ وہ اردو شاعری کے علاوہ، تاریخ، فلسفہ، اور عرفانیات پر بھی تحقیقات کیں۔ ان کی شاعری اور تحقیقاتی کتب میں غزل، نظم، مرثیہ، مرثیہ، اردو قصے اور ڈراموں پر تحقیقات شامل ہیں۔

اردو ایک نسبتاً نئی زبان ہے اور اس کے اکثر مسائل کا تعلق اس کی نوعمری سے ہے۔ گذشتہ چند صدیوں میں ہونے والی علمی، فکری اور ادبی ترقیوں کے باوجود اکثر لسانی پہلوؤں سے گیسوئے اردو ابھی منت پذیر شانہ ہے۔ املا انھی میں سے ایک ہے۔ اردو الفاظ کے لکھنے کے طریقے تاریخی طور پر کم وبیش اتنے ہی متنوع رہے ہیں جتنی وہ زبانیں جن سے یہ الفاظ آئے ہیں۔ تاہم یہ امر اہلِ نظر کے لیے نہایت اطمینان کا باعث ہے کہ علمائے اردو نے نہ صرف اردو کے ایک معیاری املا کی تشکیل کی ضرورت کو محسوس کیا ہے بلکہ حالیہ کچھ عرصے میں اس سلسلے میں نہایت قابلِ تحسین کاوشیں بھی کی ہیں۔

ساحر لدھیانوی: اپنے افکار کے دریچے سے

ڈاکٹر شبانہ نسرین
ایسوسی ایٹ پروفیسر، صدر شعبہ اردو، لیڈی برابورن کالج، کولکاتا

ساحر کی شاعری روح عصر اور آفاقی صداقتوں کی ترجمان ہے۔ ان کی شاعری میں اخلاص مندی اور سوز وگداز کے چراغ جلتے ہیں۔ انہوں نے انسانی نسل کی عظمت، انسانی زندگی کی جدوجہد اور سعی و پرکار کے تقدس کے آستانوں پر عقیدت کے سجدے نذر کئے ہیں۔ اپنے بارے میں ساحر کیا کہتے ہیں ملاحظہ فرمائیں:

لے دے کے اپنے پاس فقط اک نظر تو ہے
کیوں دیکھیں زندگی کو کسی کی نظر سے ہم
مانا کہ اس زمیں کو نہ گلزار کر سکے
کچھ خار کم تو کر گئے گزرے جدھر سے ہم

ساحر کی شاعری شعورِ ذات کے انکشاف کا نام ہے۔ ایک شور ہے، موج ہے، دل ہے، عشق ہے، صرصر حیات ہے، فکر کائنات ہے، آئینہ احساسات ہے، رنگ ونور کا سیلاب ہے۔ ان کے اسی تخلیقی شعور سے انہیں پائندگی اور دوام عطا کیا ہے۔ روح کو منور کر دینے والی شاعری، قلب کو مسحور کر دینے والی گرمی احساسات، رومانیت، بغاوت، اشتراکیت، اجتماعیت، سرمایہ، محنت، جذباتیت، ضبط وحوصلہ، فکر وادای، سرشاری و نفسگی یہ تمام ساحر کی شاعری کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ کچھ اشعار دیکھیں جو اس حقیقت کے غماز ہیں:

خودداریوں کے خون کو ارزاں نہ کر سکے
ہم اپنے جوہروں کو نمایاں نہ کر سکے
کس درجہ دل شکن تھے محبت کے حادثے
ہم زندگی میں پھر کوئی ارماں نہ کر سکے
مایوسیوں نے چھین لئے دل کے ولولے
وہ بھی نشاط روح کا ساماں نہ کر سکے
فریب شوق کے رنگیں طلسم ٹوٹ گئے
حقیقتوں نے حوادث سے پھر جلا پائی
سکون وخواب کے پردے سرکتے جاتے ہیں
دماغ ودل میں ہے وحشت کی کارفرمائی

وہ تارے جن میں محبت کا نور تاباں تھا
وہ تارے ڈوب گئے لے کے رنگ و رعنائی

یہ اداسی و مایوسی اور یہ وحشت ساحر کے یہاں کہاں سے آئی تھی جس نے ان کی شاعری اور شخصیت دونوں میں ایک سوز و گداز، دردمندی اور گداختگی کی کیفیت پیدا کر دی تھی۔ کیا وجہ تھی کہ ان کے نغمہ طرب میں بھی کرب کے شعلے لپکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ ان تمام چیزوں کا سراغ ہمیں ان کی ذاتی زندگی اور ان کے عہد کے پس منظر میں لگانا ہوگا۔ ساحر کی پیدائش 8 / مارچ 1921ء میں لدھیانہ کے ایک معمولی اور جاگیردار خاندان میں ہوئی تھی۔ والد چودھری فضل محمد ایک بہت بڑے جاگیردار تھے جبکہ ان کی والدہ کا خاندان سماجی اور معاشی اعتبار سے ادنی حیثیت کا حامل تھا۔ والد فضل محمد اسشادی کو بے جوڑ خیال کر کے اسے پوشیدہ رکھنا چاہتے تھے اور اپنے رشتہ ازدواج کو سرعام لانے میں قباحت محسوس کرتے تھے۔ یہاں تک کہ والد اور والدہ کے درمیان آہستہ آہستہ تعلقات کشیدہ ہونے لگے اور انجام کار یہ رشتہ ہمیشہ ہمیشہ کیلئے منقطع ہو گیا۔ ساحر کی والدہ فضل محمد کی گیارہویں بیوی تھیں اور ساحر اکلوتی اولاد نرینہ تھے۔ والد سے قطع تعلق کے بعد ساحر نے ممتا کی چھاؤں میں پناہ لینے میں عافیت سمجھی لیکن باپ کی محبت و شفقت سے محروم ہو گئے۔ ایسی بات نہیں تھی پورانہ محبت نے جوش نہیں مارا تھا لیکن ساحر اس کے متحمل نہیں ہو سکے۔ بچپن کی یہ محرومی اور نا آسودگی کی ساری زندگی پر اثر انداز رہی۔ اس محرومی حیات نے ان میں ایک مستقل سوز و دردمندی کی کیفیت پیدا کر دی تھی جس نے ان کی شاعری کو بھی بے حد حساس اور پروقار بنا دیا تھا:

اپنے سینے سے لگائے ہوئے امید کی لاش
مدتوں زیست کو ناشاد کیا ہے میں نے
تو نے تو ایک ہی صدمے سے کیا تھا دوچار
دل کو ہر طرح سے برباد کیا ہے میں نے

ساحر کی پیدائش کا زمانہ پہلی جنگ عظیم کے بعد کا زمانہ ہے۔ اس کے بعد عہد شباب آیا جو دوسری جنگ عظیم اور پھر اس کے بعد 1947ء کا انقلاب آفریں عہد تھا جس کے دوش پر آرزوؤں اور امنگوں کے چراغ جل رہے تھے۔ ساحر بھی آزادی کے اس مبارک عہد کے استقبال میں پیش پیش تھے۔ تقسیم ہند کے بعد ساحر نے پاکستان کو خیر باد کہا اور بمبئی قسمت آزمانے کے لئے چلے آئے۔ بمبئی فلم انڈسٹری سے وابستہ کو ان کے گیت، غزلیں اور نظمیں جس طرح مقبول ہوئیں اس کا اندازہ شاید ساحر کو بھی نہیں تھا۔

ہم دیکھتے ہیں کہ 1930ء سے لے کر 1950ء تک کا عہد ہندوستان کا زبردست انقلابی اور ہنگامہ خیز دور رہا ہے۔ زندگی کی قدریں بدل رہی تھیں، بدیسی سامراج کے تابوت پر آخری کیل ٹھوکی جا رہی تھی۔ آرزوؤں کے چراغوں کی اولین روشنی میں انسانی آزادی اور معاشی خوشحالی کی ایک نئی مشعل فروزاں کی جا رہی تھی۔ ساحر دیکھ رہے تھے کہ ان کے ہم وطنوں اور شہیدوں کے خون سے نگار آزادی کے ماتھے پر سرخی بھری جا رہی تھی۔ ساحر نے ان ہنگاموں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور پھر ان انسانیت سوز ڈراموں کا کلائمکس بھی دیکھا۔ جب قوم پرستوں نے قوم دشمنی کا بیوپار شروع کر دیا تھا وہ دھندا جو کل تک سامراجیوں کے ہاتھوں میں تھا وہ ساحر کے ہم وطنوں کے ہاتھ آ گیا۔ مفاد پرستی اور اس سے پیدا ہونے والے رجحانات نے انسانیت کے شیرازے بکھیر دیئے۔ قومیت اور طبقاتیت نے آدمیت کو نگل لیا۔ آدمی آدمی سے ٹکرا گیا۔ تہذیب تمدن کے پردے میں انتہائی درجے کی وحشت و بربریت کا دور دورہ ہوا۔ اس صورتحال میں انسانی بقا و تحفظ کا خطرہ لاحق ہو گیا۔ اس کے سد باب کیلئے ساری دنیا میں ایک عالمی تحریک شروع ہوئی۔ جس کا اولین مقصد امن و امان کی بحالی تھا اور ظلم و ناانصافی کے خلاف عالمگیر سطح پر تمام انسانوں کو مورچہ سنبھالنا تھا۔ دنیا کے دیگر ممالک کے لیڈران اور سربراہوں کی سرپرستی میں ادبا و شعرا نے بھی اپنی تحریروں کے ذریعہ امن و محبت کے پیغام کو عام کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے باقاعدہ ترقی پسند تحریک کی بنیاد ڈالی گئی۔ اردو شعرا و ادبا بھی اس سے دور نہیں رہ سکے۔ ان انقلابی شاعروں میں فیض، جوش، مجاز، اختر الایمان، جان نثار اختر، کیفی اعظمی، مجروح سلطان پوری کے درمیان ساحر کا نام امتیازی حیثیت کا حامل ہے۔ انہوں نے طلوع اشتراکیت، شعاع فردا، جاگیر، اسی دوراہے پر، فنکار، فرار، مجھے سوچنے دے، گریز، میرے گیت وغیرہ وغیرہ لکھ کر ترقی پسند تحریک سے اپنی پوری وابستگی کا ثبوت پیش کر دیا۔ ترقی پسند تحریک کی بنیاد کا اہم مقصد یہی تھا کہ مکتبہ فکر، خیال، ہیئت اور اصول کے بدلتے ہوئے سانچے میں غم جاناں کی خلش اور غم دوراں کی ہمہ گیری کی شمولیت لازمی ہو۔ اردو شاعری میں یہ آواز 36ء سے گونجنے لگی۔ جب اس خطہ ارض میں بسنے والے کروڑوں انسان آزادی اور حریت کیلئے کمربستہ ہو گئے۔ تاریخ عصر کے اوراق اس تخلیقی شرر سے تھرا اٹھے۔ یہی وہ وقت تھا جب دوسری جنگ عظیم کے فتنے جاگ رہے تھے۔ معاشی نظام، غلامی، جہالت اور سامراجیت کی ماری ہوئی دنیا بیدار ہو رہی تھی۔ ویسے یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ شیریں رومانیت اور رسمی انقلاب کا ہنگامہ اس دور کے زیادہ تر شعرا کے یہاں ملے گا۔ لیکن کچھ ایسے فنکار ضرور تھے جن کی شعری اور ادبی کاوشوں کا نیا محل قدیم خیالات کے توانا اور صحت مند عناصر کی بنیاد پر قائم ہو رہا تھا۔ ساتھ ہی ان کے یہاں تفکر، احساس اور خلوص کی پرکاری کے ساتھ ساتھ فنکارانہ صلاحیتیں بھی بدرجہ اتم موجود تھیں۔ اس روشنی میں ہمیں چند ہی ایسے شعرا ملتے ہیں۔ ان میں سے ترقی پسند شاعر کی حیثیت سے فیض احمد فیض کی اولیت پر مہر لگ چکا تھا۔ فیض اردو شاعری میں

نئے رموز وعلائم، حسن تراکیب اور استعارہ سازی کے عمل کے ساتھ کلاسیکی لب ولہجہ کو بھی پروان چڑھا رہے تھے۔ ان کے یہاں دل سوزی اور رومانی سوگواری اس عوامی جذبے کی پیداوار تھی جس کی فضاؤں میں نامرادوں اور بے کسوں کی بھوکی روحیں تیر رہی تھیں۔ ساحر جو نہ صرف فیض کا ہم عصر شاعر تھا اس کا ہم نفس اور ہم نوا بھی تھا۔ عوامی احساسات سے ساحر کا سینہ لبریز تھا۔ جمہوریت اور اشتراکیت کا پجاری تھا۔ طبقاتی تقسیم کی ناہمواریاں ان کے شعور میں شور مچاتی رہیں۔ لیکن ساحر کے یہاں ایک چیز خصوصیت کے ساتھ نظر آتی ہے کہ جب بھی انہوں نے انقلاب اور بغاوت کے نغمے الاپے، جب بھی اجنبی راج کے ظلم کی چھاؤں میں سرفروشی کے خوابیدہ جذبے کو ابھارنے کی کوشش کی اس میں چیخ وپکار سنائی نہیں دی۔ ان کے یہاں نہ کوئی رسمی جوش وخروش نہ نعرہ بازی بلکہ مدھم آنچ سے کشید ہونے والا وہ تیز سیال مادہ جس کی قہر سامانی اور زہرناکی دھیرے دھیرے سرایت ضرور کرتی ہے مگر اس کے اثرات بہت دیر تک قائم رہتے ہیں۔ یہ متانت اور سنجیدگی بہت کم ترقی پسند شاعروں کے یہاں نظر آتی ہے۔ ساحر سرمایہ دارانہ جمہوریت کے ہمیشہ مخالف رہے۔ جہاں جہاں انسانیت مجروح ہوتی دکھائی دیتی ہے ان کا دل تڑپ اٹھتا ہے اور صفحہ قرطاس پر ایسے لازوال اشعار رقم کر جاتے ہیں جس میں رجائیت اور نشاطیہ لب ولہجہ بھی بھرپور نظر آتا ہے۔ کچھ اشعار دیکھیں:

تیرہ وتار فضاؤں میں ستم خوردہ بشر
اور کچھ دیر اجالے کے لئے ترسے گا
اور کچھ دیر اٹھے گا دل گیتی سے دھواں
اور کچھ دیر فضاؤں سے لہو برسے گا
اور پھر احمریں ہونٹوں کے تبسم کی طرح
رات کے چاک سے پھوٹے گی شعاعوں کی لکیر
اور جمہور کے بیدار تعاون کے طفیل
ختم ہو جائے گی انساں کے لہو کی تقطیر

ساحر نے ایک مفکر کی طرح تمام حالات کا جائزہ لیا تھا۔ ایک نقاد کی طرح اس پر تنقید کی تھی اور ایک مصلح کی طرح سماج کی اصلاح کیلئے اپنے اشعار سے کام لیا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد جب ہندو پاک فسادات کی آگ نے ذرے ذرے کو جھلسا دیا تھا ساحر بھی ایک حساس انسان کی طرح اس سے متاثر ہوئے۔ اس سلسلے میں انہوں نے جو شاعری کی وہ شاعری نہیں انسانیت کی مرثیہ سرائی ہے۔ ساحر کے نزدیک فساد اور جنگ ہمیشہ آگ وخون سے عبارت ہوتی ہے۔ یہ کسی ایک انسان کا خون نہیں تمام امن عالم کا خون ہے۔ انسانی بقا وتحفظ امن وانسانیت میں پوشیدہ ہے۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جس میں ساحر کا قلم امن وانسانیت سے سرشار نظر آتا ہے۔

خون اپنا ہو یا پرایا
ہو نسل آدم کا خون ہے آخر
جنگ مشرق ہو کہ مغرب میں
امن عالم کا خون ہے آخر
ہم گھروں پر گریں کہ سرحد پر
روح تعمیر زخم کھاتی ہے
جنگ تو خود ہی ایک مسئلہ ہے
جنگ مسئلوں کا حل کیا دے گی؟
آگ اور خون آج بخشے گی
بھوک اور احتجاج کل دے گی

اور پھر ساحر تمام عالم انسانیت کو امن اور سلامتی کا پیغام دیتے ہیں اور جنگ کی تیرہ وتاریکیوں کا ذکر کرتے ہیں۔

آؤ اس تیرہ بخت دنیا میں
فکر کی روشنی کو عام کریں
امن کو جس سے تقویت پہنچے
ایسی جنگوں کا اہتمام کریں
جنگ، وحشت سے بربریت سے
امن، تہذیب وارتقا کے لئے
جنگ، مرگ آفریں سیاست سے
امن، انسان کی بقا کے لئے
جنگ، افلاس اور غلامی سے
امن، بہتر نظام کی خاطر
جنگ، بھٹکی ہوئی قیادت سے
امن، بے بس عوام کی خاطر
جنگ، سرمائے کے تسلط سے
امن، جمہور کی خوشی کے لئے
جنگ، جنگوں کے فلسفے کے خلاف
امن، پرامن زندگی کے لئے

ساحر نے مذکورہ نظم "خون اپنا ہو یا پرایا ہو، میں جس پیرائے بیان میں امن وجنگ کی حقیقی تصویر پیش کی ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ اس تعلق سے ان کی دوسری نظمیں بھی

قابل ذکر ہیں جیسے میرے گیت، مجھے سونے دے، صبح نوروز، طرح نو طلوع اشتراکیت، بنگال، خودکشی سے پہلے، یہ کس کا لہو ہے، جاگیر، فنکار، میرے گیت تمہارے ہیں، لہو ندر دے رہی ہے حیات وغیرہ وغیرہ یہ وہ نظمیں ہیں جن میں ساحر نے ارتقائے انسانی، بقائے جمہوریت، انقلاب و بغاوت، جبر و تشدد اور نظام آتش و آہن کی باتیں کی ہیں۔ ان نظموں میں دھنگ رنگ نہیں آتشیں بگولے ہیں۔ اس کا اعتراف انہوں نے خود کیا ہے:

مرے جہاں میں سمن زار ڈھونڈنے والے
یہاں بہار نہیں، آتشیں بگولے ہیں
دھنگ کے رنگ نہیں سرمئی فضاؤں میں
افق سے تا بہ افق پھانسیوں کے جھولے ہیں

نظم "تاج محل ساحر کی بڑے ہی تلخ اور تیکھے لب ولہجہ والی نظم ہے جس میں تاج کی عظمت، اس کے جذبہ تعمیر اور ایک شہنشاہ کی الفت و محبت کے حریری اور دودھیا پیکر پر بڑے جارحانہ انداز میں طنز و نشتر کے تیر چلائے ہیں۔ تاج محل کی خوبصورت عمارت، اس کی منقش در و دیوار، اس کے محراب اور طاق، مقابر اور فصیلوں میں ساحر کو ایک مطلق العنان حکمران کی عظمت وقوت اور رعونت کی بازگشت سنائی دیتی ہے۔ محبت کا جذبہ بڑا ہی عظیم اور روحانی جذبہ ہے۔ دولت کے بل بوتے پر اس کی تشہیر کا سامان ساحر کے خیال میں تمام محبت کرنے والوں کے لئے ایک ناسور اور ساتھ ہی احساس کم مائیگی کی وجہ بھی بن جاتا ہے۔ اسی لئے جب ساحر اپنے محبوب سے کہتے ہیں کہ:

تاج تیرے لئے ایک مظہر الفت ہی سہی
تجھ کو اس وادی رنگیں سے عقیدت ہی سہی
میرے محبوب کہیں اور ملا کر مجھ سے

بلاشبہ ساحر کی یہ ظلم امارت و غربت کے درمیان صدیوں کی تفریق کی گواہی ہے۔ اس نظم کو پڑھ کر فکر تونسوی نے ساحر کو بڑی خوبصورت بات کہی تھی کہ تم نے تاج محل لکھی اور اپنی نظم کو اصل "تاج محل سے زیادہ شہرت بخشی۔ بلاشبہ اس جملے میں مبالغہ آرائی ہے لیکن اس مبالغہ میں بلاغت ضرور ہے۔

ساحر فطری طور پر جمہوریت اور اشتراکیت کا پجاری رہا ہے جو ہمیشہ انقلاب و بغاوت کے نغمے گاتا رہا۔ کیا واقعی اس نے رومانیت کے چمن زاروں میں سیر نہیں کی تھی، کیا جنون عشق کے نغمے اس نے نہیں چھیڑے تھے، حیات ساحر کا مطالعہ اس حقیقت کو عیاں کرتا ہے کہ ساحر نے بھی کسی کی خاطر محبت کے ایوان سجا رکھے تھے اور نہ جانے کتنی بے ربط تمناؤں کے مبہم خاکے اپنے خوابوں میں بسائے تھے۔ انہوں نے بھی کسی محبوب کے گیسو دعارض، اس کے پیراہن نکلیں اور ریٹی چیل کا سارا ھونڈا تھا لیکن پر اس وقت آیا کہ فیض کی طرح جس نے اپنے محبوب سے یہ کہتے ہوئے محبت سے یوں معذرت کر لی تھی کہ

اب بھی دلکش ہے تیرا حسن ہے مگر کیا کہیئے
اور بھی دکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلے کی محبت مرے محبوب نہ مانگ

ساحر بھی اسی طرح حالات کی ستم گری میں فیض کی ہمنوائی کا ثبوت دیتے ہیں اور محفل رنگ و نور کو خیر باد کہہ کر زندگی کی ایک نئی شاہراہ پر آگے بڑھ جاتے ہیں۔ کچھ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ساحر کے سوز و درد کی شدت اور انسانیت کا احساس عروج پر نظر آتا ہے:

میرے سرکش ترانوں کی حقیقت ہے تو اتنی ہے
جب میں دیکھتا ہوں بھوک کے مارے کسانوں کو
غریبوں، مفلسوں کو، بے کسوں کو، بے سہاروں کو
سسکتی نازنینوں کو تڑپتے نوجوانوں کو
حکومت کے تشدد کو امامت کے تکبر کو
تل دل تاب نشاط بزم عشرت لا نہیں سکتا
میں چاہوں بھی تو خواب اور ترا نے گا نہیں سکتا

اور اس کے بعد انہوں نے عہد کر لیا کہ:

آج سے میں اپنے گیتوں میں آتش پارے بھر دوں گا
مدھم پھیلی تانوں میں جوت دھارے بھر دوں گا
جیون کے اندھیارے پتھر پر مشعل لے کر نکلوں گا
دھرتی کے پھیلتے آنچل میں سرخ ستارے بھر دوں گا
آج سے اے مزدور کسانوں میرے گیت تمہارے ہیں
فاقہ کش انسانو! میرے سوبھاگ تمہارے ہیں
جب تک تم بھوکے ننگے ہو یہ شعلے خاموش نہ ہوں گے
جب تک بے آرام ہو تم یہ نغمے راحت کوش نہ ہوں گے

تلخیاں، آؤ کہ کوئی خواب بنے" ساحر کے وہ شعری مجموعے ہیں جن کی غزلوں اور نظموں میں ساحر کا غم ہے، ان کا اپنا تجزیہ ہے، محبت اور اس سے پیدا ہونے والی مختلف کیفیتیں ان کی شاعری میں یوں جھلکتی ہیں کہ ان کا غم سب کا غم بن جاتا ہے اور یہی احساس ان کی شاعری کو جاندار بنا دیتا ہے۔ ساحر نے عشق بھی کیا تھا اور اس کے زخم بھی کھائے تھے۔ ان کے دل کے تاروں کو یکے بعد دیگرے کئی حسیناؤں نے چھیڑنے

کی کوشش کی ممکن تھا کہ زندگی رشک گزار ہو جاتی لیکن نشاط اور شادمانی قسمت میں کم کم تھی وہ خود اس کا اعتراف کرتے ہیں:

چند کلیاں نشاط کی چن کر مدتوں محو یاس رہتا ہوں
تیرا ملنا خوشی کی بات سہی تجھ سے مل کر اداس رہتا ہوں

خوشی اور اداسی اسی طرح ہم سفر رہی۔ عشق کے راستے میں کبھی مذہب کی دیوار میں حائل ہوئیں کبھی سماجی حد بندیوں نے ساحر کے عشق کو پہنچنے نہیں دیا۔ اور یہ مشق اپنی جنون خیز کیفیتوں کے باوجود زخم خوردہ ہی رہا۔ اور ساحر کی صبح وشام کا کیف زندگی کی مصلحتوں کے انبار میں دب کر رہ گیا۔

ایک بستہ اداسی ہے دل وجاں پہ محیط
اب مری روح میں باقی ہے نہ امید نہ جوش
رہ گیا دب کے گراں بار سلاسل کے تلے
میری درماندہ جوانی کی امنگوں کا سروش

لیکن اس کے باوجود وہ اپنے غموں کو نظر انداز کر کے محبوب کی پریشانیوں اور غموں کا بھی مداوا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ وہاں پر ایک ایک لفظ ساحر کی اپنی افسردگی اور شکستگی کا آئینہ بن جاتا ہے۔

میری حیات کی غمگینیوں کا غم نہ کرو
غم حیات غم یک نفس سے کچھ بھی نہیں
تم اپنے حسن کی رعنائیوں پہ رحم کرو
وفا فریب ہے طولِ ہوس ہے، کچھ بھی نہیں

ساحر کے یہاں شدت احساس ہے تخیلی ماورائیت کی جگہ ارضیت ہے زندگی اور ح کی حقیقی تصویریں چلتی پھرتی نظر آتی ہیں اور جمالیات کی ایک ایسی کہکشاں بنائی ہیں جس کو دیکھتے دیکھتے آنکھیں نہیں تھکتیں۔ کچھ اشعار دیکھیں:

تیرے ہونٹوں پہ تبسم کی وہ ہلکی لکیر
میرے تخیل میں رہ رہ کے جھلک اٹھتی ہے
یوں اچانک ترے عارض کا خیال آتا ہے
جیسے ظلمت میں کوئی شمع بھڑک اٹھتی ہے
تیرے پیراہن رنگیں کی جنوں خیز مہک
خواب بن بن کے مرے ذہن میں لہراتی ہے
رات کی سرد خموشی میں ہر ایک جھونکے سے
تیرے انفاس، تیرے جسم کی آنچ آتی ہے

تیری آواز، انتظار، مضمحل خواب، خوبصورت موڑ، ہراس فنکار، فرار، ناکامی، ایک تصویر رنگ، میں نہیں تو کیا، ساحر کی یہ وہ نظمیں ہیں جو اردو ادب کی خوبصورت نظموں کے زمرے میں آتی ہیں۔ ان نظموں میں اتنی انوکھی، خوبصورت اور جاندار تشبیہیں اور ایسے ایسے حسین مصرعے رومانی کیفیتوں کے اظہار کے لئے کہے گئے ہیں جو ایک جمالیاتی فضا اور خوابناک ماحول پیدا کر دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر ذیل کے یہ اشعار

شہد سا گھل گیا تلخاب تنہائی میں
رنگ سا پھیل گیا دل کے سیہ خانے میں
دیر تک یوں تری مستانہ ادائیں گونجیں
جس طرح پھول چٹکنے لگے ویرانے میں
قطرہ قطرہ ترے دیدار کی شبنم ٹپکی
لمحہ لمحہ تری خوشبو سے معطر گزرا

مذکورہ اشعار ساحر کی مشہور نظم تیری آواز سے لئے گئے ہیں۔ پوری نظم رومانیت اور جمالیت کی ایک خوبصورت تصویر ہے جس میں سوز وساز کے ساتھ ایسی امیجری پیدا ہوتی ہے جو تصورات کی خوبصورت فضاؤں میں ایک نیا رنگ بھر دیتی ہے۔ ساحر نے زندگی کو بہت قریب سے دیکھا تھا۔ زندگی سے اسی قربت نے ان کے شعر وفن کو جلا بخشی تھی۔ شعر وادب کی دنیا میں ان کی حیثیت ہے۔ ویسے تنقیدی زاویہ نگاہ سے یہ حقیقت بھی اپنی جگہ مسلم ہے کہ انہیں ادب میں وہ مقام نہیں مل سکا جس کے وہ مستحق تھے۔ بلا شبہ فلموں نے انہیں جو شہرت ومقبولیت بخشی اور جس طرح سے ان کی زندگی ہی نہیں عوام وخواص میں ان کے گیتوں اور نغموں کا جادو سر چڑھ کر بول رہا تھا وہ اپنی مثال آپ ہے۔ تقسیم ہند کے بعد بمبئی آ کر فلموں سے وابستگی ہوتے ہی کامیابی ان کے قدم چومنے لگی۔ رومانیت ان کی فطرت میں رچی بسی تھی۔ ان کی رومانی گیتوں اور ساحرانہ انداز شاعری نے شائقین فلم کو دیوانہ بنا کر رکھ دیا تھا۔ ہندوستانی فلم انڈسٹری ساحر کی گیت سے بھرپور فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اس دور میں جان نثار اختر، شکیل بدایونی، مجروح سلطانپوری، کیفی اعظمی جیسے ہر دلعزیز فنکار وگیت کار موجود تھے جن کے نغمے اور رسیلے بول عالمی سطح پر فلموں کو شہرت ومقبولیت کے ساتھ اس کے ادبی وقار میں اضافہ کر رہے تھے۔ ان ہی مشہور ومقبول گیت کاروں کے درمیان ساحر کی شخصیت اور شاعری ایک نئے حسن وادا سے دلوں کو سحور کر رہی تھی۔ انہوں نے اپنی ذاتی زندگی کے تجربات و حادثات کو اپنے گیتوں میں یوں ڈھال دیا کہ دنیا ان کی دیوانی ہوگئی۔ ملاحظہ ہو ان کی بے حد مشہور غزل کے چند اشعار:

نغمہ وشعر کی سوغات کسے پیش کروں
یہ چھلکتے ہوئے جذبات کسے پیش کروں
کوئی ہمراز تو پاؤں کوئی ہمدم تو ملے

دل کی دھڑکن کے اشارات کسے پیش کروں

کبھی کبھی ساحر کی بے انتہا خوبصورت نظم ہے جس میں ساحر اپنی زیست کی تیرگی کا ذکر کرتے ہوئے اس حقیقت کا بھی اعتراف کرتے ہیں کہ یہ محرومیاں شادابیوں اور رعنائیوں میں بھی بدل سکتی تھیں لیکن شاید زمانے کو یہ منظور نہ تھا۔ اپنی بے شمار امنگوں اور تمناؤں کو سرسبز دیکھنے کی خواہش ان میں بھی جوان تھی لیکن حالات سازگار نہ تھے اور اب یہ حال ہے کہ نہ کوئی غم باقی ہے نہ کوئی جستجو حتی کہ اداسی کے یہ قافلے ان کی زندگی میں جیسے ٹھہر سے گئے ہوں:

نہ کوئی جادہ منزل نہ روشنی کا چراغ
بھٹک رہی ہے خلاؤں میں زندگی میری
ان ہی خلاؤں میں رہ جاؤں گا کبھی کھو کر
میں جانتا ہوں مری ہم نفس مگر یونہی
کبھی کبھی میرے دل میں خیال آتا ہے

اس نظم میں ساحر نے اپنی پرسوز کیفیت کو جس رعنائی فکر اور شگفتگی اسلوب کے ساتھ پیش کیا ہے اس نے ان کی نظم کو ہمہ گیر شہرت و مقبولیت بخشی ہے۔ ساحر کی ادبی خدمات کے اعتراف میں انہیں 1971ء میں پدم شری کے خطاب سے نوازا گیا۔ ان کی نظموں کے ترجمے دنیا کی مختلف زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ یہ ان کی آفاقیت اور مقبولیت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ ساحر جس نے کہا تھا کہ میں پل دو پل کا شاعر ہوں" لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کے نغموں کی بازگشت صدیوں تک سنائی دے گی۔

فن عروض کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے شاعر اپنے اشعار میں وزن اور بحر کو برقرار رکھتے ہیں۔ اس سے شاعری کی روانی، موسیقیت، اور ترتیب بہتر ہوتی ہے، اور قارئین کے لیے اشعار کا لطف دوبالا ہو جاتا ہے۔ اردو شاعری کی ہر صنف میں، خواہ وہ غزل ہو، نظم ہو، یا قصیدہ، عروض کا استعمال لازم ہے تاکہ شعر کی خوبصورتی اور تاثیر میں اضافہ ہو۔

فن عروض کی مدد سے شاعری میں موجود موسیقیت اور ردھم کو برقرار رکھا جاتا ہے، جس سے شاعری کی جمالیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ عروض شاعر کو یہ بھی سکھاتا ہے کہ کیسے مختلف بحروں میں اشعار کہے جا سکتے ہیں اور کیسے مختلف زحافات کا استعمال کیا جا سکتا ہے۔ فن عروض کی مدد سے شاعری کو ایک مخصوص دائرے میں لانا آسان ہو جاتا ہے، جس سے اشعار میں توازن اور خوبصورتی پیدا ہوتی ہے۔ اس علم کی مدد سے شاعری کو سننے اور پڑھنے والوں کے لئے دلکش بنایا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی تنقیدی بصیرت

نصیر وارثی
(ایڈیٹر، سہ ماہی ورثہ نیویارک)

ڈاکٹر جمیل جالبی اردو ادب کا ایک عظیم نام ہیں جنہوں نے نہ صرف اردو زبان و ادب کو نئی جہتیں دی بلکہ علمی و تحقیقی روایت کو بھی فروغ دیا۔ وہ ایک ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے جنہوں نے ادیب، نقاد، مترجم، محقق اور دانشور کی حیثیت سے اپنی شناخت قائم کی۔ ان کی علمی خدمات اور تخلیقی کارنامے اردو ادب کی تاریخ کا لازمی حصہ ہیں۔ اس مضمون میں ہم ان کی شخصیت اور فن کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ پیش کریں گے تاکہ ان کے ہمہ جہت علمی و ادبی کردار کی گہرائی کو سمجھا جا سکے۔

جمیل جالبی 12 جون 1929 کو علی گڑھ میں پیدا ہوئے۔ تقسیمِ ہند کے بعد وہ پاکستان منتقل ہوئے اور کراچی کو اپنا مسکن بنایا۔ انہوں نے قانون اور ادب دونوں میں اعلیٰ تعلیم حاصل کی اور علمی میدان میں اپنی خدمات کا آغاز کیا۔ جمیل جالبی نہ صرف پاکستان کی علمی و ادبی دنیا کے ممتاز ستون تھے بلکہ انہوں نے مختلف عہدوں پر خدمات انجام دیں جن میں اردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ اور جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کی حیثیت بھی شامل ہیں۔

جمیل جالبی کی حیثیت ایک عظیم نقاد کے طور پر مسلم ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں اردو ادب میں تحقیق کی نئی راہیں کھولتی ہیں۔ ان کی اہم کتاب ''اردو ادب کی تاریخ'' چار جلدوں پر مشتمل ایک غیر معمولی تحقیقی کارنامہ ہے۔ اس میں اردو ادب کے ارتقاء، شعری و نثری اصناف، اور مختلف ادوار کے ادبی رجحانات پر مفصل بحث کی گئی ہے۔

جمیل جالبی کی سب سے بڑی علمی کاوش ''تاریخِ ادبِ اردو'' ہے، جو ایک جامع اور مستند تصنیف کے طور پر جانی جاتی ہے۔ اس میں انہوں نے اردو زبان و ادب کے ارتقاء کو موضوع بنایا اور فارسی، عربی اور مقامی زبانوں کے اثرات کا گہرائی سے جائزہ پیش کیا۔ ان کا یہ کام اردو ادب کے ہر طالب علم کے لیے ایک لازمی حوالہ بن چکا ہے۔

جمیل جالبی نے عالمی ادب کو اردو قارئین سے متعارف کرانے کے لیے کئی اہم تراجم کیے۔ خاص طور پر ان کا ترجمہ کردہ مشہور انگریزی ناول ''گوڈے کی تلاش'' (Gulliver's Travels) اردو ترجمہ نگاری کی روایت میں ایک نمایاں اضافہ ہے۔ ان کے تراجم نے اردو زبان کو وسعت دی اور قارئین کے لیے عالمی ادب کے نئے دروازے کھولے۔

جمیل جالبی نے اردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ کی حیثیت سے ایک اہم کردار ادا کیا۔ ان کی سرپرستی میں اردو لغت کی ترتیب وتدوین کا کام بڑی سرعت سے آگے بڑھا اور کئی جلدیں مکمل ہوئیں۔ اس لغت کو اردو زبان کی علمی بنیادوں کو مضبوط کرنے کا ایک اہم وسیلہ سمجھا جاتا ہے۔

جمیل جالبی کی تنقید میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج نظر آتا ہے۔ ان کی تنقیدی بصیرت کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ ادب کے روایتی معیارات کو نظر انداز کیے بغیر جدید رجحانات کو بھی قبول کرتے ہیں۔ ان کی تنقید میں ادب کی فنی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کے سماجی، تاریخی اور نفسیاتی پہلوؤں پر بھی گہری نظر ملتی ہے۔

جمیل جالبی کا تنقیدی رویہ متوازن تھا۔ وہ نہ تو قدامت پرستی کے حامی تھے اور نہ ہی جدت پسندی کے اندھے مقلد۔ ان کی رائے میں ادب کو اس کے تاریخی اور سماجی سیاق وسباق میں سمجھنا ضروری ہے۔ انہوں نے ادب کے ارتقاء کو ایک تسلسل کے طور پر پیش کیا اور اس میں مختلف تہذیبی اثرات کی وضاحت کی۔

جمیل جالبی کی تنقید میں ادب اور معاشرے کے ربط پر خاص زور دیا گیا ہے۔ ان کے مطابق ادب محض تفریح کا ذریعہ نہیں بلکہ یہ معاشرتی شعور کی بیداری کا ایک اہم وسیلہ بھی ہے۔ ان کی تنقیدی تحریریں اس بات کا ثبوت ہیں کہ وہ ادب کو زندگی سے الگ نہیں سمجھتے تھے بلکہ ادب کو سماجی زندگی کا آئینہ قرار دیتے تھے۔

جمیل جالبی کی شخصیت بھی ان کی تحریروں کی طرح متوازن اور ہمہ جہت تھی۔ وہ ایک عاجز، نرم مزاج اور علم دوست انسان تھے جنہوں نے ہمیشہ علم وادب کی خدمت کو اپنی زندگی کا مقصد بنایا۔ ان کی ذات میں مشرقی روایات اور جدید فکری رجحانات کا امتزاج تھا۔ وہ ایک مہربان استاد اور رہنما کے طور پر جانے جاتے تھے اور ان کی تربیت سے کئی نامور ادیبوں اور محققین نے فائدہ اٹھایا۔

جمیل جالبی کی علمی خدمات کے باوجود بعض ناقدین نے ان پر چند اعتراضات بھی کیے ہیں۔ ان میں سے ایک اعتراض یہ ہے کہ ''تاریخ ادبِ اردو'' میں انہوں نے کچھ مقامات پر ذاتی ترجیحات کو زیادہ اہمیت دی اور بعض ادبی شخصیات کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ اپنایا۔ تاہم، یہ اعتراضات ان کی مجموعی علمی کاوشوں کے سامنے معمولی دکھائی دیتے ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی شخصیت اور فن اردو ادب کا ایک قیمتی سرمایہ ہیں۔ انہوں نے اپنی تمام زندگی اردو زبان وادب کی خدمت میں گزار دی اور ان کے کارنامے آنے والی نسلوں کے لیے ایک مشعلِ راہ ہیں۔ ان کی تحریریں، تراجم اور تنقیدی مضامین اردو ادب کے طالب علموں اور محققین کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہیں۔ جمیل جالبی کی خدمات کو یاد رکھنا اور ان کے کام کو آگے بڑھانا ہر اہلِ ادب کی ذمہ داری ہے۔

اردو ادب میں ڈاکٹر جمیل جالبی کا نام ایک بلند پایہ محقق، نقاد اور ادبی مؤرخ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ ان کا تنقیدی رویہ ایک ایسے متوازن نظریے کا حامل تھا، جو نہ صرف روایتی ادبی قدروں کی پاسداری کرتا ہے بلکہ جدید رجحانات کو بھی وسیع تناظر میں سمجھنے اور قبول کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ جمیل جالبی کا تنقیدی فکر اور طرزِ تحریر اردو ادب میں ایک منفرد اور مستقل مقام رکھتا ہے، جس میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج جھلکتا ہے۔ ان کی تنقید نہ تو محض نظریاتی مفروضات تک محدود رہی اور نہ ہی جدت پسندی کے رجحانات کی اندھی تقلید کی۔ اس مضمون میں ان کے تنقیدی رویے کی گہرائی اور اس میں موجود اعتدال اور توازن کا جائزہ پیش کیا جائے گا۔

جمیل جالبی نے اردو ادب کی کلاسیکی روایت کو کبھی نظر انداز نہیں کیا۔ ان کی تنقیدی بصیرت کا خاص پہلو یہ ہے کہ وہ اردو ادب کے ابتدائی رجحانات اور کلاسیکی شاعری، مثلاً میر، غالب، سودا، اور انیس کی شعری روایات کو ایک اہم بنیاد کے طور پر دیکھتے ہیں۔ ان کے نزدیک ادب کا ارتقاء ان بنیادوں پر استوار ہوتا ہے جنہیں سمجھنا ایک نقاد کے لیے ضروری ہے۔

جالبی کی تحریروں میں کلاسیکی ادب کی گہرائی اور اس کا جمالیاتی پہلو نمایاں نظر آتا ہے۔ مثال کے طور پر، ان کا مطالعہ میر کی شاعری میں محض جذباتیت تک محدود نہیں بلکہ وہ میر کے کلام کے فلسفیانہ پہلو اور نفسیاتی گہرائی کو بھی اجاگر کرتے ہیں۔

جمیل جالبی کا تنقیدی رویہ نہ صرف کلاسیکی ادب تک محدود تھا بلکہ وہ جدید ادبی رجحانات کی بھی بھرپور حمایت کرتے تھے۔ وہ ادب کے سماجی اور نفسیاتی پہلوؤں کو بھی اہمیت دیتے تھے، اور ان کے نزدیک ادب صرف تفریح یا جمالیاتی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک زندہ معاشرتی شعور کی عکاسی ہے۔

انہوں نے ترقی پسند تحریک کے ادبی رجحانات کو گہرائی سے سمجھا اور ان کے مثبت پہلوؤں کو سراہا، اگرچہ بعض جگہوں پر انہوں نے ترقی پسند نقادوں کی غیر متوازن فکر پر تنقید بھی کی۔ ان کا کہنا تھا کہ ادب میں نظریاتی شدت پسندی تخلیقی آزادی کو محدود کر دیتی ہے، لہٰذا اعتدال اور وسیع النظری ضروری ہے۔

جمیل جالبی کی تنقید کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ وہ روایت اور جدت کے درمیان ایک متوازن رویہ اپناتے ہیں۔ ان کے مطابق، ادب کا ارتقاء ایک مسلسل عمل ہے، اور نئی اصناف یا رجحانات کو اپنانے کے لیے ماضی کی روایت سے کٹنا ضروری نہیں۔

انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اردو ادب کی ترقی کا انحصار اس بات پر ہے کہ ہم روایتی اقدار کو جدید تقاضوں کے ساتھ ہم آہنگ کریں۔ مثال کے طور پر، وہ غالب کی شاعری کو جدید اردو شاعری کے لیے ایک اہم سنگِ میل قرار دیتے ہیں، کیونکہ غالب نے اپنی شاعری میں روایت اور جدت دونوں کو بیک وقت نبھایا۔

جمیل جالبی کی تحریریں اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہیں کہ انہوں نے متوازن تنقید کو صرف نظری سطح پر نہیں بلکہ عملی طور پر بھی اپنایا۔ ان کی کتاب ''تاریخِ ادبِ اردو'' اس بات کا بہترین ثبوت ہے جہاں انہوں نے اردو ادب کے مختلف ادوار، اصناف اور رجحانات کو متوازن انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ کتاب صرف تاریخی معلومات تک محدود نہیں بلکہ اس میں ہر دور کے ادبی رجحانات اور نظریات کا تجزیہ بھی شامل ہے۔ انہوں نے ہر دور کے ادیبوں اور شاعروں کو ان کے سماجی، تاریخی اور ثقافتی پس منظر میں سمجھنے کی کوشش کی۔

جمیل جالبی کے تنقیدی رویے کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ وہ ادب کو زندگی اور معاشرے سے جوڑتے ہیں۔ ان کے مطابق، ادب کا مقصد محض تفریح فراہم کرنا نہیں بلکہ انسانی شعور کو بیدار کرنا اور معاشرتی مسائل کی عکاسی کرنا بھی ہے۔

جالبی کی تحریروں میں ادب اور معاشرتی شعور کے درمیان تعلق کی کئی مثالیں موجود ہیں۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک اور جدیدیت کے رجحانات کو اسی زاویے سے دیکھا اور ان کے سماجی و فکری اثرات کا تجزیہ کیا۔

جمیل جالبی کے تنقیدی نظریات میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ وہ نظریاتی شدت پسندی سے ہمیشہ گریز کرتے رہے۔ ان کے نزدیک ادب ایک آزاد اور تخلیقی سرگرمی ہے جسے کسی خاص نظریے یا سیاسی ایجنڈے کا پابند نہیں ہونا چاہیے۔

انہوں نے ترقی پسند نقادوں اور جدیدیت پسند ادیبوں دونوں کے مثبت پہلوؤں کو سراہا لیکن دونوں کے نظریاتی تعصّبات پر تنقید بھی کی۔ ان کا ماننا تھا کہ ادب کو کسی خاص نظریے کی بنیاد پر محدود کرنا اس کی تخلیقی روح کے ساتھ ناانصافی ہے۔

جمیل جالبی کا تنقیدی اسلوب سادہ مگر مؤثر ہے۔ ان کی زبان میں علمی اور فکری گہرائی ہوتی ہے لیکن وہ عام قاری کے لیے بھی قابلِ فہم رہتی ہے۔ ان کا اندازِ بیان پیچیدہ فلسفیانہ اصطلاحات کے بغیر بھی مسائل کی گہرائی تک پہنچنے کی صلاحیت رکھتا ہے۔

ان کی تنقید میں تجزیے کی گہرائی اور موضوعات پر جامع گرفت نظر آتی ہے۔ وہ ہر ادبی متن کو اس کے پس منظر، اسلوب، اور فکری جہات کے ساتھ جانچتے ہیں۔

اگرچہ جمیل جالبی کے تنقیدی نظریات کو عمومی طور پر سراہا گیا، لیکن بعض ناقدین نے ان پر یہ اعتراض کیا کہ وہ بعض مقامات پر اعتدال کے بجائے ذاتی پسند و ناپسند کو ترجیح دیتے ہیں۔ خاص طور پر ''تاریخِ ادبِ اردو'' میں بعض ادبی شخصیات کے ساتھ ان کے رویے کو غیر منصفانہ قرار دیا گیا۔

تاہم، ان اعتراضات کے باوجود ان کی مجموعی تنقیدی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جمیل جالبی کی تنقید کی سب سے بڑی خوبی یہی ہے کہ انہوں نے ہر نظریے کو ایک وسیع تناظر میں پرکھا اور ادب کو زندگی اور معاشرت سے جوڑنے کی کوشش کی۔

جمیل جالبی کا تنقیدی رویہ اردو ادب میں ایک منفرد اور مثالی حیثیت رکھتا ہے۔ ان کی تنقید میں روایت اور جدت کا حسین امتزاج، ادب اور معاشرتی شعور کے ربط پر زور، اور نظریاتی شدت پسندی سے گریز جیسے پہلو نمایاں ہیں۔ انہوں نے ہر ادبی رجحان کو متوازن انداز میں سمجھنے اور پیش کرنے کی کوشش کی اور ادب کو ایک زندہ اور متحرک شے کے طور پر دیکھا۔

جمیل جالبی کی تنقیدی بصیرت ہمیں سکھاتی ہے کہ ادب میں انتہا پسندی کے بجائے اعتدال اور توازن ضروری ہے۔ ان کا کام اردو ادب کے طالب علموں اور محققین کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے اور ان کے متوازن تنقیدی رویے کو آج بھی رہنمائی کے لیے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ ڈاکٹر جمیل جالبی کی سب سے نمایاں اور عظیم خدمت ان کی تصنیف ''تاریخِ ادبِ اردو'' ہے، جو چار جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ پر سب سے جامع اور مستند تصنیف کے طور پر جانی جاتی ہے

جامعیت: جالبی نے اردو ادب کے ارتقاء کو مختلف ادوار اور اصناف کے ساتھ مربوط انداز میں بیان کیا۔

تہذیبی اثرات کا تجزیہ: انہوں نے فارسی، عربی اور مقامی زبانوں کے ادب کے اردو پر اثرات کو نہایت تفصیل سے بیان کیا۔

ہر دور کا تجزیہ: انہوں نے مختلف ادبی رجحانات اور تحریکات جیسے کلاسیکیت، ترقی پسند تحریک، اور جدیدیت پر تنقید اور تجزیہ پیش کیا۔

ادبی تاریخ کا تنقیدی پہلو: جالبی کی تصنیف محض واقعاتی بیان تک محدود نہیں بلکہ ہر دور کی فکری اور جمالیاتی جہات کا بھی عمیق تجزیہ کرتی ہے۔

یہ کتاب اردو ادب کی تاریخ نویسی میں ایک سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے اور آج بھی طلبہ، محققین اور نقادوں کے لیے ایک لازمی حوالہ سمجھی جاتی ہے۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے تنقید اور تحقیق دونوں شعبوں میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ان کی تنقید نہ صرف ادبی متون کی فنی اور جمالیاتی خوبیوں کو اجاگر کرتی ہے بلکہ اس میں معاشرتی، تہذیبی اور نفسیاتی پہلو بھی شامل ہوتے ہیں۔

جالبی کی تنقید روایت اور جدت کا حسین امتزاج پیش کرتی ہے۔ وہ ادب کو ایک ایسی تخلیقی سرگرمی سمجھتے ہیں جو نہ صرف معاشرتی حقیقتوں کی عکاسی کرتی ہے بلکہ جمالیاتی حسن کو بھی پیش کرتی ہے۔ ان کا تنقیدی اسلوب نہ تو صرف روایت پسندی کا مظہر ہے اور نہ ہی وہ جدیدیت کی اندھی تقلید کرتے ہیں۔

ان کی تحقیقی کاوشیں اردو ادب کے ماخذوں کی تلاش اور تجزیے پر مرکوز تھیں۔ انہوں نے قدیم متون کی تدوین کے ساتھ ساتھ ان کے ادبی، تاریخی اور لسانی تناظر میں گہرائی سے تجزیہ پیش کیا۔

جمیل جالبی نے اردو قارئین کو عالمی ادب سے روشناس کرانے کے لیے کئی اہم تراجم کیے۔ ان کے تراجم نہ صرف زبان کی چاشنی کا نمونہ ہیں بلکہ وہ اصلی متن کے فکری اور جمالیاتی پہلوؤں کو بھی اردو زبان میں کامیابی سے منتقل کرتے ہیں۔

گوڈے کی تلاش (Gulliver's Travels): یہ ترجمہ اردو میں غیر ملکی ادب کے معیار کو بلند کرنے کی ایک کوشش تھی۔

جالبی نے دیگر مغربی ادبیات کے تراجم میں بھی مہارت دکھائی اور اردو زبان میں عالمی ادب کے فکری پہلوؤں کو متعارف کرایا۔

ڈاکٹر جمیل جالبی نے اردو ڈکشنری بورڈ کے سربراہ کی حیثیت سے اردو لغت کی تدوین میں کلیدی کردار ادا کیا۔ اردو لغت کی ترتیب اور تدوین کا یہ منصوبہ ایک وسیع کام تھا، اور جالبی نے اپنی قیادت میں اس عمل کو نہایت احسن طریقے سے آگے بڑھایا۔

اردو لغت کا یہ منصوبہ اردو زبان کی ترویج اور فروغ کے لیے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔

اس لغت نے اردو کے الفاظ کے تاریخی اور معنوی پہلوؤں کو منظم انداز میں پیش کیا، جس سے تحقیق اور تدریس کے شعبے کو تقویت ملی۔ جالبی کی سرپرستی میں اس لغت کی کئی جلدیں شائع ہوئیں، جو آج بھی طلبہ، محققین اور ماہرینِ لسانیات کے لیے ایک قیمتی ذریعہ ہیں۔ جمیل جالبی کے نزدیک ادب محض تفریح یا جمالیاتی تسکین کا ذریعہ نہیں بلکہ ایک سماجی شعور کا آئینہ دار بھی ہے۔ ان کی تنقید اور تحقیق میں ادب کو معاشرتی تناظر میں سمجھنے اور پیش کرنے کا رجحان نمایاں نظر آتا ہے۔ انہوں نے ترقی پسند تحریک کے ادب کا گہری نظر سے مطالعہ کیا۔ جالبی نے اس تحریک کے سماجی شعور اور معاشرتی ناانصافیوں کے خلاف آواز بلند کرنے کو سراہا، تاہم انہوں نے نظریاتی شدت پسندی پر تنقید بھی کی۔ ان کے نزدیک ادب کو کسی مخصوص نظریے کا پابند نہیں ہونا چاہیے بلکہ اسے تخلیقی آزادی کا اظہار کرنا چاہیے۔ جمیل جالبی نے مختلف ادبی اور تعلیمی اداروں میں نمایاں خدمات انجام دیں۔ جامعہ کراچی کے وائس چانسلر کی حیثیت سے انہوں نے نہ صرف تعلیمی معیار کو بلند کیا بلکہ ادبی سرگرمیوں کو بھی فروغ دیا۔ اردو ڈکشنری بورڈ کی قیادت میں انہوں نے لغت نویسی کے پیچیدہ اور طویل عمل کو کامیابی سے آگے بڑھایا۔

جمیل جالبی کا تنقیدی اسلوب سادہ اور مؤثر تھا۔ ان کی زبان میں علمی گہرائی اور ادبی نزاکت کا امتزاج پایا جاتا تھا۔ ان کی تحریریں پیچیدہ فلسفیانہ اصطلاحات کے بغیر بھی مسائل کی گہرائی تک پہنچتی ہیں، جو ان کے تجزیاتی ذہن کا مظہر ہے۔

جالبی نے مختلف ادبی شخصیات جیسے میر، غالب، اقبال، فیض اور منٹو کے کام پر بھی تفصیل سے تنقید کی۔ ان کی تنقید میں شخصیت کے فنی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ ان کے سماجی اور نفسیاتی عوامل کا بھی احاطہ کیا گیا۔ اگرچہ جمیل جالبی کی خدمات کو عمومی طور پر سراہا گیا، مگر بعض ناقدین نے ان پر یہ اعتراض کیا کہ وہ بعض ادبی شخصیات کے ساتھ غیر منصفانہ رویہ اپناتے ہیں۔ خاص طور پر ''تاریخِ ادبِ اردو'' میں کچھ شعرا اور ادیبوں کو نظر انداز کرنے کا الزام بھی لگایا گیا۔ تاہم، ان اعتراضات کے باوجود جمیل جالبی کا کام اپنی جگہ مسلم ہے اور ان کی خدمات اردو ادب کے لیے ایک لازوال اثاثہ ہیں۔

ڈاکٹر جمیل جالبی کی ادبی خدمات کا دائرہ وسیع اور متنوع ہے۔ انہوں نے اردو ادب کی تاریخ نویسی، تنقید، تحقیق، لغت نویسی اور ترجمہ نگاری میں غیر معمولی کارنامے انجام دیے۔ ان کا متوازن تنقیدی رویہ اور ادب کے سماجی شعور پر زور ان کی فکر کا خاصہ ہے۔ جمیل جالبی کی تصانیف اور علمی کاوشیں اردو ادب کے طالب علموں اور محققین کے لیے مشعلِ راہ ہیں اور ہمیشہ رہیں گی۔

حوالہ جات

جالبی، جمیل. تاریخِ ادبِ اردو (جلد اول تا چہارم).

شمیم احمد. ''جمیل جالبی: ادب اور تحقیق میں ایک معتبر نام''. ماہنامہ اردو ادب 2016

فاطمہ حسن. ''جمیل جالبی کی ادبی خدمات: ایک تنقیدی جائزہ''. پاکستانی ادب کا مطالعہ 2018

شمس الرحمٰن فاروقی. ''اردو لغت نویسی اور جمیل جالبی

مصادر و مراجع

جالبی، جمیل. تاریخِ ادبِ اردو (جلد اول تا چہارم).

احمد، شمیم. ''اردو تنقید میں جمیل جالبی کا مقام''. ماہنامہ سخن 2015.

زیدی، فاطمہ حسن. ''جمیل جالبی: ایک عہد ساز نقاد''. پاکستانی ادب کا جائزہ 2018

فاروقی، شمس الرحمٰن. ''تنقید اور تحقیق: جمیل جالبی کی بصیرت'' معارف 2016

''جمیل جالبی کا تنقیدی متوازن رویہ''

اردو ادب کی کہانیاں ہمیشہ سے انسانی جذبات، زندگی کے مسائل، اور معاشرتی حقائق کی عکاس رہی ہیں۔ اگرچہ محبت ایک اہم موضوع رہا ہے، لیکن یہ کہنا کہ اردو کہانیاں صرف محبت کی کہانیوں تک محدود ہیں، ایک ناپختہ تجزیہ ہوگا۔ اردو ادب کی وسعت اور گہرائی اس قدر ہے کہ اس میں انسانی زندگی کے ہر پہلو کو موضوع بنایا گیا ہے۔ محبت ایک اہم جذبہ ہے، لیکن اردو کہانیوں میں ایسے کئی موضوعات ہیں جو محبت کے علاوہ زندگی کے دوسرے پہلوؤں پر روشنی ڈالتے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری

شیخ فاطمہ کرمانی شیخ نصیر (ریسرچ اسکالر)

تمہید:

اردو ادب میں خاکہ نگاری کی ابتدا بیسویں صدی کے دوسرے یا تیسرے دہائی سے ہوتی ہے۔ اس سے قبل غالب کے خطوط، نظیر احمد کے ناولوں، رتن ناتھ سرشار کے فسانۂ آزاد اور تذکروں خصوصاً محمد حسین آزاد کے آبِ حیات میں خاکوں کے ابتدائی دلکش نمونے ملتے ہیں۔ خاکہ نگاری کی اصطلاح ہمارے یہاں انگریزی ادب سے آئی ہے، تب سے خاکہ نگاری کو اہم ادبی اصناف میں شامل کیا جانے لگا۔ بعد کے لکھنے والوں میں فرحت اللہ بیگ، مولوی عبدالحق، عصمت چغتائی، عظیم بیگ، شوکت تھانوی، رشید احمد صدیقی، کنہیالال کپور، مشتاق احمد یوسفی اور یوسف ناظم سنجیدہ اور مزاحیہ خاکہ نگاروں میں اپنا ایک اہم مقام رکھتے ہیں۔ مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری ان میں سے کسی سے کم نہیں۔ وہ خاکہ نگار ہی نہیں بلکہ طنز و مزاح کے میدان میں آل راؤنڈر ہیں۔ وہ انشائیہ نگار ہیں، صحافی، کالم نگار اور سفرنامے بھی انھوں نے لکھے ہیں۔ رپورتاژ ان کی تصانیف میں شامل ہیں۔ خاکہ نگار تو وہ ہیں ہی، وہ ایک ترشہ ہوا ہیرا بھی ہیں۔ جن کا ہر پہلو درخشاں ہیں۔ ہر پہلو کے کئی رنگ ہیں، ہر رنگ روشن ہیں، جس کی چمک دمک کے آگے کسی اور ہیرے کو لائیں تو وہ لاکھ چمکدار صحیح، اس کا کوئی نا کوئی پہلو مجتبیٰ کے آگے مدھم ضرور پڑ جائے گی۔

حالاتِ زندگی:

جس زمانے میں مجتبیٰ حسین پیدا ہوئے، گلبرگہ، ریاستِ حیدرآباد کا ایک ضلع تھا۔ مگر 1956 میں ریاستوں کی لسانی تقسیم کے بعد کرناٹک کا ایک ضلع ہو گیا۔ گلبرگہ کی ایک تحصیل چینچولی ہے، اس تحصیل میں 15/جولائی 1936 کو مولوی احمد حسین صاحب کے گھر میں مجتبیٰ حسین پیدا ہوئے۔ مولوی احمد حسین ضلع عثمان آباد کے رہنے والے تھے۔ ان کی ملازمت کا زیادہ عرصہ گلبرگہ ہی میں گزرہ جہاں وہ تحصیلدار تھے۔ مولوی احمد حسین صاحب علمی و ادبی ذوق کے آدمی تھے۔ مجتبیٰ حسین اور ان کے دونوں بڑے بھائیوں محبوب حسین جگر اور ابراہیم جلیس کو ادبی ذوق اپنے والد ہی سے ورثے میں ملا تھا۔ جلیس نے صحافت، طنز و مزاح اور فکشن میں نام کمایا۔ محمود حسین جگر نے صحافت میں اپنا سکہ جمایا۔ مجتبیٰ حسین طنز و مزاح کے بے جوڑ قلمکار ثابت ہوئے۔

محبوب حسین جگر (1997-1919) نے قلمی سفر کا آغاز افسانہ نگاری سے کیا۔ شاعری بھی کی، مضامین بھی لکھے۔ طالب علمی کے زمانے میں ان کے مضامین ملک کے اکثر معیاری رسالوں میں چھپنے لگے تھے۔ نگار کے ایڈیٹر نیاز فتح پوری ان کے بڑے قدرداں تھے۔ والد کے انتقال اور گریجویشن کی تکمیل کے بعد محبوب حسین جگر نے گھریلو ذمہ داریوں کی وجہ سے سرکاری ملازمت اختیار کی۔ پہلے کسٹم ڈپارٹمنٹ میں سب انسپیکٹر مقرر ہوئے، پھر محکمۂ اطلاعات ونشر و اشاعت سے منسلک ہو گئے۔ دراصل وان ملازمتوں کے لیے پیدا نہیں ہوئے تھے، ان کا اصل میدان تو صحافت تھا۔ عابد علی خان اور محبوب حسین جگر نے مل کر ایک اردو روزنامہ نکالنے کا فیصلہ کیا۔ اخبار کا مکمل خاکہ تیار کیا گیا۔ 15/اگست 1949 کو ''سیاست'' کا پہلا شمارہ منظرِ عام پر آیا۔ اس کے بعد جگر صاحب کی ہر صبح اور ہر شام، زندگی کا ایک ایک لمحہ ''سیاست'' کے لیے وقف ہو گیا۔ ان کی وفات (11 مارچ 1997) تک وہ ''سیاست'' کے شریکِ مدیر رہے۔

محبوب حسین جگر کی طرح افسانہ نگاری سے ہی ابراہیم جلیس 22 ستمبر 1923 کے ادبی سفر کا آغاز ہوا۔ جلیس بڑے حساس دل کے مالک تھے۔ زمانے کے سرد و گرم نے انھیں اور بھی حساس بنا دیا تھا۔ جس کی وجہ سے ان کی تحریوں میں مزاح سے زیادہ طنز کی کاٹ ملتی ہے۔ افسانے ہوں کے ناول، کالم ہوں کہ رپورتاژ، جلیس کی مزاح میں ایک کسک ہے۔ ایک تڑپ ہے۔ طنز کے تیر ہیں۔ ان کا پہلا افسانہ ''خدا جھوٹ نا بلوائے'' 1940 میں ماہنامہ سب رس حیدرآباد میں شائع ہوا۔ جس کا مقدمہ قاضی عبدالغفار نے لکھا تھا۔ ''چالیس کروڑ بھکاری'' ابراہیم جلیس کے افسانوں کا دوسرا مجموعہ ہے یہ 1945 میں کراچی سے شائع ہوا۔ ان کے افسانے حقیقت پر مبنی افسانے ہیں جس میں عوامی، سیاسی، معاشی اور نفسیاتی مسائل پر قلم اٹھایا گیا ہے۔ ابراہیم جلیس نے صرف ایک ناول ''چور بازار'' لکھا جو 1946 میں حیدرآباد سے شائع ہوا۔ چور بازار جلیس کا واحد ناول ہونے کے باوجود ان کے بہترین ناولوں میں سے ایک ہیں۔ اس ناول کے ذریعے جلیس نے ہندوستانیوں میں سامراجیت کے خلاف بغاوت کا جذبہ پیدا کرنے کی کوشش کی۔

اردو میں کالم نویسی کی داغ بیل منشی سجاد حسین نے 1877 میں اخبار اودھ پنچ میں ڈالی تھی۔ ابراہیم جلیس نے یہ فن قاضی عبدالغفار سے سیکھا تھا۔ وہ جتنے اچھے افسانہ نگار تھے اتنے ہی اچھے کالم نویس اور صحافی بھی تھے۔ حیدرآباد سے ان کی صحافتی زندگی کا آغاز ہفتہ وار پرچم سے ہوا۔ 1945 میں پاکستان چلے گئے۔ وہاں لاہور سے نکلنے والے اخبار 'امروز' سے وابستہ ہو گئے۔ 1956 تک اس اخبار میں ایک مزاحیہ کالم وغیرہ وغیرہ لکھتے رہے۔ روزنامہ ''حریت''، ''مساوات'' اور مشہور اخبار ''جنگ'' میں کالم لکھتے رہیں۔ اپنا ایک ذاتی اخبار ''عوامی عدالت'' بھی نکالا تھا۔ ان

کے کالم نا صرف سیاست کی ترجمانی کرتے تھے بلکہ ان میں سماج کے چھوٹے چھوٹے واقعات پر بھی ردِعمل کا اظہار ہوتا تھا۔ ان کے قلم میں جادو تھا۔ وہ بیک وقت افسانہ نگار، ناول نگار، کالم نویس اور اعلیٰ پائے کے صحافی تھے۔

تعلیم اور ملازمت:

ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد مجتبیٰ حسین کو گلبرگہ کے مدرسہ تحتانیہ آصف گنج میں شریک کیا گیا اور تانڈور (آندھرا پردیش) سے میٹرک کا امتحان کامیاب کیا۔ 1953 میں گلبرگہ انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ 1956 میں عثمانیہ یونیورسٹی حیدرآباد سے بی۔اے کی سند حاصل کی انھوں نے evening college حیدرآباد سے Diploma in Public Administration کا امتحان بھی کامیاب کیا۔

اپنے والد کی ملازمت کی وجہ سے زیادہ عرصہ ہاسٹلوں میں رہنا پڑا۔ ہاسٹل کی زندگی میں زحمتیں ہیں، وہیں پر کچھ رحمتیں بھی ہیں۔ مجتبیٰ کہتے ہیں ہاسٹل کی زندگی میں انسان میں خودشناسی کا جوہر پیدا ہوتا ہے، قوتِ فیصلہ میں ترقی ہوتی ہے اور اپنی صلاحیتوں کو جاننے اور منوانے کے مواقع میسر آتے ہیں۔ ان کی شخصیت نے کئی صلاحیتوں کو چمکا دیا ہے۔ ان کی شخصیت اور تحریروں میں جو خود اعتمادی نظر آتی ہے، وہ ان کے تعلیمی زمانے کی دین ہیں۔ گلبرگہ کا تعلیمی دور رہا ہو یا عثمانیہ یونیورسٹی کا، ہر جگہ انھوں نے دوستوں کی ایک دنیا آباد کی۔ انٹرمیڈیٹ میں بزمِ اردو کے جنرل سیکریٹری رہے۔

گریجویشن کی تکمیل کے بعد کچھ عرصہ محکمہ مالِ حکومت آندھرا پردیش میں ملازمت کی۔ 1962 میں محکمۂ اطلاعات وتعلقات عامہ کے اردو شعبہ سے وابستہ ہوئے۔ 1972 میں حکومت ہند نے اردو کے مسائل کا جائزہ لینے کے لیے گجرال کمیٹی تشکیل دی تو انھیں اس کمیٹی کے شعبہ تحقیق میں کام کرنے کے لیے بلوایا گیا۔ اس ملازمت کے تعلق سے اپنے منفرد انداز میں لکھتے ہیں ''ایک دن کمیٹی کے دفتر سے میرے نام مراسلہ آیا کہ میاں دہلی چلے آؤ اور کمیٹی کی رپورٹ لکھنے میں حکومت کا ہاتھ وغیرہ بٹاؤ۔''

یہ کام ختم ہوگیا تو 19 ستمبر 1974 کو نیشنل کاؤنسل آف ایجوکیشنل ریسرچ اینڈ ٹریننگ (NCERT) میں پبلیکیشن ڈپارٹمنٹ میں شعبہ اردو کے ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ 1933 میں اسی کاؤنسل سے وظیفہ پر سبکدوش ہوگئے۔ اب تک جن طنز ومزاح نگاروں نے اپنی اہمیت منوائی ہے ان سب میں معتبر نام مجتبیٰ حسین کا ہے۔ مجتبیٰ حسین کو جس تیز رفتاری سے عالمی شہرت حاصل ہوئی، وہ موجودہ دور میں بہت کم مزاح نگاروں کے حصے میں آئی ہے۔

اعزازات:

مجتبیٰ حسین ۱۹۶۲ سے طنز ومزاح کے میدان میں اپنے قدم جمائے ہوئے ہیں۔ ان کی تحریروں نے جہاں ہندوستانی عوام، دوستوں اور دانشوروں سے داد حاصل کی وہیں بیرونی ممالکوں میں طنز ومزاح کے گل بکھیرتے رہے ہیں۔ انھیں وطن میں اور وطن کے باہر بھی کئی انعامات اور اعزازت سے نوازا گیا۔

سب سے پہلا انعام اڑیہ زبان کے ادیبوں کی ایک اہم تنظیم سرس ساہتیہ سمیتی کٹک کی جانب سے ہاسیہ رتن کے خطاب کی صورت میں ۱۹۸۰ میں دیا گیا۔ اسی موقع پر ان کے مضامین کا ایک مجموعہ اڑیہ زبان میں شائع کیا گیا۔ ۱۹۸۳ میں دہلی کی ایک ادبی تنظیم نے ''نشانِ امتیاز'' سے نوازا۔ ۱۹۸۴ میں غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کا پہلا غالب ایوارڈ برائے اردو طنز ومزاح دیا گیا۔ ۱۹۹۰ میں اردو اکیڈمی دہلی نے تخلیقی نثر کے لیے انعام سے سرفراز کیا۔ ۱۹۹۳ میں اے پی اردو اکیڈمی نے کل ہند مخدوم ایوارڈ کے لیے چنا گیا۔ اس کے چھ سال بعد ہریانہ اردو اکیڈمی نے کل ہند کنور مہیندر سنگھ بیدی ایوارڈ برائے طنز ومزاح سے نوازا۔

مجتبیٰ کی پانچ کتابیں ہندی میں بھی چھپ چکی ہیں۔ اس کے علاوہ ملک کے دیگر زبانوں میں بھی ان کے بعض تصانیف کے ترجمے ہو چکے ہیں۔ ۱۹۸۵ میں ان کے سفرنامے ''جاپان چلو جاپان چلو'' کا اردو کی جاپانی اسکالر مسز شورے نے جاپانی میں ترجمہ کیا۔ مجتبیٰ کی شخصیت اور فن کے مختلف گوشوں پر ہندوستان کی مختلف جامعات میں مقالے لکھے گئے۔

برطانیہ کے مختلف شہروں کے علاوہ پیرس، واشنگٹن، ڈیٹرائٹ، تاشقند، سمرقند، بخارا، لینن گراڈ اور ماسکو، سعودی عرب اور عمارات میں ان کے اعزاز میں جلسے منعقد کیے گئے تھے اور اعزازت سے نوازا گیا تھا۔

مجتبیٰ حسین کی تصانیف:

مجتبیٰ حسین کی مزاح نگاری کا آغاز محض ایک اتفاق تھا بلکہ وہ زبردستی اس طرف لائے گئے تھے۔ ۱۹۶۲ میں اردو کے مشہور شاعر اور روزنامہ سیاست حیدرآباد کے ممتاز کالم نگار ہے۔ شاہد صدیقی کا انتقال ہوگیا تو مجتبیٰ کے بڑے بھائی محبوب حسین نے مجتبیٰ کو سیاست کا مشہور کالم شیشہ وتیشہ جبراً تھما دیا۔ مخمور سعیدی اور کما پاشی کو انٹرویو دیتے ہوئے کہتے ہیں:

''۱۲/ اگست ۱۹۶۲ کو دن میں ٹھیک ۱۰:۳۰ بجے میں نے مزاح نگاری شروع کی۔۔۔۔۔۔۔۔۔''

دیکھتے ہی دیکھتے مجتبیٰ کا فرضی نام کوہِ پیما مقبول ہوگیا۔ ہندوستان اور پاکستان کے اخباروں میں انھیں نقل کیا جانے لگا۔ مجتبیٰ حسین نے کئی جگہ اس بات کا

اظہار کیا ہے کہ مزاح لکھنے کے لیے انھیں خوب محنت کرنی پڑی۔

مجتبیٰ حسین کے انشائیوں، خاکوں، کالموں اور سفرناموں کے انتخاب سے ہٹ کر اب تک ۱۴ کتابیں منظرِ عام پر آچکی ہیں۔ ان کے خاکوں میں مزاحیہ مضامین، انشائیے، سفرنامے رپورتاژ وغیرہ شامل ہیں۔ ''تکلف برطرف'' ان کے مضامین کا پہلا مجموعہ ہے۔ قطع کلام، قصہ مختصر، بحر حال، بالآخر، الفرض اور آخر کار طنزیہ اور مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔

مجتبیٰ حسین کے خاکوں کا اسلوب:

مجتبیٰ حسین کی خود کے بارے میں رائے ہیں کہ ''جس طرح دل و دماغ نے کسی شخصیت کو قبول کیا، اسے ہو بہو کاغذ پر منتقل کر دیا''۔ یہی وہ خصوصیات ہے جو مجتبیٰ کے خاکوں میں نظر آتی ہیں۔ مجتبیٰ نے جن شخصیتوں پر خاکے لکھے ہیں ان کے پیشے، دل چسپیاں اور مشاغل مختلف ہیں۔ ان میں ادیب، شاعر، افسانہ نگار، نقاد، محقق، مصور، کلرک، عہدہ دار، شیخ و برہمن، حکیم، ڈاکٹر وغیرہ شامل ہیں۔ ان سب میں جو مشترک بات ہے وہ یہ کہ یہ سب کے سب مجتبیٰ کے دوست ہیں۔ اپنی دوستی کے بارے میں ''قصہ مختصر'' میں ایک جگہ وہ لکھتے ہیں:

''میں دوستوں کا رسیہ اور متوالہ ہوں۔ اپنے وقت کا بڑا حصہ دوستوں میں گنواتا ہوں۔''

اس کا ثبوت مجتبیٰ حسین کی خاکہ نگاری سے معلوم ہوتا ہے۔ ان کی دوستی ایک سالم شخص سے ہے، اس کی خوبیاں اور خامیاں دونوں شامل ہیں۔ ان کی دوستی میں بے غرضی، خلوص اور محبت کا دریا موجزن معلوم ہوتا ہے۔ اس لیے وہ اپنے دوستوں کی کمزوریوں سے بھی ویسا ہی پیار کرتے ہیں جیسا ان کی خوبیوں سے۔ صاحب خاکہ کی کمزوریوں اور کوتاہیوں کا ذکر کچھ اس بے ساختگی اور والہانہ انداز سے کرتے ہیں کہ قاری بھی کمزوریوں اور کوتاہیوں پر مسکرا کر رہ جاتا ہے۔

خاکہ نگار کو یہ احساس ہے کہ ''کسی کی جسمانی ساخت کا مذاق اڑانا، اچھے مزاح کا شیوہ نہیں۔'' اچھی خاکہ نویسی کا تقاضہ یہ ہے کہ شخص کے مکمل تعارف میں کوئی کمی نا رہ جائے۔ مجتبیٰ حسین نے خاکوں میں بعض جگہ ''جسمانی ساخت'' پر بھی بھرپور وار کیا ہے۔

مجتبیٰ کو واقعہ نگاری اور مرقع کشی میں کمال حاصل ہے۔ مجتبیٰ حسین کی تشبیہات اور استعاروں میں بڑی تازگی اور انفرادیت ہے۔ مجتبیٰ حسین کے خاکے طنز و تبسم والی چیز ہی نہیں، فکر و آگہی کا ایک دفتر بھی ہے، جس میں قاری اپنی شناخت بھی کر سکتا ہے اور زمانے کے الٹ پھیر کو ع سمجھ بھی سکتا ہے۔

مجتبیٰ حسین کے رخشِ قلم نے کسی ایک میدان کو اپنی جولان گاہ نہیں بنایا ہے۔ انھوں نے انشائیہ، خاکہ، سفرنامہ اور کالم نویسی میں بھی دوڑنا سیکھا ہے۔

اپنی مزاح نگاری کا آغاز روزنامہ سیاست حیدرآباد کے کالم شیشہ و تیشہ سے کیا۔ اس میں وہ کوہِ پیما کے نام سے لکھا کرتے تھے۔ 1965 سے خاکے لکھنا شروع کیا اور اب تک 200 سے زیادہ خاکے لکھے ہوں گے۔ ان کے خاکوں کا پہلا مجموعہ'' آدمی نامہ'' ہے۔ جس میں 15 شخصیتوں کی پہچان بتائی گئی ہے۔ ان کے خاکوں میں شخصیتوں کے نمایاں اوصاف کو پیش کیا گیا ہے۔ ان کے خاکوں کے اور تین مجموعے'' سو ہے وہ بھی آدمی'' ''چہرہ در چہرہ'' اور ہوئے ہم دوست جسکے'' بھی ہیں۔ مجتبیٰ نے یہ خاکے اپنی مرضی سے کم، اکثر فرمائشوں اور ضرورتوں پر لکھیں ہیں۔ مجتبیٰ نے شخصیتوں کے ظاہری قدوخال پر زور نہیں دیا، جتنا اندرون ذات پر دیا ہے۔ ان کی خاکہ نگاری کی خوبی یہ ہے کہ انھوں نے شخصیت کی خوبیوں اور خامیوں دونوں کو پیش کیا ہے۔ خامیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اس میں بھی حسن نظر آنے لگتا ہے۔ کسی کی کمزوری کا مذاق نہیں اڑایا بلکہ خاکہ کھینچا ہے۔ انھوں نے خاکوں میں کسی کی دل آزاری نہیں کی ہیں۔ ان کے یہاں جہاں مزاح ہے وہیں دردمندی اور دل سوزی بھی ہے۔ یہ دل سوزی ان کی شخصیت کا ایک اٹوٹ حصہ ہے جو انھیں بچپن نے دیا ہے۔ 1948 میں انھوں نے اپنے ماموں کو اپنی آنکھوں کے سامنے فسادات میں قتل ہوتے دیکھا۔ اس کے بعد ایک نیزہ ان کے گردن پر بھی رکھا گیا۔ پتہ نہیں کیوں وہ نیزے والا ہاتھ پیچھے سے کسی نے کھینچ لیا اور کہہ دیا اس معصوم بچے کو مارنے کا کیا فائدہ؟ یہی بچہ اپنے خاکوں میں اکثر خون سے آنسو رلاتا ہے۔

ان کے خاکوں میں حیدرآباد کو اس کی پوری آن بان، خوبیوں اور کمزوریوں کے ساتھ دیکھا جاسکتا ہے۔ حیدرآباد ان کی کمزوری بھی ہے اور ان کی طاقت بھی۔ ان کے خاکوں میں جذباتی وابستگی ہوتی ہے، کبھی ان کے خاکوں میں لطیفوں سے کام لیا جاتا ہے۔ یہ لطیفے عمومی نوعیت کے بھی ہوتے ہیں اور بعض سرزرد ہو جاتے ہیں۔ اچھے مزاح نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ طنز کو تیر بننے نہیں دیتے۔ ان کا طنز محبت بھری چٹکیاں ہوتا ہے۔ مجتبیٰ حسین کی خوبی یہی ہے۔

حواشی:

۱) وزیر آغا۔ اردو ادب میں طنز و مزاح

۲) ڈاکٹر قمر رئیس۔ اردو ادب میں طنز و مزاح کی روایت اور ہم عصر رجحانات

۳) مجتبیٰ۔ آدمی نامہ، سو ہے وہ بھی آدمی، چہرہ در چہرہ، ہوئے ہم دوست جس کے، آپ کی تعریف (انتخاب)، تکلف برطرف، قطع کلام، قصہ مختصر، بہر حال، بالآخر، جاپان چلو، الفرض، سفر لخت، آخر کار

۴) شگوفہ حیدرآباد۔ ہندوستانی طنز و مزاح نمبر

۵) نقوش لاہور۔ طنز وظرافت نمبر

قرۃ العین حیدر کا "ڈیرو یگ ڈیس ونڈز" (ہوا کا راستہ): قرۃ العین حیدر کا ایک ناول، اردو کے ممتاز افسانہ نگاروں میں سے ایک، جرمن میں ترجمہ کیا گیا۔
"دہلی: رومن" (دہلی: ایک ناول) از خوشونت سنگھ: دہلی کی ہنگامہ خیز تاریخ کو پیش کرنے والا ایک ناول، اصل میں خوشونت سنگھ نے انگریزی میں لکھا، جرمن میں ترجمہ کیا گیا۔

آج، اردو نثری شاعری کی روایت کو زندہ کرنے کی کوششیں کی جارہی ہیں، بہت سے ہم عصر شاعروں اور ادیبوں نے اپنے منفرد انداز میں اس کا جادو پھر سے جمانے کی کوشش کی ہے۔ یہ صنف برصغیر پاک و ہند کے ثقافتی ورثے کا ایک اہم حصہ بنی ہوئی ہے اور پوری دنیا کے سامعین کی حوصلہ افزائی اور تفریح کرتی رہتی ہے۔
ادبی دنیا میں اردو بیانیہ شاعری کی سب سے اہم شراکت یہ ہے کہ اس نے اردو زبان کو جس طرح سے تشکیل دیا ہے۔ اس صنف نے اردو کی ایک ایسی زبان کے طور پر ترقی میں اہم کردار ادا کیا جو فارسی اور عربی سے الگ تھی۔ اس نے نئے الفاظ، محاورات اور تاثرات کی ایک حد متعارف کروا کر زبان کو بھی تقویت بخشی۔

مزاحمتی ادب ادبی کام کی ایک صنف ہے جو جبر، سماجی ناانصافی، سیاسی انتشار، یا کسی بھی قسم کی نظامی بدسلوکی یا امتیازی سلوک کے جواب میں ابھرتی ہے۔ یہ مصنفین، شاعروں اور فنکاروں کے ذریعہ تخلیق کیا جاتا ہے جن کا مقصد اختلاف رائے کا اظہار کرنا، اتھارٹی کو چیلنج کرنا اور اپنی تحریری یا فنکارانہ تخلیقات کے ذریعے تبدیلی کی وکالت کرنا ہے۔ مزاحمتی ادب مختلف شکلیں لے سکتا ہے، بشمول ناول، مضامین، شاعری، ڈرامے، اور یہاں تک کہ بصری فنون، اور یہ پسماندہ یا مظلوم کمیونٹیز کو آواز دینے، بیداری کو فروغ دینے، اور سماجی یا سیاسی تبدیلی کو متاثر کرنے کا ایک ذریعہ ہے۔

مرزا سودا اٹھارویں صدی کے شاعر ہیں، اور ان کا زمانہ وہ ہے جب برصغیر میں مغل سلطنت زوال پذیر تھی۔ یہ دور سیاسی بے یقینی، سماجی زوال اور ثقافتی تبدیلیوں کا تھا۔ مغل حکومت کی کمزوریوں اور انگریزوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کے ساتھ، عوامی زندگی میں اضطراب اور کشمکش نے جنم لیا۔ سودا کی شاعری اس دور کے سیاسی، سماجی اور ثقافتی مسائل کا عکس پیش کرتی ہے۔

قتیل شفائی: برصغیر کے اہم ترین شاعر

سراج زیبائی
شیموگہ کرناٹک

قتیل شفائی کو اللہ نے ایسی تخلیقی توانائی سے نوازا تھا جس سے اردو ادب کا دامن مالا مال ہوتا رہا۔ آپ کے متحرک قلم نے ادب اور زندگی کو جو خوبصورتی بخشی ہے وہ ادب کے لئے ایک نعمت سے کم نہیں۔ قتیل شفائی کی عظمت خود ان کی خوش اخلاقی اور خوبصورت کردار کی آئینہ دار ہے۔ موصوف کی شاعری کو پڑھ کر ہمیں اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی شاعری امتزاجی شعریات سے پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ انھوں نے اپنے فکر وفن میں حد درجہ وسعت پیدا کی ہے جبھی تو ان کو برصغیر کے اہم ترین شعراء میں شمار کیا جاتا ہے۔ ان کی تقریبا" پوری شاعری میں حسن وعشق ان کا خاص موضوع رہا۔ قتیل صاحب نے اپنی شاعری کے دھارے کو رومانیت کی طرف موڑا۔ جس طرح اختر شیرانی، ساحر لدھیانوی، کیفی اعظمی وغیرہ کی شعری سرمستیاں مختلف شعری پیرائے میں جلوہ گر ہوتی ہیں۔ بالکل اسی طرح قتیل صاحب کے ہاں بھی یہ کیفیت دیکھنے کو ملتی ہے۔ قتیل شفائی رومانی تحریک کے روح رواں تھے۔ ان کا کینوس بہت وسیع تھا۔ ان کے فکر اور ان کی طرز تحریر کو کسی دائرے میں قید نہیں کیا جاسکتا۔

ہم ان کے شعری منظر نامے کا بغور مشاہدہ کریں گے تو ہمیں اس میں معانی در معانی کی تاثیر پذیری صاف نظر آئے گی۔ انھوں نے عشق کے موضوع پر نئے زاویے تراشے ہیں اور تغزل کا نیا روپ دھارا ہے اور نہایت خوبصورت ڈھنگ سے حسن وعشق کے رموز ونکات سے غزل کو آراستہ کیا ہے۔

قتیل شفائی کی پیدائش 1919 کو ہری پور پاکستان میں ہوئی۔ شروعات میں موصوف نے حکیم یحی خاں شفائی سے اپنے کلام کی اصلاح لی۔ اسی مناسبت سے شفائی کہلائے۔ بعد میں کچھ عرصہ احمد ندیم قاسمی سے بھی مشورہ سخن کیا۔

قتیل کی شاعری کی حقیقی تفہیم کے لئے ان کی زندگی اور شاعرانہ پس منظر پر ایک نظر ڈالنی چاہئے۔ ان کا گھرانہ مذہبی وادبی گھرانہ تھا۔ ایک مرتبہ کسی واعظ خوش بیاں نے حضرت امام حسین کے لئے "قتیل تیغ جفا" کی ترکیب استعمال کی۔ محمد اورنگ زیب (قتیل شفائی) نے جب یہ سنا تو یہ ترکیب انھیں بہت پسند آئی تب سے انہوں نے اپنا تخلص قتیل 'اختیار کرلیا۔

2۔ سب سے پہلے دیکھتے ہیں قتیل کے یہ اشعار جن میں ان کا مخلصانہ جذبہ محبت کس

سادگی سے ظاہر ہوا ہے۔

اپنے ہاتھوں کی لکیروں میں سجائے مجھ کو
میں ہوں تیرا تو نصیب اپنا بنالے مجھ کو
یہ معجزہ بھی محبت کبھی دکھائے مجھے
کہ سنگ تجھ پہ لگے اور زخم آئے مجھے
قتیل اب دل کی دھڑکن بن گئی ہے چاپ قدموں کی
کوئی میری طرف آتا ہوا محسوس ہوتا ہے

ان کے شعروں میں جذبات کی بے پناہ لہریں ہوتی ہیں۔ کہیں مدھم مدھم تو کہیں تیز۔ تنہائی اور محرومی کا احساس ان کے اشعار کا غالب رنگ ہوتا ہے۔ ان شعروں میں جذبات کے وفور نے بلا کا سوز و گداز بھر دیا ہے۔ انھوں نے اپنے شعروں میں اپنے جذبات و احساسات کی بھرپور ترجمانی کی ہے اور سارے ہی موضوعات پر شاعری کی ہے۔ اس میں تنوع اور رعنائی پیدا کر کے اپنی انفرادیت کا نقش قائم کیا ہے۔

فراق اور ہجر تو غزل کے بنیادی موضوعات ہوتے ہیں جنھیں شاعر اپنے طریقے سے شعری سانچے میں ڈھالتا ہے۔ جذباتی انداز میں کہے گئے یہ اشعار ملاحظہ ہوں جن میں آپ کو بلا کا سوز و گداز ملے گا۔

یوں لگے دوست ترا مجھ سے خفا ہو جانا
جس طرح پھول سے خوشبو کا جدا ہو جانا
کچھ کہہ رہی ہیں آپ سے سینے کی دھڑکنیں
میرا نہیں تو دل کا کہا مان لیجئے
وہ دل ہی کیا ترے ملنے کی جو دعا نہ کرے
میں تجھ کو بھول کے زندہ رہوں خدا نہ کرے
میں اپنے دل سے نکالوں خیال کس کس کا
جو تو نہیں تو کوئی اور یاد آئے مجھے
یوں تسلی دے رہے ہیں ہم دل بیمار کو
جس طرح تھامے کوئی گرتی ہوئی دیوار کو

اس طرح ان کا ہر شعر اپنا ایک منفرد وجود رکھتا ہے جو محبت و الفت کے حوالے سے اپنے نئے رنگ و روپ میں دکھائی دیتا ہے۔

3. قتیل نے اپنی شاعری میں جو طرز اظہار اور اسلوب اپنایا ہے وہ نہایت دلکش بھی ہے سحر انگیز اور اثر انگیز بھی۔ ان کے اشعار میں سوز و گداز کی کیفیت تغزل کا رنگ زبان و بیان کا خاص انداز اور مزاج کا والہانہ پن بھی نظر آتا ہے۔ ایک عام انسان کی بے چارگی و محرومی جب ایک شاعر کے فکر میں جذب ہو جاتی ہے تو وہ شعر کا روپ دھار لیتی ہے۔

موجودہ معاشرے کی سچائیوں کو ہم قتیل کی شاعری میں بآسانی تلاش کر سکتے ہیں۔ یہاں وہ دل کے ٹوٹنے بکھرنے کی داستان اس طرح بیان کرتے ہیں

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

ان کے ہاں غم کا تصور دیکھئے جو دوسروں کے غم کو اپنی ذات اور فکر کے ساتھ ہم آہنگ کرنے کا سلیقہ عطا کرتا ہے۔ کہتے ہیں

ستم تو یہ ہے کہ وہ بھی نہ بن سکا اپنا
قبول ہم نے کئے جس کے غم خوشی کی طرح
کیوں شریک غم بناتے ہو کسی کو اے قتیل
اپنی سولی اپنے کاندھے پر اٹھاؤ چپ رہو

اس طرح انھوں نے زمانے کی ستم ظریفیوں کو غزل کا لطیف پیکر عطا کیا اور زمانے کے دکھ درد کو اپنا دکھ درد سمجھ کر اپنی شاعری کے دامن میں اس طرح بھر لیا ہے

ہمیں تو آج کی شب پو پھٹے تک جاگنا ہوگا
یہی قسمت ہماری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

4. وہ میرا دوست ہے سارے جہاں کو ہے معلوم
دغا کرے وہ کسی سے تو شرم آئے مجھے

اپنی شاعری میں موصوف نے جو بھی الفاظ برتے ہیں وہ سب کے سب بالکل عام فہم اور سہل ہیں۔ مروجہ اور بالکل بول چال کے الفاظ کے استعمال سے شاعری کو خوبصورتی عطا کی ہے۔ ان کی شاعری میں ہمیں زندگی کی دھڑکنیں صاف سنائی دیتی ہیں۔ ان کے شعری مزاج میں صاف گوئی ہوتی ہے۔ شاعری کے ریشمی آنچل میں قتیل نے ویسے زندگی کے کئی موضوعات پیش کئے ہیں۔ ان میں حسن و عشق ان کا خاص موضوع رہا ہے۔ اس ضمن میں یہ چند اشعار ہیں جو ان کی وقعت و اہمیت کا تعین کرتے ہیں۔

حسن کو چاند جوانی کو کنول کہتے ہیں
ان کی صورت نظر آئے تو غزل کہتے ہیں
اف وہ مرمر سے تراشا ہوا شفاف بدن
دیکھنے والے اسے تاج محل کہتے ہیں
کیا جانے کس ادا سے لیا تو نے میرا نام
دنیا سمجھ رہی ہے کہ سچ مچ ترا ہوں میں
گنگناتی ہوئی آتی ہیں فلک سے بوندیں
کوئی بدلی تری پازیب سے ٹکرائی ہے

جب بھی آتا ہے مرا نام ترے نام کے ساتھ
جانے کیوں لوگ مرے نام سے جل جاتے
ہیں

حسن و عشق سے لبریز ایسے خوبصورت اشعار کہہ کر قتیل صاحب نے اپنی شاعری کو نئی فکر کے ساتھ انفرادیت عطا کی ہے۔

.5ان کے ہاں کہیں بھی سطحی یا عامیانہ قسم کا کوئی بھی شعر نہیں ملے گا۔قتیل کا طرز اظہار نہایت دل نشیں اور لہجہ نہایت نرم و ملائم ہوتا ہے۔ان کی ترکیبیں ایسی سیدھی سادی ہوتی ہیں کہ مفہوم فورا" ذہن نشین ہو جاتا ہے۔

وہی شاعری بڑی شاعری کے زمرے میں آتی ہے جس میں جذبات کے اظہار کے ساتھ سلیقہ ہو فنکاری ہو، نغمگی اور ترنم بھی۔

قتیل کی شعری کائنات پر جب ہم ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو اس میں ہمیں شکستہ دلوں کی آوازیں بھی سنائی دیتی ہیں۔

آیا ہی تھا ابھی مرے لب پر وفا کا نام
کچھ دوستوں نے ہاتھ میں پتھر اٹھا لئے
صدمہ تو ہے مجھے بھی کہ تجھ سے جدا ہوں میں
لیکن یہ سوچتا ہوں کہ اب تیرا کیا ہوں میں
ہمیں بھی نیند آجائے گی ہم بھی سو ہی جائیں گے
ابھی کچھ بے قراری ہے ستارو تم تو سو جاؤ

ان اشعار میں خیال و فکر کی ایک دنیا آباد دکھائی دیتی ہے۔یہ اس لئے کہ قتیل صاحب نے اپنے مشاہدے سے حاصل شدہ حقائق کو اپنی شاعری میں سلیقے سے اس طرح قلم بند کیا ہے کہ ان میں زندگی کی الجھنیں دکھائی دیتی ہیں۔

قتیل کو صرف اپنی ذات کی نہیں بلکہ سماج اور اپنے آس پاس کی بھی فکر لاحق تھی۔انہوں نے عوام کے مسائل کی بھی اپنی شاعری میں بھرپور نمائندگی کی تھی۔کہتے ہیں

کون اس دیس میں دے گا ہمیں انصاف کی بھیک
جس میں خوں خوار درندوں کی شہنشاہی ہے
دل سلگتا ہے ترے سرد رویے سے قتیل
دیکھ اس برف نے کیا آگ لگا رکھی ہے
ہو نہ ہو یہ کوئی سچ بولنے والا ہے قتیل
جس کے ہاتھوں میں قلم پاؤں میں زنجیریں ہیں

ان کے کلام میں درد کی کیفیت اور طنز کی لہر بھی دیگر شعراء کی بہ نسبت زیادہ ملتی ہے۔

کل کی بات اور ہے میں اب سا رہوں یا نہ رہوں
جتنا جی چاہے ترا آج ستا لے مجھ کو
قتیل اس بزم جاناں سے پڑا ہے واسطہ مجھ کو
سزا کا خوف رہتا ہے جہاں الزام سے پہلے
ٹوٹ گیا جب دل تو پھر سانسوں کا نغمہ کیا معنی
گونج رہی ہے کیوں شہنائی جب کوئی بارات نہیں
دنیا میں قتیل اس سا منافق نہیں کوئی
جو ظلم تو سہتا ہے بغاوت نہیں کرتا

قتیل صاحب نے اپنی غزلوں کو ایک نیا روپ آہنگ مزاج اور رنگ عطا کیا ہے۔

6۔کہتے ہیں

چلو اچھا ہوا کام آ گئی دیوانگی اپنی
وگرنہ ہم زمانے بھر کو سمجھانے کہاں جاتے
کیوں بخش دیا مجھ سے گنہگار کو مولا
منصف تو کسی سے بھی رعایت نہیں کرتا

غزلوں سے زیادہ قتیل صاحب کو ان کی نغمہ نگاری سے بے پناہ شہرت عطا ہوئی۔

بحیثیت گیت کار ان کی پہلی فلم "تیری یاد" تھی۔اس کے بعد سے ہندوستانی و پاکستانی بے شمار فلموں میں انہوں نے کامیاب نغمے لکھے۔پاکستانی موسیقار خواجہ خورشید انور کہتے ہیں کہ وہ اپنی دھنوں کے لئے قتیل شفائی کے نغمات کو اس لئے پسند کرتے تھے کہ انہوں نے کبھی اپنے معیار کا دامن نہیں چھوڑا۔

قتیل صاحب کی پہلی شعری تصنیف "ہریالی" تھی۔اس کے بعد تقریبا" 18 کتابیں شائع ہو کر مقبول ہوئیں۔ان میں سے برگد رنگ خوشبو آموختہ جلترنگ گجرا سمندر میں سیڑھی ابابیل روزن گفتگو گھنگھرو چھتنار پیراہن جھومر وغیرہ۔ان کے علاوہ مطربہ کو آدم جی ایوارڈ سے سرفراز کیا گیا۔

7۔قتیل نہ صرف فلموں کے حوالے سے مقبول ہوئے بلکہ ادبی دنیا میں بھی ان کا نام بڑے احترام سے لیا جائے گا۔وہ اس لئے کہ انھوں نے اپنی زندگی میں ہی ایک legend کا مقام حاصل کر لیا تھا۔

ڈاکٹر اسلم فرخی (انگریزی:Aslam Farrukhi)، (پیدائش:23 اکتوبر 1923ء- وفات:15 جون، 2016ء) پاکستان سے تعلق رکھنے والے نامور اردو نقاد، محقق، شاعر، سابق پروفیسر و چیئرمین شعبۂ اردو اور سابق رجسٹرار کراچی یونیورسٹی تھے۔ڈاکٹر اسلم فرخی صاحب کا شمار ملک کے ممتاز وہ استاد، شاعر، صاحب طرز نثر نگار، محقق، نقاد، بچوں کے ادیب اور ممتاز براڈ کاسٹر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ڈاکٹر اسلم فرخی نے براڈ کاسٹر کی حیثیت سے بھی بڑی خدمات انجام دیں۔

پیکرِ علم و عمل ؛ پروفیسر ہارون الرشید

(تاثراتی خاکہ)

محی الدین ہمدمؔ ۔ بنگلہ دیش

شاہ و گدا سے اپنے تئیں کام کچھ نہیں
نے تاج کی ہوس نہ ارادہ کلاہ کا

خواجہ میر دردؔ کا یہ شعر پروفیسر ہارون الرشید کے استغنا کی سچّی عکّاسی کرتا ہے۔ ڈھاکے میں اِس درویش صفت انسان کو جاننے والے آج بھی اُن کا نام احترام سے لیتے ہیں۔ وہ دُنیا میں رہتے ہُوئے بھی دُنیا سے کنارہ کش تھے۔ قلندرانہ طبیعت پائی تھی مگر نام نہاد صوفیوں سے بیزار تھے۔ اُن کی طرزِ زندگی دُنیا سے بے رغبتی اور دِین سے محبت کا نمونہ تھی۔ کسی سے مرعوب ہونا اُنہوں نے نہیں سیکھا تھا۔ کوئی شخصیت کتنی ہی اُونچی کیوں نہ ہو کوئی شخص خواہ کتنا ہی مالدار کیوں نہ ہو یہ اُس سے مِلتے وقت فدویانہ انداز اختیار نہیں کرتے تھے بلکہ کشادہ پیشانی سے اُس کا استقبال کرتے، گفتگو متانت اور سنجیدگی کے ساتھ کرتے اور اپنے وقار کو مجروح ہونے نہیں دیتے۔

پروفیسر ہارون الرشید ۳ر جولائی ۱۹۳۷ء کو بھارت کی ریاست مغربی بنگال کے شہر کولکاتا میں پیدا ہُوئے۔ اُنکا آبائی وطن ضلع غازی پور، ریاست اُتر پردیش، بھارت ہے۔ تقسیم ہند کے بعد اُن کے والد غلام حسین اُنہیں لے کر مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) چلے آئے۔ اُن کی والدہ قمر النساء تقسیمِ ہند سے قبل فوت ہو چکی تھیں۔ اُن کی تعلیم ڈھاکے میں ہُوئی۔ ڈھاکہ یونیورسٹی سے اُنہوں نے اردو میں ایم۔ اے کیا۔ مختلف کالجوں میں معلمی کے فرائض سرانجام دینے کے بعد جگن ناتھ کالج ڈھاکہ سے منسلک ہو گئے، غالباً ۱۹۸۴ء تک وہ اِسی کالج میں درس دیتے رہے۔ مجھے اچھّی طرح یاد نہیں ہے کہ ۱۹۸۴ء یا ۱۹۸۵ء میں اُنہوں نے دوسری ہجرت کی یعنی وہ ڈھاکہ سے کراچی چلے گئے۔ وہاں اورنگی ٹاؤن کے پرائیوٹ کالج "الحرا کالج برائے خواتین" میں بطور مدرس تعینات ہو گئے۔ ۱۹۹۶ء میں اُنہوں نے ریٹائیرمنٹ لے لی اور اپنی پوری توجہ تصنیف و تالیف پر مرکوز کر دی۔ وہ اردو زبان کے صاحب طرز ادیب، محقق اور شاعر تھے۔ ۱۹۶۸ء سے ۲۰۲۱ء تک اُن کی تصنیف کردہ ۳۴ علمی اور ادبی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔

ڈھاکے میں وہ تقریباً ۳۴ سال رہے۔ مجھ پر اُن کی خاص نظرِ عنایت تھی۔ قیامِ بنگلہ دیش کے بعد اردو زبان بنگلہ دیش سے غائب ہو گئی۔ اردو اخبارات، رسائل، اور جرائد کا بیرون ملک سے بنگلہ دیش میں آنا بند ہو گیا۔ کبھی کبھی کسی صاحبِ علم یا صاحبِ ذوق کے پاس کوئی کتاب یا رسالہ بذریعہ ڈاک آ جاتا تھا۔ ہارون صاحب کے پاس بھی ایک رسالہ دہلی سے آتا تھا۔ "سبحان الہند" شائد اِس رسالے کا نام تھا۔ یہ نیم مذہبی رسالہ تھا۔ اِس رسالے کو وہ مجھے دیتے اور کہتے کہ پڑھ کر بتانا کہ تمہیں کیسا لگا؟۔ دس پندرہ دِنوں کے بعد پھر مِلتے اور محبت بھرے لہجے میں دریافت کرتے کہ میں نے یہ رسالہ پڑھ لیا ہے یا نہیں؟ کونسا مضمون مجھے پسند آیا اور کیوں آیا؟ اُن کی یہ شفقتیں مجھے آج بھی یاد آتی ہیں اور میری آنکھیں نم کر جاتی ہیں۔

قیامِ بنگلہ دیش کے بعد اُن کی حالت وحشتؔ کلکتوی کے اِس شعر کی شرح بن کر رہ گئی تھی۔

مِلا کنجِ قفس مجھ کو نہ صحن، گلستاں مجھ کو
گرایا آسمانِ بے مروت نے کہاں مجھ کو

مکان چھِن گیا، گھر کا ساز و سامان برباد ہو گیا۔ جب تک ڈھاکہ میں رہے ذاتی مکان بنانے کی نوبت نہیں آئی۔ کرائے کے مکانوں میں کسی طرح زندگی بسر کی۔ مالی حالت بگڑنے لگی، دیگر پریشانیاں مستزاد مگر آفریں ہے اللہ کے اِس صابر و شاکر بندے پر کہ اُن کے پائے ثبات میں لغزش نہیں آئی۔ کلمہ شکر کے سوا زبان سے اور کچھ نہ نکلا۔ چہرے پر طمانیت کے احساس کے ساتھ ہلکی سی مسکراہٹ، سفید کرتا پاجامے میں ملبوس، سر پر سفید دو پلی ٹوپی پہنے، میانہ روی سے چلتے ہُوئے راہ میں مِلنے والے اپنے احباب اور شناساؤں سے وہ اتنی محبت سے مِلتے کہ مِلنے والے کو لگتا کہ مانو یہ محبت اُسی کے لیے خاص ہو۔ کم گو مگر شیریں سخن تھے۔ غیر ضروری باتوں سے پرہیز کیا کرتے تھے۔

کسی سائل کے سوال پر، اگر وہ سوال دینی علمی یا ادبی ہو تو سائل کی عمر اور اس کی ذہنی سطح کو مدِنظر رکھتے ہُوئے باصراحت جواب دیتے اور جب گفتگو کا آغاز کرتے تو جی چاہتا کہ وہ کہیں اور سُنا کرے کوئی۔ اُن کی گفتگو کا دِل موہ لینے والا انداز مجھے ابتک یاد ہے۔ اُن کے اندازِ گفتگو پہ ناطق لکھنوی کا یہ شعر پوری طرح چسپاں ہوتا ہے۔

زندہ کر دیتی ہے مُردوں کو بھی اس کی گفتگو
چند جملے یاد ہیں جس کو تری تقریر کے

ڈھاکے میں اُن کے قریبی رشتہ داروں میں صاحب حیثیت اور متمول لوگ بھی تھے مگر یہ اُن سے مِلنے مِلانے سے گریز کرتے تھے۔ میری تائی (اُنکی خالہ) زینت بیگم کے گھر اکثر جاتے تھے۔ وہیں اُن سے ملاقاتیں ہوتی تھیں۔ میری تائی کے کراچی چلے جانے کے بعد میں کلّو بھائی کی دکان پر اُن سے مِلتا رہا۔ گردشِ ایّام کے ہاتھوں

تنگ آنے کے بعد بھی وہ بجنگ آمد نہیں ہوئے۔ نہ ہی اپنی وضع داری میں فرق اور خودداری پہ حرف آنے دیا بلکہ مسکراتے ہُوئے میرؔ کا یہ مصرعہ دُہرا دیا کرتے تھے۔

؎ مقابلہ تو دِل ناتواں نے خوب کیا

دینی اور علمی رجحان اُنہیں فطرت نے ودیعت کی ہُوئی تھی۔ جیسا کہ وہ اپنی خود نوشت "زندگی نامہ" میں لکھتے ہیں "ہم سب بھائی بہن اپنی نانی کے یہاں مرلی بگان گئے ہُوئے تھے۔ میری عمر اُس وقت غالباً سات سال کی تھی۔ وہاں ایک ہندو دست شناس آیا کرتا تھا اور آواز لگا کر ایک پیسے میں ہاتھ دیکھتا تھا۔ ایک دن میری نانی نے اُسے گھر کے آنگن میں بُلا لیا اور آزمائش کے طور پر اُسے اپنا ہاتھ دکھاتے ہُوئے کہا: "دیکھو تو میرا بیٹا گھر سے ناراض ہو کر چلا گیا ہے، کب واپس آئے گا؟" دست شناس نے اُنکا ہاتھ دیکھتے ہُوئے کہا، "مائی! اس عمر میں کیوں جھوٹ بولتی ہیں۔ آپکا کوئی بیٹا نہیں صرف ایک بیٹی ہے۔" میری نانی نے اس کے بعد میرا ہاتھ دکھایا۔ میرا ہاتھ دیکھ کر اُس نے میری نانی سے کہا، "جس طرح ہمارے یہاں بڑے بڑے پنڈت ہوتے ہیں، اسی طرح یہ آپ لوگوں کا بڑا پنڈت ہوگا۔"

میں کیوں جھوٹ بولتی ہیں۔ آپکا کوئی بیٹا نہیں صرف ایک بیٹی ہے۔" میری نانی نے اس کے بعد میرا ہاتھ دکھایا۔ میرا ہاتھ دیکھ کر اُس نے میری نانی سے کہا، "جس طرح ہمارے یہاں بڑے بڑے پنڈت ہوتے ہیں، اسی طرح یہ آپ لوگوں کا بڑا پنڈت ہوگا۔" اُس ہندو جوتش کی بات سچ ثابت ہُوئی۔ مرحوم بلاشبہ ایک بلند پایہ عالمِ دین اور محقق تھے۔ مدرسے کی روایتی تعلیم نہ ہونے کے باوجود تفقہ فی الدین۔ نے میری نانی سے کہا" جس طرح ہمارے یہاں بڑے بڑے پنڈت ہوتے ہیں، اِسی طرح یہ آپ لوگوں کا بڑا پنڈت ہوگا"۔

اُس ہندو جوتش کی بات سچ ثابت ہُوئی۔ پروفیسر موصوف کی تعلیم روایتی مدرسوں میں نہ ہونے کے باوجود تفقہ فی الدین میں اپنی مثال آپ تھے۔ وہ اپنی پریشانیوں کا رونا نہیں روتے تھے۔ حتّٰی کہ اپنے قریبی رشتہ داروں سے بھی اپنے مصائب کا ذکر نہیں کرتے تھے۔ میں نے وجہ پوچھی تو مسکرا کر کہنے لگے "لوگ سمجھیں گے حُسنِ طلب ہے"۔ غیبت سے کوسوں دُور بھاگتے تھے۔ انتہائی نفیس اور پاک طینت انسان تھے۔ طہارت پسند تھے ہر طرح کی گندگی سے خود کو دُور رکھتے تھے۔

۸۰ کی دہائی کی بات ہے، اُس دَور میں بنگلہ دیش کے اردو شعرا میں ایک صاحب کا طوطی بول رہا تھا۔ شاعر وہ کیسے تھے اِس کا فیصلہ تو ناقدین کریں گے مگر وہ اپنی بُری حرکتوں کی وجہ سے بدنام تھے۔ ہارون صاحب اُس سے مِلنا پسند نہیں کرتے تھے۔ راستے میں اُسے دیکھ لیتے تو اپنی راہ بدل لیتے تھے۔ ہارون صاحب کے ایک انتہائی قریبی دوست بیان کرتے ہیں "ایک دِن میں اور ہارون صاحب کہیں جا رہے تھے کہ سامنے سے وہی مذکورہ شاعر آتا دکھائی دِیا۔ آس پاس کوئی گلی نہیں تھی جس میں داخل ہو کر ہارون صاحب اپنی راہ بدل سکیں۔ مجبوراً اُنہیں اُس شاعر سے مِلنا اور مصافحہ کرنا پڑا۔ اُس کے رخصت ہونے کے بعد ہارون صاحب نے مجھ سے کہا دیکھیے یہاں کہیں پانی مِلتا ہے یا نہیں؟ پھر ایک نلکے پر جا کر اپنے دونوں ہاتھوں کو اِس طرح رگڑ رگڑ کر دھویا جیسے کوئی گندگی لگی ہو"۔ میں سمجھتا ہُوں کہ اِس طرح اُن کا ہاتھوں کا دھونا اُن کی روحانی پاکیزگی کا فطری کا تقاضہ تھا۔ اُن کی خوبیوں میں ایک خوبی یہ بھی تھی کہ باصلاحیت لوگوں کی حوصلہ افزائی خوب کرتے تھے۔ کم اہلیت رکھنے والوں کا دِل رکھنا بھی اُنہیں آتا تھا۔ ایک دِن میں اُن کے ساتھ بونو گرام روڈ سے گزر رہا تھا۔ سامنے سے زبیر ارتضٰی آتے دِکھائی دِیے (زبیر ارتضٰی کسی زمانے میں جگن ناتھ کالج میں پڑھتے تھے اور ہارون صاحب کے شاگردوں میں تھے)۔ قریب آتے زبیر صاحب والہانہ انداز میں ہارون صاحب کی طرف لپکے اور گرمجوشی سے مصافحہ کیا۔ زبردستی قریب کے ریستوراں میں لے گئے۔ چائے اور سموسے کا آرڈر دِیا۔ جیب سے ایک کاغذ نکالا اور کہنے لگے یہ رباعی گزشتہ رات کہی ہے۔ سُنانے سے پہلے اچانک کھڑے ہو گئے اور کہا کہ جب تک ویٹر چائے وغیرہ لیکر آتا ہے مَیں بس یوں گیا اور یوں آیا۔ اُن کا گھر ریستوراں کے قریب تھا۔ اُن کے جانے کے بعد ہارون صاحب نے مجھ سے مسکرا کر کہا کہ اب یہ مجھے بیاض کی دھمکی دیں گے کہ نکالوں بیاض۔ چند منٹوں کے بعد وہ واپس آئے بغل میں بیاض دبائے ہُوئے۔ زبیر ارتضٰی کو مع بیاض دیکھ کر ہارون صاحب کی بات پوری طرح میری سمجھ میں آ گئی۔ پھر جو اُنہوں نے سُنانا شروع کیا تو سُناتے رہے، میں بور ہوتا رہا۔

ہارون صاحب صبر و سکون کے ساتھ سُنتے رہے۔ گاہے بگاہے داد بھی دے دیتے تھے۔ بعض اشعار کی اصلاح کی۔ اُن کی حوصلہ افزائی کرتے ہُوئے کہا اچھا شعر کہتے ہیں۔ زبیر ارتضٰی ہارون صاحب کے اِس جملے بطور سند استعمال کرتے تھے۔

دوستوں کی محفل میں فخریہ کہتے تھے ہارون صاحب نے میرا کلام سُن کر کہا تھا کہ اچھا شعر کہتے ہیں۔ ظہر کی اذان ہُوئی تو زبیر صاحب نے اپنے گھر کی راہ لی، مَیں اور ہارون صاحب مسجد کی طرف روانہ ہُوئے۔ وہ شگفتہ بیاں بھی تھے، اُن کی شگفتہ بیانی شائستگی اور شستگی سے مِل کر بنی تھی۔ ایک بار میں اور ہارون صاحب ساتھ تھے کہ ایک پرندے نے اُن کے سر پر بیٹ کر دی جو اُن کی ٹوپی پر آ کر گری میں نے کہا پرندے نے آپ کے ٹوپی پر بیٹ کر دِی ہے لائیے میں صاف کر دُوں۔

حسبِ عادت مسکرا کر کہنے لگے یہ تو اُوپر سے نزول ہُوا ہے اِس لیئے میں

خود ہی صاف کروں گا اور اپنی ٹوپی خود صاف کی۔ ایک دِن کی بات ہے کہ لاؤڈ اسپیکر پر بنگلہ فلمی نغمہ بج رہا تھا۔ گانے کے بول تھے" سلامِ محبت قبول کورو" ہارون صاحب ازراہ تفنن مجھ سے کہنے لگے" اگر یہی بنگلہ زبان ہے تو آپس میں اتنی رنجش کی کیا ضرورت تھی۔ تھوڑی سی کمی بیشی کر کے اِسے پاکستان کا قومی زبان بنادِیا جاتا۔ قومی زبان ایک ہی رہتی۔ اردو بولنے والے کہیں گے سلامِ محبت قبول کرو۔ بنگلہ بولنے والے کہہ رہے ہیں سلامِ محبت قبول کورو۔ فرق معمولی سا ہے"۔ ایک بیٹھک خانے کا تذکرہ کرنا دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ جہاں باقاعدہ نشست ہوتی تھے۔ اِس مجلس کے میر مجلس ہارون صاحب ہوتے تھے۔ یہ نشست ہارون صاحب کے بھانجی داماد کلّو بھائی کے ورکشاپ میں ہوتی تھی۔ یہ آٹو رکشا کے باڈی بنانے کا ورکشاپ تھا۔ ہارون صاحب تقریباً ہر روز وہاں آیا کرتے تھے۔ اُن کی آمد سے قبل ہی کچھ لوگ اُن سے مِلنے کے خاطر وہاں چلے آتے تھے اور اُن کی آمد کے انتظار میں وہاں بیٹھے رہتے تھے۔ جِن میں مَیں بھی شامِل تھا۔ وہاں باقاعدہ آنے والوں میں عبدالمجید پاشا صاحب (سابق لیکچرار ڈھاکہ یونیورسٹی وسابق ہیڈ ماسٹر عزیزیہ اسلامیہ ہائی اسکول ڈھاکہ)، خادمی صاحب (یہ غالباً وکیل تھے) ادریس (کلّو بھائی کے دوست) اور بھی دیگر حضرات تھے۔ سیاسی اور دینی موضوعات کے علاہ معاشی مسائل پر گفتگو ہوتی۔ شعروادب کی باتیں ہوتیں۔ کبھی اُن کا کوئی شناسا یا دوست اُنہیں وہاں بیٹھے دیکھ کر حیرانی سے پوچھتا" آپ یہاں؟" جواب میں وہ مسکرا کر یہ مصرعہ پڑھ دِیا کرتے تھے ؎

بیٹھ جاتا ہُوں جہاں چھاؤں گھنی ہوتی ہے

چوں کہ مختلف الخیال لوگ وہاں جمع ہوتے تھے اِس لیے کبھی کبھار آپس میں نوک جھونک بھی ہوجایا کرتی جِسے ہارون صاحب اپنی نرم گفتاری سے کام لیکر بڑی آسانی سے سُلجھادِیا کرتے تھے۔ ایک واقعہ مجھے یاد آتا ہے جب ادریس اور پاشا صاحب میں تلخ کلامی ہوگئی تھی۔ معمول کچھ ایسا تھا کہ وہاں آنے والوں میں ادریس سب سے پہلے یعنی وہ ہارون صاحب کے آنے سے پہلے ہی وہاں آکر بیٹھ جاتے تھے۔ پاشا صاحب سب سے آخیر میں، وہ اکثر ہارون صاحب کے آنے کے بعد آتے تھے۔ وہاں جو لوگ اکھٹّے ہوتے تھے وہ اپنے ساتھ سوالوں کا پلندہ لیے ہوتے تھے۔ ہارون صاحب کے بیٹھنے کے کچھ دیر بعد ہی سوال وجواب کا سلسلہ شروع ہوجاتا تھا۔ یہ سوالات زیادہ تر مذہبی اور معاشرتی مسائل پر مبنی ہوتے تھے۔ ہارون صاحب سبھی سوالوں کے تسلّی بخش جواب دیتے تھے۔

پاشا صاحب کی عادت تھی وہ اپنے آنے کے پندرہ، بیس منٹ کے بعد ہی ہارون صاحب سے کہنا شروع کردیتے کہ آیے چلتے ہیں۔ آدھے گھنٹے کے اندر وہ ہارون صاحب کو اپنے ساتھ لیکر وہاں سے چل دیتے۔ یہ بات ادریس کو ناگوار گزرتی تھی۔ ایک دِن محفل جمی ہُوئی تھی ہارون صاحب اپنے سامعین سے کسی مسئلے پر خطاب کررہے تھے کہ پاشا صاحب اپنے معمول کے مطابق وہاں آگئے۔ ادریس نے اُنہیں دیکھتے ہی کہا کہ لیجیے کھونچڑ آگئے۔ اب یہ ہارون صاحب کو یہاں سے لے جائیں گے۔ پاشا صاحب نے ادریس کے اِس ریمارک کو اپنے لیے توہین سمجھا۔ ہارون صاحب سے اِس کی شکایت کی۔ ہارون صاحب نے دوسرے دِن ادریس کو بڑے مشفقانہ لہجے میں سمجھاتے ہُوئے کہا آپ نے پاشا صاحب کے لیے نازیبا لفظ استعمال کیا ہے، یہ درست نہیں ہے۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ، شریف النفس انسان ہیں۔ ادریس نے جواباً کہا ہم آپ کے لیے یہاں آتے ہیں۔ آپ کے انتظار میں بیٹھے رہتے ہیں کہ آپ کی باتیں سُنیں آپ سے باتیں کریں۔

پاشا صاحب آتے ہیں اور آپ کو ساتھ لیکر چلے جاتے ہیں۔ اِسی دوران پاشا صاحب وہاں آگئے، ادریس نے بڑے محبت بھرے انداز میں اپنے نازیبا ریمارک پر اُن سے معذرت کرلی۔ پاشا صاحب خوش ہوگئے۔ کئی دِنوں کے بعد ادریس نے پاشا صاحب سے درخواست کی کہ وہ اُن کی بچّی کو جو اُس وقت غالباً ہائی اسکول میں پڑھتی تھی انگریزی پڑھادِیا کریں۔ پاشا صاحب تیار ہوگئے۔ ادریس خوش، پاشا صاحب بھی خوش۔ اِس طرح اُس مجلس کے شرکاء پھر سے باہم شیر وشکر ہوگئے۔ ادریس اِس دُنیا میں نہیں رہے۔ پاشا صاحب ۱۹۹۶ء میں پاکستان چلے گئے۔ ابھی وہ کہاں ہیں کس حال میں ہیں مجھے نہیں معلوم۔ اللہ اُنہیں اپنی عافیت میں رکھے۔

دست شناسی میں ہارون صاحب کو دسترس حاصل تھا، قیافہ شناس بھی تھے۔ لگ بھگ چالیس سال پہلے میرا ہاتھ دیکھ کر اُنہوں نے میری طبیعت، میرے رجحانات، اور میرے مستقبل کے بارے میں جو کچھ کہا تھا، اُن میں تقریباً ۸۰ فیصد باتیں سچ نکلیں۔ اُن کی قیافہ شناسی کا ایک واقعہ یاد آتا ہے۔ کلّو بھائی کی دکان پر ہارون صاحب، مَیں، کلّو بھائی، ادریس اور بھی کئی لوگ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ دُکان کے سامنے غیر بنگالی ہندوؤں کی ایک چھوٹی سی قدیم بستی ہے۔ اِس بستی میں ایک بارات آئی ہُوئی تھی۔ بیس، پچیس لوگ ہوں گے۔ عورتیں بھی تھیں۔ سات، آٹھ جوان لڑکے ایک ہی طرح کے کپڑے پہنے ہُوئے تھے۔ سہرا کسی کے سر پر نہیں تھا۔ ہم اندازہ لگانے کی کوشش کررہے تھے کہ اِن میں دولہا کون ہوسکتا ہے۔ ہارون صاحب نے ایک لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہُوئے کہا کہ یہی دُولہا ہوسکتا ہے۔ میں نے کہا یہ آپ کس بنا پر کہہ رہے ہیں؟ اُنہوں نے کہا کہا کہ اِن جوان لڑکوں کے بیچ یہی لڑکا شرمایا شرمایا سا لگ رہا ہے۔ بعد میں ہمیں معلوم ہُوا کہ ہارون صاحب کا اندازہ صحیح تھا۔

روحانیت کے قائل تھے، ساتھ ہی روحانی ترقی کے لیے تزکیہ نفس لازمی قرار دیتے تھے۔ اُنہیں ایسے اُستاد کی تلاش تھی جو سلوک کی منزلیں طے کرنے میں اُن کی رہنمائی کر سکے۔ اُن کی کوشش رائگاں گئی اُنہیں ایسا مرشد نہ مِل سکا۔ ایک بار مجھ سے کہنے لگے کہ میں چاہتا ہُوں کہ کسی اللہ والے کے ہاتھ پر بیعت کرلوں مگر اب تک مجھے ایسا ولی کامل نہیں مِل سکا کہ جس کے ارادتمندوں میں، مَیں شامِل ہو جاؤں۔ اپنی خودنوشت "زندگی نامہ" میں لکھتے ہیں "مصطفیٰ حسن صاحب کی بڑی خواہش تھی کہ میں اُنکا مرید بن جاؤں لیکن میں پیری مریدی کا کچھ زیادہ قائل نہ تھا"۔ اُن کے پیری مریدی کے کچھ زیادہ قائل نہ ہونے کی وجہ موجودہ دَور کے پیرانِ طریقت کے غیر شرعی اعمال ہیں۔ نام نہاد صوفیوں کی ریاکاری سے وہ سخت نالاں تھے۔ کہا کرتے تھے یہ خود گمراہ ہیں مریدوں کو کیا خاک ہدایت دیں گے۔ یہ تو بس جیب بھرو پیر ہیں۔ اُن کے کسی پیر کے دست پر بیعت نہ کرنے کی میرے خیال سے دو وجہیں تھیں۔ پہلی وجہ اُنکی خداپرستی اور دوسری وجہ اُنکی نازک مزاجی۔ ایک واقعے کا ذکر کرتا چلوں جو ہارون صاحب نے مجھ سے بیان کیا تھا تاکہ بات پوری طرح سمجھ میں آجائے۔

ڈھاکہ شہر کے ایک علاقہ نارندہ میں ایک پیر صاحب رہتے تھے جو نارندہ پیر کے نام سے مشہور تھے۔ اُن کی خانقاہ سے متصل ایک مسجد بھی ہے جو نارندہ پیر کی مسجد کہلاتی ہے۔ ہارون صاحب جمعہ کی نماز ادا کرنے ایک بار اُسی مسجد میں چلے گئے اور اگلی صف میں جا کر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد پیر صاحب مسجد کے اندر داخل ہُوئے۔ اُنہیں دیکھ کر مسجد میں نماز ادا کرنے آئے ہُوئے لوگ اُن کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو گئے۔ ہارون صاحب اپنی جگہ پر بیٹھے رہے۔ پیر صاحب اُنہیں گھور گھور کر دیکھتے رہے۔ شائد وہ (پیر صاحب) دِل میں سوچ رہے ہوں کہ یہ کون بے ادب چلا آیا ہے جو مجھے دیکھ کر بہر تعظیم کھڑے ہونے کے بجائے بدستور بیٹھا ہُوا ہے۔ میں سمجھتا ہُوں کہ یہ ہارون صاحب کی خداپرستی تھی جس نے اُنہیں مسجد کے اندر غیر اللہ کی تعظیم کے لیے کھڑے ہونے سے مانع رکھا۔ دوسری وجہ یہ ہوسکتی ہے کہ وہ زندگی بھر درس وتدریس کے پیشے سے وابستہ رہے۔ طلباء اور اُن کے شاگرد اُنہیں دیکھ کر کھڑے ہو جایا کرتے تھے۔ شائد اُن کی انانیت نے گوارا نہ کیا ہو کہ وہ پیر کو دیکھ کر اُس کی تعظیم کے لیے کھڑے ہو جائیں۔ غالباً ایسے ہی نازک مزاج لوگوں کے لیے خواجہ میر دردؔ نے یہ شعر کہا ہوگا۔

زاہد اگر نہیں کی تُو نے کسو سے بیعت
پیر مغاں کہاں، کر دست سبو سے بیعت

جب مجھے خبر مِلی کہ وہ کراچی چلے جائیں گے میں بہت اداس ہو گیا۔ ان کے چلے جانے کے بعد میں کئی مہینے تک افسردہ رہا۔ اُن کی کمی ستاتی رہی اُن کی یاد آتی رہی۔ ایک امید تھی کہ اللہ تعالیٰ مجھے کراچی لے جائے تو اُن سے ملاقات ہو جائے گی۔ مگر ایسا نہیں ہُوا مَیں پاکستان نہیں جا سکا اور وہ ۲۶ جنوری ۲۰۲۲ء کو اس دارِفانی سے کوچ کر کے خالق حقیقی سے جا مِلے، جنت مکانی ہو گئے۔ اللہ اُن کے درجات کو بلند فرمائے، آمین۔ اُن کی یاد اب بھی آتی ہے اور ملول کر جاتی ہے

دِل سے تو نکلے نہیں نظروں سے اوجھل ہو گئے
ہم نشیں دیکھے ہُوئے اُن کو زمانہ ہو گیا
ٹیس سینے میں اُٹھی آنکھیں بھی پُرنم ہو گئیں
یاد آنا اُن کا دِل پر تازیانہ ہو گیا

(راقم الحروف)

ہارون صاحب ایک متبحر عالم دین اور کثیر التصانیف مصنف تھے۔ اُن کی مطبوعہ اور غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست پیش کر رہا ہُوں۔

اردو ادب۔ جائزے، تنقید اور تاریخ

۱۔ اردو ادب اور اسلام (جلد اول)
۲۔ اردو ادب اور اسلام (جلد دوم)
۳۔ اردو کا دینی ادب
۴۔ اردو کا دینی ادب (دوسرا ایڈیشن مع ترمیم واضافہ)
۵۔ اردو کا جدید نثری ادب (تاریخ و تنقید)
۶۔ جدید اردو شاعری (تاریخ وتنقید)
۷۔ اردو کا قدیم ادب (تاریخ وتنقید)
۸۔ اسلامی ادب (مختصر تاریخ)
۹۔ اردو نعت گوئی کا تنقیدی جائزہ (قرآن کی روشنی میں)
۱۰۔ چند معاصر قلم کار
۱۱۔ فکر وفن (تنقیدی مضامین)

دبستانِ مشرق (سابق مشرقی پاکستان میں اردو ادب)

۱۔ محفل جو اُجڑ گئی (تاریخ وتذکرہ)
۲۔ دو ہجرتوں کے اہلِ قلم (تاریخ و تذکرہ)
۳۔ نوائے مشرق (تاریخ وتذکرہ)
۴۔ سرگزشتِ آصف (علامہ آصف بنارسی۔ شخصیت وشاعری)

دینی اور فکری جائزے

۱۔ ملّتِ واحدہ (عالمی سیاسی تناظر میں ملّتِ اسلامیہ کا جائزہ)
۲۔ نیاز فتح پوری کے مذہبی افکار
۶۔ غلام احمد پرویز کے افکار (بے لاگ جائزہ)
۷۔ ایک گمنام دینی محقق (محمد عثمان قریشی مرحوم)

۳ تحقیق واجتہاد (برصغیر کے سات محقق علما کے افکار کا جائزہ)
۴۔ دین و دانش (۲۰ علمی کتابوں کا تجزیاتی مطالعہ)
۵۔ ہمارا معاشرہ اور اسلام

۸۔ فغانِ درویش (تاثراتی مضامین)
۹۔ باتیں ہماری (تاثراتی مضامین)

شاعری

۱۔ طوبیٰ (حمد، نعت، منقبت)
۲۔ متاعِ درد (سقوط ڈھاکہ کے حوالے سے شعری مجموعہ)
۳۔ نقوش سارے (کلیات)
۴۔ منقبت صحابہ کرامؓ
۵۔ سوغات (بچّوں کے لیے نظمیں)
۶۔ نوائے پریشاں (اشعار)

ناول، خودنوشت اور ڈائری

۱۔ اپنے لہو کی آگ میں (ناول)
۲۔ منزل ہے کہاں تیری (ناول)
۳۔ منزلِ مراد (ناول)
۴۔ زندگی نامہ (خودنوشت)
۵۔ لاک ڈاؤن کے روز و شب (ڈائری)

اُن کی غیر مطبوعہ کتابوں کی فہرست پیش خدمت ہے۔

۱۔ دبستانِ مشرقی پاکستان (تاریخ و تذکرہ) (مرتب؛ زاہد رشید)
۲۔ اردو افسانہ۔ ایک تنقیدی جائزہ
۳۔ اردو تحقیق وتنقید۔ ایک جائزہ
۴۔ لاشریک لہ (حمدیہ مجموعہ)
۵۔ دبستانِ مشرقی پاکستان کے فکشن نگار (مرتب: زاہد رشید)
۶۔ پاکستان کا سیاسی نظام
۷۔ ہمارا معاشرہ اور اسلام (اضافہ و ترمیم کے ساتھ نیا ایڈیشن)
۸۔ نشانِ منزل (نظمیں)
۹۔ رنگِ چمن (ڈائری)
۱۰۔ باتیں ہماری (ڈائری)
۱۱۔ نقوشِ جاوداں (تذکرہ و انتخاب)
۱۲۔ عنایت نامے (خطوط) (مرتب: پروفیسر ہارون الرشید)
۱۳۔ شعیب عظیم کے خطوط (مرتب: پروفیسر ہارون الرشید)
۱۴۔ اردو ادب اور اسلام (مکمل ایک جلد میں، اضافہ و ترمیم شدہ)
۱۵۔ دو ہجرتوں کے شعرا (تذکرہ و شعری مجموعے پر تبصرے)
۱۶۔ متاعِ عزیز (مضامین)

پروفیسر موصوف کی شخصیت علم و عمل کا ایک حسین امتزاج تھی۔ جہاں وہ اپنے علمی وجدان سے ذہن سازی کا کام کرتے تھے وہیں اپنے حسن سلوک سے لوگوں کے دِلوں میں گھر کر جاتے تھے۔ وہ منبع رشد و ہدایت تھے جس سے بہت لوگ سیراب ہُوئے۔ راقم الحروف نے بھی اُن سے بہت کچھ سیکھا ہے اُن سے رہنمائی حاصل کی ہے۔ اللہ تعالیٰ اُنہیں غریق رحمت کرے۔ آمین

جدید اردو کہانیاں محبت کے روایتی موضوعات سے نکل کر مختلف معاشرتی اور نفسیاتی مسائل پر بھی توجہ دیتی ہیں۔ جدید اردو ادب میں شہری زندگی کے مسائل، ذہنی تناؤ، انسانی نفسیات، اور سماجی دباؤ جیسے موضوعات کو بیان کیا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، انور سن رائے کی کہانیاں انسانی نفسیات اور جدید زندگی کے پیچیدہ مسائل کو موضوع بناتی ہیں۔ وہ کہانیوں میں محبت کی روایتی تصویر کشی کے بجائے انسان کی تنہائی، بے چینی، اور ذہنی انتشار کو بیان کرتے ہیں۔

انتظار حسین (پیدائش: 21 دسمبر، 1925ء - وفات: 2 فروری، 2016ء) اردو کے ایک ناول نگار، افسانہ نگار اور تنقید نگار تھے، انھوں نے ایک داستان اور آپ بیتی طرز پر دو کتابیں لکھیں۔ حکومت فرانس نے ان کو ستمبر 2014ء میں آفیسر آف دی آرڈر آف آرٹس اینڈ لیٹرز عطا کیا۔ انتظار حسین کا انتقال 2 فروری 2016ء کو 92 سال کی عمر میں لاہور کے ایک ہسپتال میں ہوا۔

1886ء میں سر سید احمد خاں نے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے نام سے ایک ادارے کی بنیاد رکھی گئی۔ مسلم قوم کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے افراد کی فراہمی میں اس ادارے نے بڑی مدد دی اور کانفرنس کی کارکردگی سے متاثر ہو کر مختلف شخصیات نے اپنے اپنے علاقوں میں تعلیمی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ لاہور میں اسلامیہ کالج کراچی میں سندھ مدرسۃ الاسلام، پشاور میں اسلامیہ کالج اور کانپور میں حلیم کالج کی بنیاد رکھی۔ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس مسلمانوں کے سیاسی ثقافتی معاشی اور معاشرت حقوق کے تحفظ کے لیے بھی کوشاں رہی۔

اردو ادب میں ڈرامائی کاموں کی ایک تاریخ و روایت ہے جو صدیوں جاری ہے۔ اردو ادب میں "اصلاح شدہ ڈرامے" کی اصطلاح عام طور پر ایسے ڈراموں اور تھیٹر کے کاموں کو کہتے ہیں جن میں تبدیلیاں یا اختراعات ہوئی ہیں، جو اکثر سماجی، ثقافتی یا ادبی تبدیلیوں کی عکاسی کرتے ہیں۔ اردو ادب میں اصلاحی ڈراموں کی چند قابل ذکر مثالیں یہ ہیں

اجمیر کے چند نامور شعراء

ڈاکٹر فرخندہ ضمیر
ایسوسی ایٹ پروفیسر، ارباب مینشن، اجمیر، راجستھان

جن کی تابانی مہ انجم سے لیتی ہے خراج
اب بھی وہ ذرے غبار خاک اجمیر میں ہیں

اجمیر ایک تاریخی اور روحانی شہر ہے۔ یہاں حضور غریب نوازؒ کے مبارک قدموں کی آمد سے فارسی شاعری کیداغ بیل پڑی۔ اکبر اعظم سے لے کر جہانگیر، شاہ جہاں اور کئی مغل سلاطین غریب نواز کے معتقد تھے۔ انھوں نے اکبری قلعہ میں شعر وسخن کی محفلیں منعقد کیں۔

خواجہ غریب نوازؒ کا فارسی دیوان 1871ء میں منشی نول کشور پریس کا چھپا ہوا دستیاب ہے۔ آستانۂ عالیہ کے ماہر آپ کی لکھی ہوئی ایک رباعی جعلی حروف میں کندہ ہے جو بہت مشہور ہے۔

شاہ است حسین، بادشاہ است حسین
دین است حسین، دین پناہ است حسین
سر داد نداد دست در دست یزید
حقا کہ بنائے لاالہ است حسین

آپ کے سلسلہ کے بزرگ اور معتقدین کی وجہ سے اردو زبان کے اثرات اجمیر تک پہنچ گئے اور آہستہ آہستہ اردو زبان تعمیر وتشکیل کے ارتقائی منازل طے کرتی رہیں جو اس زمانے میں ہندی یا ہندوی کہلائی۔ آخر کار اس نے اردو کی شکل اختیار کر لی۔ جب ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی زیر اختیار آئی تو اس نے اجمیر میں بھی 1836ء میں ایک سرکاری مدرسہ کھولا گیا۔

غرض یہ کہ ہر محکمہ میں اردو زبان کا کام کاج شروع ہوگیا۔ لہٰذا اردو دانوں کو جو نوازا گیا اور اردو کی ترقی وترویج پر دھیان دیا گیا۔ 1870 کے بعد تو باقاعدہ دفاتر میں اردو رائج ہو چکی تھی۔ اس میں اجمیر کے بزرگوں نے اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی اور غدر کے بعد سے اردو میں کتابیں لکھنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ تحقیق کے مطابق اجمیر کا پہلا اردو شاعر شیخ دانیال ہیں جنھوں نے عہد اکبری میں خواجہ صاحبؒ کی یہ شان میں شعر کہا تھا۔

جگ جگ جیویں حضرت خواجے
حضرت نبی رسول نواجے

اجمیر میں سب سے پہلا مشاعرہ 1875ء میں ہوا جو ایک پنجابی درویش پنج شاہ نے کروایا تھا۔ 1861ء میں اردو پریس قائم ہوا اور اس سال ہفت روزہ اخبار ''خیر خواہ خلق'' جاری ہوا۔ 1926ء میں رسالہ ''کی'' نکلنے لگا۔ مشاعرے اور ادبی جلسے ہوئے۔ خواجہ صاحب کے عرس کے موقع پر مشاعرے ہوتے رہے ہیں جو آج تک ہوتے ہیں۔

1868ء میں اجمیر کے انٹرمیڈیٹ کالج میں اردو کی تعلیم جاری کر دی گئی۔ معینیہ اسلامیہ ہائر سکنڈری اسکول نے اردو کے بلند پایہ شاعر پیدا کیئے اور تصنیف وتالیف کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ 1887ء میں مولانا عبدالصمد صاحب کلیم نے مثنوی صمصام الاسلام لکھی۔ 1908ء میں سید عبدالبشر کی تصنیف گلدستہ تاج شائع ہوئی۔ میر احدی کی تصنیف ''خواجہ معین اجمیری''۔ عرش اجمیری کا ناول ''عرب کا چاند'' وغیرہ۔

غدر کے بعد جن بزرگوں نے کشت اردو کی آبیاری کی ہے، ان میں دیوان امام الدین اثر، میر کرامت علی خلش، مولانا عبدالباری معنی، عرش اجمیری، اور پروفیسر حمید اللہ خاں عرشی، مکٹ بہاری تاج، خنجر، کلیم وغیرہ۔ رائے بہادر شیونرائن شیدا، (شاگرد غالب) کا اصل وطن اجمیر ہی تھا۔

یہاں انجمن ترقی اردو کی شاخ کے علاوہ بزم معنی، بزم سلام وغیرہ ادبی انجمنیں قائم کی گئیں۔

عرش اجمیری

عرش اجمیری کا کلام پرانے اساتذہ کی میراث ہے۔ آپ قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ کی ایک تصنیف ''الہامات'' دستیاب ہے جو 1929ء کی ہے۔ ان کی غزل کے چند اشعار پیش ہیں۔

کوئی سنے نہ سنے مجھ سے داستاں میری
زبانِ حال ہے اب آبِ ترجماں میری
مٹا گئی خلش مرگ ناگہانی میری
کہ خاک چھوڑ گئی زیرِ آسمان میری

اثر اجمیری

اثر اجمیری دیوان سید شاہ خواجہ امام الدین خاں صاحب اثر چشتی اجمیری آپ کی پیدائش 25 ستمبر 1847ء کو اجمیر شریف میں ہوئی۔ آپ کے والد صاحب قاضی سید خواجہ منیر الدین صاحب چشتی تھے۔ آپ کو عربی وفارسی پر اعلیٰ درجہ کی استعداد تھی۔ جس کا اندازہ آپ کی تصنیف ''معین الاولیا'' سے بخوبی ہوسکتا ہے۔

آپ نے اجمیر میں ہی تعلیم حاصل کی اور مولوی حکیم حسن صاحب امروہوی سے بھی

استفادہ حاصل کیا۔ آپ اجمیر میں تحصیل داری کے معزز عہدہ پر فائز تھے۔ گورنمنٹ برطانیہ کی طرف سے 1908ء میں مبلغ دوسو روپیہ کی پنشن مقرر کی گئی۔

امام الدین خاں اثر مرزا غالب کو اوران کی وفات کے بعد میر مظفر حسین شوخی کو اپنا کلام دکھاتے تھے۔ 1920ء میں ریاست بالن پور کی جانب سے کلام کا کچھ حصہ ایک دیوان کی صورت میں شائع ہوا۔ چند اشعار:

وصل کی خواہش وفا کا حوصلہ جاتا رہا
دل لگانے کا مزہ او بے وفا جاتا رہا
اے اثر دل کے چلے جانے کا کیا اتنا ملال
ایک دن جاہی تھا جاتا رہا جاتا رہا
وہی ہم ہیں وہی دل ہے وہی دردِ جدائی ہے
نہ جیتے ہیں نہ مرتے ہیں غضب میں جان آئی ہے
دیا بھی تو دیا کس بے وفا کو دل اثر تم نے
تمام اجمیر میں مشہور جس کی بے وفائی ہے

درگاہ حضور غریب نواز کی وجہ سے یہاں اردو زبان وادب کو ترقی ملی۔ کئی ادباء، شعراء یہاں آتے رہے اور شعر وسخن کی محفلیں سجتی رہیں۔ اثر اجمیری صاحب خانوادے سے تعلق رکھتے تھے اس لیے وہ شعر وسخن کی بزم آرائیوں کے دلدادہ تھے۔ اجمیر میں نعتیہ مشاعرے اس دور سے لے کر آج تک ہوتے رہتے ہیں۔

اثر اجمیری صاحب کی زبان میں الفاظ کی بندش، زبان کے چٹخارے اور روز مرہ کا خوبصورت استعمال ہے۔ کچھ صوفیانہ رنگ بھی ہے۔ یہ ان قدیم شعراء میں ہیں جنھوں نے ادب کے شائقین کے دلوں میں شعر وسخن کا ذوق پیدا کیا۔

اکبر اجمیری

اجمیر کے شعراء میں جناب خواجہ اکبر حسین اجمیری صاحب کا نام قابل ذکر ہے۔ آپ 1868ء میں اجمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد ماجد خواجہ سید شفیع حسین صاحب چشتی تھے۔ آپ کا تعلق خاندان سجادگان خواجہ غریب نوازؒ سے ہے۔ آپ کی تعلیم مولانا مفتی محمد قمر الدین صاحب کی سرپرستی میں ہوئی۔ جو مدرسہ معینیہ عثمانیہ درگاہ شریف اجمیر کے بانی اور مدرس تھے۔ آپ جید عالم تھے۔ آپ کی تصانیف فقہ اور احادیث کے متعلق ہیں۔ ان کے فیض صحبت نے اکبر حسین پر اثر ڈالا۔ گیارہ سال کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ شاعری کے شوق کے لیے آپ اپنے چچازاد بھائی جناب سید امام الدین علی خاں اثر سے رجوع ہوئے جو غالب کے شاگرد رشید اور صاحب دیوان شاعر تھے۔ فارسی اور اردو دونوں میں شاعری کرتے تھے۔ استاد کی تربیت کا اثر تھا کہ اکبر حسین اجمیری صاحب کے کلام میں بھی وہی زبان کے چٹخارے الفاظ کی بندش، روزمرہ استعمال اور محاورات کی صحیح ادائیگی، زبان کی لطافت شامل ہوگئی۔ اثر صاحب کے کلام میں تھی۔ غزل کے علاوہ نعت، منقبت، قصیدہ، مرثیہ، قطعہ، رباعی میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی۔

حیدرآباد دکن کے وزیر اعظم مہاراجہ پرشاد خواجہ اکبر بڑے مداح تھے۔ اجمیر میں جب کبھی داغ دہلوی تشریف لائے۔ مشاعرے منعقد ہوئے اور اکبر صاحب کے کلام سے داغ دہلوی محفوظ ہوئے اور تعریف فرمائے۔

زمانہ تغیر پذیر ہے حالات نے پلٹا کھایا اور خواجہ اکبر حسین اجمیری کو 1925ء میں اجمیر کو خیر آباد کہنا پڑا۔ اس افراتفری میں ایک مکمل دیوان ضائع ہوگیا۔ رنج وتکالیف، مصائب وآلام کا سامنا کرنا پڑا۔ آپ نے آستانہ غریب نوازؒ پر رو رو کر اپنی فریاد پیش کی۔

ازل سے تاک میں تھا آسماں غریب نوازؒ
رہا جلا کہ میرا آشیاں غریب نواز
اٹھاؤں میں ستم آسماں غریب نوازؒ
یہ مجھ غریب میں طاقت کہاں غریب نوازؒ

نواب جاورہ سر محمد افتخار علی خاں بہادر کی خواہش پر جاورہ چلے گئے۔ نواب صاحب نے انھیں درباری شاعر کا اعزاز بخشتے ہوئے دوسو روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کیا۔ یہاں اکبر صاحب نے ''بزم معین'' کی بنیاد ڈالی۔ اس کے تحت اعلیٰ پیمانے کے مشاعروں کا انعقاد عمل میں آیا۔ بزم معین کی شاخیں مالوہ اندور، منّو، رتلام، مندسور وغیرہ میں قائم کیں۔

اکبر صاحب وجیہہ شکل اور بزلہ سنج انسان تھے جو ایک مرتبہ ان سے مل لیتا ان کا شیدائی ہوجاتا۔ 1958ء میں بروز شنبہ رحلت فرما گئے۔ ہندوستان سے لے کر پاکستان تک صفِ ماتم چھا گئی۔ کئی جگہ تعزیتی جلسہ ہوئے۔

1925ء کی افراتفری میں آپ کا مکمل دیوان ضائع ہوگیا تھا۔ منتشر اور نامکمل کلام میں سب سے زیادہ غزلیں دستیاب ہوئی ہیں۔ آپ کو زبان پر کامل عبور تھا۔ آپ کا نمونہ کلام۔

بے وفاؤں کو باوفا جانا
خاک سمجھے یہ ہم نے کیا جانا
غیر عیار ہے زمانے کا
اس کے فقروں میں تو نہ آجانا
تم کو اللہ دے اگر توفیق
پھول تربت پر دو چڑھا جانا

ہم نے سلطان ہند کو اکبرؔ
پیشوا، ہادی، رہنما جانا

قابل اجمیری

آپ کا اصل نام عبدالرحیم تھا۔ آپ کے والد کا نام عبدالکریم تھا۔ آپ 27 اگست 1931ء میں اجمیر میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تعلیم دارالعلوم معینیہ عثمانیہ درگاہ معلیٰ اجمیر میں ہوئی تھی۔ بچپن میں ہی والد کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ والد کے چند دنوں بعد ہی والدہ بھی تپ دق میں مبتلا ہو کر جہانِ فانی سے کوچ کر گئیں۔ والدین کے انتقال کے بعد دادا نے پرورش کی۔ ذریعہ معاش صحافت اور عرائض نویسی رہا۔ آبائی مکان تریولہ گیٹ کے اندر محلہ اندر کوٹ میں تھا۔ شعر گوئی کا شوق بچپن سے ہی تھا۔ ابتدائی کلام پر ارمان اجمیری سے اصلاح لی۔ لیکن ان کے ذوق شعری کو تسکین نہ ہوئی۔ پھر آپ نے سفی اجمیر یسے اصلاح لی، لیکن دونوں کے شاعرانہ مزاج میں زمین و آسمان کا فرق تھا۔ دونوں کا سوچنے کا ڈھنگ بھی الگ اور دونوں کا اسلوب بھی مختلف تھا۔ سفی اجمیری ایک روایتی شاعر تھے جبکہ قابل اجمیری روایت کے اسیر نہیں تھے۔ ان کے کلام میں کلاسیکیت کے ساتھ جدت کا بھی احساس ہوتا ہے۔ اس بنا پر ہم قابل کو راجستھان کا پہلا روایت شکن اور جدید شاعر کہہ سکتے ہیں۔

وہ آزادئ وطن کے ساتھ پاکستان منتقل ہو گئے۔ اور حیدرآباد میں مستقل سکونت اختیار کی۔ وہاں انھوں نے ڈاکٹر عبدالعلیم کے تعاون سے ہفت روزہ پرچہ ''شاہین'' جاری کیا۔ قابل اجمیری پاکستان کے شہری بن جانے کے بعد بھی ہندوستان اور خاص طور سے اجمیر کو نہیں بھولے۔ ان کا دل اجمیر میں ہی تھا۔ جس طرح اختر شیرانی لاہور میں بسنے کے باوجود بھی ٹونک نہیں بھولے تھے۔ اپنی کئی نظموں میں اظہار کیا ہے۔ اسی طرح قابل اجمیری نے بھی متعدد نظمیں لکھی ہیں۔

خواجہ کا آستانہ دربار خسروانہ
وہ کیف وہ ترانہ کچھ بھی نہ ساتھ لایا

اجمیر یاد آیا

قابل کے لیے پاکستان میں بھی حالات سازگار نہیں تھے۔ وہاں پر بھی انھیں پریشانیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ مسلسل غم واندوہ نے انھیں توڑ کر رکھ دیا۔ بالآخر وہ بھی تپ دق کے مرض میں مبتلا ہو گئے۔ کوئٹہ کے ٹی بی سینی ٹوریم میں قابل کی ملاقات ایک عیسائی نرس سے ہوگئی جو محبت و وفا کا پیکر تھی۔ اس خاتون سے قابل کو عشق ہو گیا۔ قابل اجمیری نے اس خاتون سے شادی کر لی۔ شادی کے بعد وہ مسلمان ہوگئی۔

اس کی محبت وخلوص، دیکھ بھال سے قابل اچھے ہو گئے۔ اس خاتون کا اسلامی نام نرگس تھا۔ قابل کا اس سے ایک بیٹا پیدا ہوا۔ لیکن قابل کی صحت پھر خراب ہوگئی۔ ان کا انتقال 3/اکتوبر 1162ء کو حیدرآباد سندھ (پاکستان) میں ہوا۔

قابل بہت خوددار انسان تھے۔ انھوں نے پریشانی میں بھی کسی کے آگے دست سوال دراز نہیں کیا۔ اکیلے ہی حالات کا مقابلہ کرتے رہے۔ انھوں نے غم یار کو غم روزگار میں ضم کر دیا۔ وہ ان اندھیروں میں بھی امید کی کرن تلاش کر لیتے تھے۔ ان کے نزدیک ناامیدی کفر ہے۔ قابل کے حالات اور قابل کی خصوصیات کچھ حد تک مجاز لکھنوی سے ملتی ہیں۔ اس لیے ہم انھیں مجاز ثانی بھی کہہ سکتے ہیں۔

قابل اجمیری نے غزلیں، قطعات، نظمیں وغیرہ لکھیں۔ ان کے مرنے کے بعد ان کے کلام کے مجموعہ ''دیدہ بیدار'' خونِ رگِ جاں' اور اس کے بعد باقیات قابل منظر عام پر آئے۔

قابل بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں۔ ان کی غزلوں میں عشقیہ جذبات و کیفیات کا اظہار تو ہے لیکن ابتذال نہیں۔ عشق کا مہذب تصور ملتا ہے۔

رضائے دوست قابل میرا معیار محبت ہے
انھیں بھی بھول سکتا تھا اگر ان کی خوشی ہوئی

☆☆☆

حادثے زیست کی توقیر بڑھا دیتے ہیں
اے غم یار تجھے ہم تو دعا دیتے ہیں

قابل اجمیری کو ہم ترقی پسند شاعر کہہ سکتے ہیں۔ حالانکہ وہ ترقی پسند تحریک سے وابستہ نہیں رہے۔ دراصل وہ ایک روشن خیال اور روایت شکن شاعر تھے۔ وہ زندگی کے جدید تقاضوں اور بدلتے ہوئے رجحان سے باخبر تھے۔ ان کے یہاں کلاسیکی روایت کی پاسداری بھی ہے۔ اسی لیے ان کے یہاں پرانی لفظیات میں بھی تازگی ہے۔ وہ خود کہتے ہیں۔

مجھے مشکل سے سمجھے گا زمانہ
نیا نغمہ نئی آواز ہوں میں

ان کے خیال سے ترقی پسند عناصر کا پتہ چلتا ہے۔

رنگ محفل چاہتا ہے اک مکمل انقلاب
چند شمعوں کے بھڑکنے سے سحر ہوتی ہیں

قابل اجمیری کی شاعری میں نازک تشبیہات واستعارات کا استعمال خوبصورت انداز میں کیا ہے۔

تم نامانو مگر حقیقت ہے
عشق انسان کی ضرورت ہے
رہ گزار حیات ہم نے

خود نئے راستہ نکالے ہیں

قابل اجمیری کے کلام کو مقبولیت ان کے انتقال کے بعد ملی۔ انھیں شاید اس بات کا اندازہ تھا۔ اس لیے انھوں نے کہا تھا۔

مجھے مشکلسے سمجھے گا زمانہ
نیا نغمہ نئی آواز ہوں میں

قابل کی عمر نے وفا نہ کی۔ ورنہ شاعری میں وہ اور کیا کیا گل کھلاتے۔ انھوں نے غم جاناں اور غمِ دوراں کی جو تلخیاں اٹھائیں۔ وہ ان کے کلام میں بہت خوبصورت انداز میں ملتی ہیں۔

تمھیں جو میرے غم دل سے آگہی ہو جائے
جگر میں پھول کھلیں آنکھ شبنمی ہو جائے

اجمیر میں ان قابل قدر شعرا کے علاوہ بھی کئی شعراء ہیں جنھوں نے شعر وسخن کی شمع جلائے رکھی۔ ان میں بہت سارے نام ہیں۔ عصر حاضر میں کئی شعراء اردو شاعری کے گیسو سنوار رہے ہیں۔

کتابیات

۱۔ اجمیر کا دبستانِ شاعری۔ شاہد احمد
۲۔ موجودہ اور نمائندہ شعرائے اجمیر۔ فضل المتین
۳۔ قابل اجمیری۔ احتشام اختر
۴۔ انجمنِ گل۔ سرور تونسوی
۵۔ تزکرہ شعرائے اجمیر شریف۔ عبد اسمیع بسمل
۶۔ مشاہیرِ ادب راجستھان۔ شاہد احمد
۷۔ راجپوتانہ میں تلامزہ داغ کی شعری خدمات۔ شاہد احمد
تذکرہ شعرائے راجپوتانہ۔ شاہد احمد

رومن اردو کو معیاری بنانے کی کوششوں کے ساتھ اردو کے لیے رومن رسم الخط کے استعمال نے مزید رفتار حاصل کی۔ رومن حروف تہجی کا استعمال کرتے ہوئے اردو آوازوں کو درست طریقے سے پیش کرنے کے لیے مختلف نظام اور کنونشن تیار کیے گئے۔ یہ خاص طور پر اردو بولنے والوں کے لیے اہم تھا جو فارسی عربی رسم الخط سے واقف نہیں تھے۔ آج رومن اردو عام طور پر غیر رسمی اور ڈیجیٹل مواصلات میں استعمال ہوتی ہے، بشمول ٹیکسٹ پیغامات، سوشل میڈیا، اور آن لائن فورمز۔ یہ اردو بولنے والوں کے لیے، خاص طور پر نوجوان نسلوں کے لیے، ڈیجیٹل تناظر میں اظہار خیال کرنے کا ایک آسان طریقہ بن گیا ہے۔

سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی اردو کے پہلے ادیب ومصنّف: دلائل وشواہد کے تناظر میں

طفیل احمد مصباحی

اردو زبان وادب کے فروغ واستحکام اور اس کی ترویج واشاعت میں صوفیائے کرام کی خدمات تاریخی مسلمات سے ہیں۔ بابائے اردو مولوی عبدالحق کی بلند پایہ تحقیقی کتاب "اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام" اس کی واضح مثال ہے جس میں صوفیائے کرام کی ادبی ولسانی کارگذاریوں پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان نفوسِ قدسیہ نے دین ومذہب کی تبلیغ وتوسیع کے علاوہ کس طرح گیسوئے ادب کی مشاطگی کی ہے اور اس کی نشو ونما میں کتنا اہم کردار ادا کیا ہے۔ دعوت وتبلیغ کے لیے ضروری ہے کہ مبلغ عوامی زبان سے پوری طرح واقف ہو۔ اردو زبان سے صوفیائے کرام کی دلچسپی کی ایک بڑی وجہ دعوت وتبلیغ بھی رہی ہے۔ عوام وخواص کے دلوں پر حکومت کرنے والے صوفیائے کرام اور مشائخِ ملت عوامی زبان اس لیے سیکھتے کہ دعوت وتبلیغ کا فریضہ بہتر اور مؤثر طریقے پر انجام پا سکے۔ مولوی عبدالحق کے بقول:

علما وامرا بلکہ حکومتوں اور بادشاہوں سے بھی وہ کام نہیں ہوسکتا جو فقیر اور درویش کر گزرتے ہیں۔ بادشاہ کا دربار خاص ہوتا ہے اور فقیر کا دربار عام ہے جہاں بڑے چھوٹے، امیر غریب، عالم جاہل کا کوئی امتیاز نہیں ہوتا۔ بادشاہ جان ومال کا مالک ہوتا ہے لیکن فقیر کا قبضہ دلوں پر ہوتا ہے۔ اس لیے اُن کا اثر محدود ہوتا ہے اور اِن کا (صوفیوں اور درویشوں) بے پایاں اور یہی سبب ہے کہ درویش کو وہ قوت واقتدار حاصل ہو جاتا تھا کہ بڑے بڑے جبّار اور باجبروت بادشاہوں کو بھی اس کے سامنے سر جھکانا پڑتا تھا۔ مسلمان درویش ہندوستان میں پُرخطر اور دشوار گزار رستوں، سر بفلک پہاڑوں اور لق ودق بیابانوں کو طے کر کے ایسے مقامات پر پہنچے جہاں کوئی اسلام اور مسلمان کے نام سے بھی واقف نہ تھا اور جہاں ہر چیز اجنبی اور ہر بات ان کی طبعیت کے مخالف تھی۔ جہاں کی آب وہوا، رسم ورواج، صورت وشکل، آداب واطوار، لباس، بات چیت غرض ہر چیز ایسی تھی کہ ان کو اہل ملک سے اور اہل ملک کو ان سے وحشت ہو۔ لیکن حال یہ ہے کہ انہیں وصال کیے صدہا سال گزر چکے ہیں لیکن اب بھی ہزاروں لاکھوں بندگانِ خدا صبح وشام ان کے آستانوں پر پیشانیاں رگڑتے ہیں اور جن جن

مقامات پر ان کے قدم پڑے تھے وہ اب تک "شریف" اور "مقدس" کے نام سے یاد کیے جاتے ہیں۔ یہ کیا بات تھی؟ بات یہ تھی کہ ان کے پاس دلوں کے کھینچنے کا وہ سامان تھا جو نہ امرا و سلاطین کے پاس ہے اور نہ علما و حکما کے پاس۔ لیکن دلوں کو ہاتھ میں لانے کے لیے سب سے پہلے ہم زبانی لازم ہے۔ ہم زبانی کے بعد ہم خیالی پیدا ہوتی ہے۔ درویش کا تکیہ سب کے لیے کھلا تھا۔ بلا امتیاز ہر قوم و ملت کے لوگ ان کے پاس آتے اور ان کی زیارت اور صحبت کو موجبِ برکت سمجھتے۔ عام و خاص کی کوئی تفریق نہ تھی۔ خواص سے زیادہ عوام ان کی طرف جھکتے تھے۔ اس لیے تلقین (دعوت و تبلیغ) کے لیے انہوں نے جہاں اور ڈھنگ اختیار کیے ان میں سب سے مقدم یہ تھا کہ اس خطے کی زبان سیکھیں تا کہ اپنا پیغام عوام تک پہنچا سکیں۔ چنانچہ جتنے اولیاء اللہ سرزمینِ ہند میں آئے یا یہاں پیدا ہوئے وہ باوجود عالم و فاضل ہونے کے عوام سے انہیں کی بولی میں بات چیت کرتے اور تعلیم و تلقین فرماتے تھے۔ یہ بڑا گر تھا اور صوفیا اسے خوب سمجھتے تھے۔

(اردو کی ابتدائی نشوونما میں صوفیائے کرام کا کام ص:43 ناشر: انجمن ترقی اردو ہند نئی دہلی)

ہندوستان میں چشتی صوفیائے و مشائخ نے جہاں دین و مذہب کی گراں قدر خدمات انجام دیں وہیں علوم و ادبیات کے فروغ و استحکام میں بھی نمایاں طور پر حصہ لیا۔ کتب و رسائل اور ملفوظات و مکتوبات کی صورت میں صوفیائے چشت اہلِ بہشت کے علمی و ادبی کارناموں کی سینکڑوں مثالیں تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہیں۔ محبوبِ الٰہی حضرت نظام الدین اولیاء اور آپ کے خلفا اور خلفا کے خلفا نے دین و دانش اور ادب و ثقافت کی اہم خدمتیں انجام دیں۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بیگم ریحانہ فاروقی (مدیرۂ اعلیٰ آستانہ دہلی) لکھتی ہیں:

اگر ہم یہ کہیں کہ دلی میں اردو ادب کی خدمت کے آغاز اور اس کی ترویج و ترقی کے بانی و معمارِ اول حضرت محبوب الٰہی خواجہ نظام الدین اولیا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ ہیں تو بیجا نہ ہو گا۔ حضرت کی خانقاہ دینی و روحانی تعلیم کا تو مرکز تھی ہی لیکن یہاں ظاہری تعلیم بھی دی جاتی تھی۔ محبوب الٰہی یہ چاہتے تھے کہ ایک ایسی ہلکی پھلکی زبان وجود میں آئے جو عوام کے درمیان باہمی خلوص و رابطہ کا آسان ذریعہ بن سکے اور صوفیا و مشائخین اور علمائے دین اس کے ذریعہ بہ آسانی مؤثر طور پر تبلیغِ دین کر سکیں، درسِ طریقت و ریاضت دے سکیں اور اس زبان کے ذریعہ بندگانِ خدا کی حقیقی معنوں میں اثر آفریں رہنمائی و رہبری کر سکیں۔ یہ صحیح ہے کہ حضرت نے خود اردو میں کوئی تحریری کام انجام نہیں دیا جس کا سبب یہی ہو سکتا ہے کہ حضرت موصوف نے عبادت و ریاضت اور مخلوق خدا کی بے لوث خدمت کو اولیت اور ترجیح دی اور یہ بھی ظاہر ہے کہ ان مصروفیات کے حلقہ میں رہ کر کوئی تحریری کام کرنے کا وقت نکالنا ممکن ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ انہوں نے اپنے عزیز ترین سعادت مند و فرماں بردار مرید و شاگرد رشید حضرت امیر خسرو رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو اس مقصد کے آغاز و حصول کے لیے احساس دیا۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ حضرت امیر خسرو اردو زبان و ادب کی ترویج و ترقی کے لیے کامیاب معمار اول ثابت ہوں گے۔

(دہلی کے مشائخ کی ادبی خدمات ص:24 ناشر: اردو اکادمی دہلی)

حضرت نظام الدین اولیاء کے خلفا کے خلفا میں ایک نمایاں ترین ہستی کا نام حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ ہے جنہوں نے دعوت و تبلیغ مذہب و روحانیت اور علم و ادب کی وسیع پیمانے پر خدمت انجام دی۔ آپ جامعِ شریعت و طریقت تھے۔ لطائفِ اشرفی اور مکتوباتِ اشرفی کے مطالعہ سے علومِ ظاہری و باطنی میں آپ کے رسوخ و مہارت کا اندازہ ہوتا ہے۔ مختلف دینی و علمی موضوعات پر دو درجن سے زائد کتب و رسائل آپ کے تبحرِ علمی پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ کو بہت ساری علمی و روحانی فضیلتیں حاصل ہیں۔ آپ کے علمی و ادبی فضائل میں سے ایک نمایاں ترین فضیلت یہ بھی ہے کہ آپ اردو کے پہلے مصنف ہیں۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ کے اردو رسالۂ اخلاق و تصوف کی دریافت میر نذر علی دردؔ کاکوروی کا ایک عظیم کارنامہ ہے اور اس کے لیے وہ پوری دنیائے ادب کی طرف سے مبارکباد کے مستحق ہیں۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری اور ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی نے نذر علی دردؔ کاکوروی کی اس عظیم تحقیقی دریافت کو سراہا ہے اور دوسرے ادبا و محققین کی صرف اس لیے سرزنش کی ہے کہ اس تحقیقی دریافت کا سہرا دردؔ کاکوروی کے بجائے پروفیسر حامد حسن قادری کے سر کیوں باندھا جاتا ہے۔ اردو کی پہلی تصنیف اور اردو کے پہلے مصنف کے بارے میں طرح طرح کی خیال آرائیاں اور قیاس آرائیاں کی گئی ہیں۔ کسی نے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کو تو کسی نے کو حضرت امیر خسرو کو اردو کا پہلا مصنف قرار دیا ہے لیکن میر نذر علی دردؔ کاکوروی کی تحقیق و دریافت کے مطابق حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی اردو کے پہلے ادیب و مصنف قرار پاتے ہیں۔ دردؔ کاکوروی جب یہ نئی تحقیق لے کر اپنی دھماکے دار انٹری کے ساتھ میدانِ ادب میں وارد ہوئے تو اردو نثر کی تاریخ کے سابقہ بلند بانگ دعوے اور بہت سارے مزعومات و مسلّمات کی دیواریں منہدم ہو گئیں اور رفتہ رفتہ اربابِ ادب و تحقیق اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوئے کہ سید اشرف جہانگیر سمنانی واقعی اردو کے پہلے ادیب و مصنف ہیں اور اخلاق و تصوف سے متعلق ان کا تحریر کردہ بلند پایہ رسالہ اردو نثر کی پہلی کتاب ہے۔ زیرِ نظر مضمون میں عصری دانش گاہوں سے تعلق رکھنے والے فضلا اور ماہرینِ زبان و ادب کے وقیع افکار و آرا جمع کیے گئے ہیں تا کہ علمی و ادبی حلقوں میں اس فکر و خیال کو زیادہ سے زیادہ عام کیا جا

سکے۔

سید اشرف جہانگیر سمنانی سے متعلق دردؔ کاکوروی کی نئی تحقیقی دریافت:

سید مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی قدس سرہ سے متعلق دردؔ کاکوروی کی تحقیقی دریافت اور دردؔ صاحب کی تحقیقی عظمت پر روشنی ڈالتے ہوئے ڈاکٹر فرقان علی مخمورؔ کاکوروی لکھتے ہیں:

دنیا کی ہر زبان کے نگارخانے میں ہم کو تین طرح کے لوگ نظر آتے ہیں۔ ایک وہ جو صرف شاعری کرتے ہیں۔ دوسرے جنہوں نے نثر نگاری کو اپنا شعار بنایا اور تیسرے وہ جو شاعری کرنے کے ساتھ ساتھ نثر نگاری میں بھی بہترین صلاحیتوں کے مالک ہیں۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی کا شمار ایسے ہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے شاعری بھی کی اور نثر کے میدان میں بھی اپنے اشہبِ قلم کو جولاں کیا۔ یہاں یہ بھی عرض کر دینا بعید از موضوع نہ ہوگا کہ ایسے لوگوں کی تعداد خال خال ہے جن کو نظم اور نثر دونوں میں کامل دستگاہ حاصل ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے دردؔ کی ایوانِ ادبِ اردو میں اہمیت وافادیت اور نمایاں ہو جاتی ہے۔ دردؔ کاکوروی نے اپنے عہدِ شباب میں شاعری کے ساتھ نثر نگاری کی طرف بھی خاص توجہ کی اور مختلف تاریخی، ادبی اور مذہبی موضوعات پر قلم اٹھایا۔ ان کی نثر میں سادگی اور سلاست کے ساتھ علمی سنجیدگی ہے۔ اسی لیے ان کے ادبی اور تاریخی مضامین میں ان کی فکر پوری طرح ظاہر ہوئی ہے۔ یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ اس وقت دردؔ نے زبان پر جس قدرت کا ثبوت دیا ہے وہ انشا پردازی نہیں ہے بلکہ فکر وخیال کی ترسیل کا کامیاب نمونہ ہے۔ نثر میں دردؔ کئی حیثیتوں سے نمودار ہوتے ہیں۔ وہ بیک وقت مصنف بھی ہیں اور مؤلف بھی، محقق بھی ہیں اور ناقد بھی، مرتب بھی ہیں اور مؤرخ بھی۔ انہوں نے اپنی نثر میں مختلف النوع مضامین یادگار چھوڑے ہیں۔

دردؔ کاکوروی جس پایہ کے شاعر ہیں اسی پایہ کے نثر نگار بھی ہیں۔ اردو نثر میں ان کے دو مضامین ایسے ہیں جنہوں نے بحیثیتِ نثر نگار ان کو شہرت کی بلندیوں پر پہنچا دیا۔ ایک مضمون تو وہ ہے جس میں انہوں نے مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کے "رسالۂ معرفت" کو اردو نثر کی پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ اگرچہ یہ بات ابھی تک پایۂ ثبوت کو نہیں پہنچ سکی ہے پھر بھی اس کتاب کے وجود سے یکسر انکار نہیں کیا جا سکتا۔ دردؔ کاکوروی نے خود ۲۰۷/صفحات پر مشتمل مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کی اس قلمی کتاب کو دیکھا تھا اور اس کے چند جملے بھی بطورِ نمونہ پیش کیے تھے۔ ان کا یہ مضمون (ماہنامہ) نگار دسمبر ۱۹۲۵ء میں شائع ہوا تھا اور پروفیسر حامد حسن قادری نے اپنی کتاب "داستانِ تاریخ اردو" میں اس رسالہ کو اردو کی پہلی کتاب تسلیم کرتے ہوئے لکھا:

میر نذر علی دردؔ کاکوردی رسالہ نگار بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اپنے سلسلہ کے ایک بزرگ مولانا وجیہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانہ میں زبان ہندی کہا کرتے تھے)، خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷/صفحہ کی ہے۔ اس کے ص: ۱۱۸ کی عبارت کا ایک ٹکڑا یہ ہے:

"اے طالب! آسمان وزمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب خدا میں ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں سمجھ کا کچھ ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات"۔

دردؔ کاکوروی کی یہ تحقیق حامد حسن کے حوالے سے اتنی مشہور ہوئی کہ ادبی حلقوں میں انہیں کے نام سے منسوب ہوگئی۔ حالاں کہ قادری صاحب نے اس سلسلہ میں دردؔ کاکوروی کی تحقیق کا ہی حوالہ دیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے ڈاکٹر نسیم قریشی نے بھی یہی غلطی کی ہے کہ حامد حسن قادری کی کتاب دیکھے بغیر ہی انہوں نے اپنی کتاب "اردو ادب کی تاریخ" کے ص: ۱۱۹ پر لکھ دیا کہ پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش وتحقیق نے ایک اردو رسالہ کا پتہ لگایا ہے جو "دہ مجلس" سے سوا چار سو برس پہلے ۱۳۰۰ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی ہیں۔ اب علمی حلقوں میں یہ بات تسلیم کی جانے لگی ہے کہ یہ دریافت دردؔ کاکوروی کی مرہون منت تھی۔ ڈاکٹر فرمان فتح پوری ایڈیٹر ماہنامہ نگار کراچی (پاکستان) نے لکھا ہے کہ:

شعبۂ تحقیق میں بھی اہل کاکوری کے بعض اضافے بہت اہم ہیں۔ میر نذر علی دردؔ کاکوروی نے "نگار" دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں حضرت امیر خسرو کے ایک معاصر اشرف جہانگیر سمنانی کے "رسالۂ معرفت" کا سراغ دے کر اہلِ نظر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف یہی رسالہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اردو میں نظم ونثر کے آغاز کا زمانہ ایک ہی قرار پاتا ہے اور اُردو نثر کی تاریخ بھی کوئی سات سو سال پرانی ہو جاتی ہے۔

(میر نذر علی دردؔ کاکوروی: حیات اور کارنامے ص: 285، 286 ناشر: مخمورؔ کاکوروی تقسیم کار: مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ نئی دہلی)

(2) * ڈاکٹر حامد حسن قادری *:

ڈاکٹر حامد حسن قادری دردؔ کاکوروی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

خواجہ سید اشرف جہاں گیر سمنانی نے (جن کا مزارِ مبارک کچھوچھہ شریف علاقۂ اودھ میں ہے) اُردو میں ایک رسالہ "اخلاق وتصوف" پر ۷۰۸ھ/۱۳۰۸ء میں تصنیف کیا۔ شرِ اردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں۔ سید اشرف جہاں گیر سمنانی صاحب ۱۲۸۹ء/۶۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰/سال کی عمر پا کر بہ حساب قمری ۱۴۰۵ء/۸۰۸ء میں وفات پائی۔ "خالقِ باری" کا سالِ تصنیف معلوم نہیں۔ لیکن چوں کہ امیر

خسرو سید اشرف صاحب سے عمر میں ۳۵ / سال بڑے ہیں اس لیے" خالقِ باری" کو مقدم رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے سید اشرف صاحب کی کتاب پہلے لکھی گئی ہو اور اردو زبان میں تصنیفِ اولین یہی ہو۔ بہر حال اولیت انہیں دونوں (حضرت امیر خسرو و حضرت مخدوم اشرف جہاں گیر سمنانی علیہما الرحمہ) میں دائر ہے۔ اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارہویں صدی عیسوی (بارھویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیفِ نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہاں گیر کے" رسالہ تصوف" کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہاں گیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔

(تاریخ و تنقید ص: ۹ ناشر: لکشمی نرائن اگروال پبلشر آگرہ)

ڈاکٹر حامد حسن قادری اپنی دوسری مدلل تحقیقی کتاب" داستان تاریخِ اردو" میں لکھتے ہیں:

خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی (جن کا مزار کچھوچھہ شریف علاقۂ اودھ میں ہے) نے اُردو میں ایک رسالہ اخلاق و تصوف پر ۱۳۰۸ء/ ۷۰۸ھ میں تصنیف کیا۔ میر نذر علی درد کاکوروی" رسالہ نگار لکھنؤ" بابت دسمبر ۱۹۲۵ء میں لکھتے ہیں کہ" سید اشرف جہانگیر نے اپنے سلسلے کے ایک بزرگ مولانا وجیہہ الدین کے ارشادات کو اردو زبان میں (جس کو اس زمانے میں ہندی زبان کہا کرتے تھے) خود جمع کیا ہے۔ میں نے اپنے ایک بزرگ کے پاس خود اس کتاب کو دیکھا ہے۔ یہ قلمی کتاب ۲۰۷ / صفحہ کی ہے۔ اس کے صفحہ: ۱۱۸ کی ایک عبارت کا ٹکڑا یہ ہے: اے طالب! آسمان و زمین سب خدا میں ہے۔ ہوا سب میں خدا ہے۔ جو تحقیق جان اگر تجھ میں کچھ سمجھ کا ذرہ ہے تو صفات کے باہر بھیتر سب ذات ہی ذات۔ شرِ اُردو میں اس سے پہلے کوئی کتاب ثابت نہیں ہے۔ سید اشرف صاحب جہانگیر ۱۲۸۹ء/ ۶۸۸ھ میں پیدا ہوئے اور ۱۲۰ / سال کی عمر کو پہنچ کر ۱۴۰۵ء/ ۸۰۸ھ میں وفات پائی۔" خالقِ باری" کا سال تصنیف معلوم نہیں۔ لیکن چوں کہ امیر خسرو سید اشرف سے عمر میں ۳۵ / سال بڑے ہیں۔ اس لیے خالق باری کو مقدم رکھا گیا ہے۔ ممکن ہے سید اشرف صاحب کی کتاب پہلے لکھی گئی ہو اور اُردو زبان میں تصنیفِ اولین یہی ہو۔ بہر حال اولیت انہیں دونوں میں دائر ہے۔ بعض محققین کی نظر میں" خالقِ باری" کا انتساب حضرت امیر خسرو سے مشتبہ ہے۔ اس نظریہ کی بنا پر اگر خالق باری کسی بعد کے مصنف کا کارنامہ ہے تو پھر سید اشرف جہانگیر کا رسالہ تصوف ہی اُردو کی پہلی کتاب ہے۔ اب تک اربابِ تحقیق متفق الرائے تھے کہ شمالی ہند میں اٹھارویں صدی عیسوی (بارہویں صدی ہجری) سے پہلے تصنیف و تالیفِ نثر کا کوئی وجود نہ تھا۔ یہ فخر دکن کو حاصل ہے کہ وہاں شمالی ہند سے چار سو برس پہلے اُردو کی تصانیف کا آغاز ہوا۔ اب سید اشرف جہانگیر کے رسالہ تصوف کی دریافت سے وہ نظریہ باطل ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ دکن میں اُردو زبان کی بنیاد پڑنے سے پہلے شمالی ہند میں امیر خسرو اور سید اشرف جہانگیر نے نظم و نثر دونوں کی بنیاد ڈال دی تھی۔

(داستان تاریخِ اردو ص: ۵۳ ۵۴ ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس نئی دہلی)

(3) پروفیسر اختر اورینوی (صدر شعبۂ اردو پٹنہ یونیورسٹی بہار) اپنے تحقیقی مضمون" بولیوں کا سنگم" میں لکھتے ہیں:

دہلی اور بہار اسکول میں مماثلت ضرور ہے۔ لیکن ہر دو نے ایک دوسرے پر اثر ڈالتے ہوئے انفرادی طور پر ترقی کی ہے اور دونوں اسکول از خود پیدا ہوئے۔ میر حسن کے استاد میر ضیاؔ دہلی سے عظیم آباد چلے آئے۔ اشکؔ ی اور جمالؔ ی نے خواجہ میر دردؔ سے اصلاحیں لیں، مگر اس کو کیا کیجیے کہ خود میر تقی میرؔ جعفر عظیم آبادی کے شاگرد تھے۔ راسخؔ عظیم آبادی اور جوشش عظیم آبادی کی شاعری میر و سوزؔ کی شاعری کا جواب ہے۔ غالبؔ نے بیدلؔ عظیم آبادی کے کلام کو سامنے رکھ کر مشقِ سخن کی۔ موجودہ تحقیقات کی بنا پر تو یہی ظاہر ہوتا ہے کہ امیر خسروؔ اور حضرت خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کے بعد دہلی اور صوبۂ متحدہ میں اُردو کو اُس وقت تک فروغ نہ ہوا جب تک ولؔ ی دکنی نے دہلی کے تخیل کو آکر نہ چھیڑا۔

(تحقیق و تنقید ص: ۳۰ ناشر: کتابستان الہٰ آباد)

(4) * پروفیسر مظفر اقبال * :

اردو کے مایۂ ناز ادیب و محقق پروفیسر مظفر اقبال (سابق صدر شعبۂ اردو بھاگل پور یونیورسٹی بھاگل پور بہار) کے بقول :

مولوی عبدالحق صاحب کی کوششوں سے جب جنوبی ہند کا بیش قیمت سرمایۂ ادب اہلِ فکر و نظر کے سامنے پیش ہوا تو اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے سوا کوئی چارہ نظر نہیں آیا کہ شمالی ہند سے بہت پیش تر جنوبی ہند میں اُردو نثر میں ترجمہ و تالیف کا کام شروع ہو چکا تھا۔ محققین نے دکن میں اردو نثر کا پہلا مصنف شیخ عین الدین گنج العلم متوفی: ۷۹۵ھ/ ۱۳۹۳ء کو قرار دیا ہے لیکن ان کے رسائل کا پتہ نہیں چلتا۔ اس لیے خواجہ بندہ نواز گیسو دراز متوفی: ۸۲۵ھ/ ۱۴۲۲ء کا نام نہ کی تصنیف" معراج العاشقین" کو دکن میں اردو نثر کا قدیم ترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کتاب کا سنِ کتابت ۱۴۴۲ء بتایا جاتا ہے اور سنِ تصنیف ۸۰۱ھ مطابق ۱۳۹۸ء سے قبل۔ معراج العاشقین کی دریافت کے بعد عرصۂ دراز تک اسے اُردو نثر کی اولین تصنیف کا درجہ حاصل رہا اور اردو نثر نویسی کے سلسلے میں جنوبی ہند کی اولیت کو تسلیم کر لیا گیا۔ لیکن سید اشرف جہانگیر سمنانی کی نثری

تصنیف کی دریافت کے بعد اولیت کا سہرا پھر شمالی ہند کے سر پر باندھ دیا گیا اور اب تک کی تحقیقات سے پتہ چلتا ہے کہ معراج العاشقین کی تصنیف سے ۱۷/ سال پیش تر شمالی ہند کے جلیل القدر صوفی سید اشرف جہانگیر سمنانی (متولد: ۶۸۸ھ مطابق ۱۲۸۹ء- وفات: ۸۰۸ھ مطابق ۱۴۰۵ء) نے اردو نثر میں جو رسالہ تصنیف کیا تھا وہی اُردو نثر کی سب سے پہلی کتاب ہے۔ اس کا سنِ تصنیف ۷۰۸ھ مطابق ۱۳۰۸ء ہے اور موضوع اخلاق وتصوف ہے۔

(بہار میں اردو نثر کا ارتقاص: ۱۴۔۱۵ ناشر: کتاب خانہ ترپولیا پٹنہ بہار)

(5) مشہور محقق پروفیسر وقار احمد رضوی لکھتے ہیں:

اردو نثر کی تاریخ آٹھویں صدی ہجری سے شروع ہوتی ہے۔ چنانچہ اردو نثر کا قدیم نمونہ سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ ہے جو ۷۰۸ھ مطابق ۱۳۰۸ء کا ہے۔ پھر شیخ عین الدین گنج العلم متوفی: ۷۹۵ھ کی تصانیف کا حوالہ ملتا ہے۔ اس کے بعد معراج العاشقین از خواجہ بندہ نواز گیسو دراز گلبرگوی کا ذکر آتا ہے۔

(ممبئی عظمیٰ کی تاریخ ص: ۶۶ ناشر: ادارہ معارفِ اسلامی ممبئی بحوالہ تاریخ نقد ناشر: نیشنل بک فاؤنڈیشن، کراچی، پاکستان ۲۰۰۴ء ص: ۲۸۵)

(6) * ڈاکٹر عابدہ بیگم * :

ڈاکٹر عابدہ بیگم (شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی) لکھتی ہیں:

تمام محققین نے "کربل کتھا" کو شمالی ہند کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے۔ جدید تحقیقات کے مطابق اس سے پہلے نثری تصانیف کا آغاز ہو چکا تھا۔ ان کے ادبی یا معیاری ہونے کا دعویٰ تو نہیں کیا جا سکتا لیکن ان کو نثری تصانیف کی صف سے خارج بھی نہیں کیا جا سکتا۔ ابتدائی تحریروں کا ذکر کرتے ہوئے مؤرخین نے سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالہ کا ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ نے ممدوخاں کے رسالے کو نقشِ اول بتایا ہے۔ انھیں یہ رسالہ بیجاپور میں دستیاب ہوا۔ اس رسالے کے ساتھ دو اور منظوم رسالے پند نامہ اور چکی نامہ بھی منسلک تھے۔ سنِ تصنیف درج نہیں۔ ڈاکٹر رفیعہ سلطانہ اس کی زبان اور اندازِ بیان کو دیکھتے ہوئے اسے سید اشرف جہانگیر سمنانی سے قبل کی تصنیف قرار دیتی ہیں.....حامد حسن قادری نے سید اشرف جہانگیر سمنانی کے اردو رسالے کا ذکر کیا ہے۔ قادری صاحب نذر کاکوری کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ سید مخدوم اشرف کا یہ رسالہ اخلاق وتصوف پر مبنی ہے۔ اس رسالہ میں مصنف نے اپنے بزرگ کے ارشادات کو جمع کر کے رسالے کی شکل دے دی ہے۔

(اردو نثر کا ارتقا ص: ۱۳۔۱۴ ناشر: مکتبہ جامعہ لمیٹڈ نئی دہلی)

(7) * ڈاکٹر فرمان فتح پوری * :

مشہور ناقد ومحقق اور ادیب وصحافی ڈاکٹر فرمان فتح پوری (ایڈیٹر "نگار") نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانی کا رسالہ تصوف ومعرفت اردو کی پہلی تصنیف ہے اور اردو نظم ونثر کے آغاز کا زمانہ تقریباً ایک ہی ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

شعبۂ تحقیق میں بھی اہل کاکوری کے بعض اضافے بہت اہم ہیں۔ میر نذر علی درد کاکوروی نے "نگار" دسمبر ۱۹۲۵ء کے شمارے میں حضرت امیر خسرو کے ایک معاصر اشرف جہانگیر سمنانی کے "رسالۂ معرفت" کا سراغ دے کر اہلِ نظر کی توجہ اس طرف مبذول کرائی ہے کہ اردو نثر کی پہلی تصنیف یہی رسالہ ہے اور اگر اسے صحیح مان لیا جائے تو اردو میں نظم ونثر کے آغاز کا زمانہ ایک ہی قرار پاتا ہے اور اُردو نثر کی تاریخ بھی کوئی سات سو سال پرانی ہو جاتی ہے۔

(پیش لفظ سخنورانِ کاکوری ص: 13 ناشر: میخانۂ ادب ناظم آباد کراچی)

(8) * ڈاکٹر نسیم قریشی * :

ڈاکٹر نسیم قریشی (علی گڑھ مسلم یونیورسٹی) نے اپنی بلند پایہ تصنیف "اردو ادب کی تاریخ" میں سید اشرف جہانگیر سمنانی کے رسالۂ اردو (جو اخلاق وتصوف پر مشتمل ہے) کی لسانی اہمیت کو تسلیم کیا ہے اور درد کاکوروی وحامد حسن کی تائید کرتے ہوئے آپ کے کے مذکورہ بالا رسالے کو اردو کی پہلی تصنیف قرار دیا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

شمالی ہند میں اردو شعر گوئی کا عام رواج محمد شاہ رنگیلے کے عہد سے ہوا۔ جب ولی دکنی کے دوبارہ دورۂ دہلی نے دار السلطنت میں ادبی چہل پہل کی نئی فضا پیدا کر دی شمالی ہند کے باکمالوں نے اس ذوق وشوق، طبیعت داری اور فن کے رچاؤ کے ساتھ اُردو شاعری کو وسیلۂ اظہارِ خیال بنایا کہ بہت جلد اس کا بلند فنی معیار قائم ہو گیا لیکن شمالی ہند میں ادب اور زندگی پر فارسی کا تسلط اس قدر شدید اور قوی تھا کہ اردو نے بڑی صبر آزما منزلیں طے کر کے اور ایک حد تک اپنا جوہر کھو کر باقاعدہ ادبی حیثیت اختیار کی ۔۱۸۰۰ء تک شمالی ہند میں اردو نثر نے کوئی خاص ترقی نہیں کی۔ اب تک عام خیال یہ تھا کہ شمالی ہندی اردو نثر کی پہلی کتاب فضلی کی "دہ مجلس" ہے جس کا سنِ تصنیف ۱۷۳۲ء ہے۔ پروفیسر حامد حسن قادری کی تلاش وتحقیق نے ایک اور رسالہ کا پتہ لگایا ہے جو "دہ مجلس" سے سوا چار سو برس پہلے ۱۳۰۸ء میں تصنیف ہوا۔ اس کے مصنف خواجہ سید جہانگیر اشرف سمنانی ہیں۔ رسالہ اخلاق وتصوف سے متعلق ہے۔ اس کی تمام تر اہمیت لسانی ہے۔

(اردو ادب کی تاریخ ص: 129 ناشر: ادارۂ فروغِ اردو لکھنؤ)

(9) ڈاکٹر عبدالرؤف (سابق صدر شعبۂ اردو کلکتہ یونیورسٹی) لکھتے ہیں:

اردو کا ایک رسالۂ تصوف اور چند فقرے حضرت اشرف جہانگیر سمنانی علیہ الرحمہ سے منسوب ہیں.....خواجہ سید اشرف جہانگیر سمنانی نے اردو میں ایک رسالہ اخلاق و

تصوف پر ۱۳۰۸ء/ ۷۰۸ھ میں تصنیف کیا۔

(مغربی بنگال میں اردو کا لسانیاتی ارتقا ص:99 ناشر: مغربی بنگال اردو اکیڈمی کلکتہ)

(10) ماضی قریب کے مشہور محقق و مؤرّخ پروفیسر سید حسن عسکری پٹنہ نے بھی سید اشرف جہانگیر سمنانی کی طرف ایک اردو رسالہ منسوب کیے جانے کی بات کہی ہے اور بتایا ہے کہ جب تک اس پر تنقیدی نظر نہ ڈالی جائے اس کی قدامت و اصلیت کا فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

حضرت اشرف جہانگیر سمنانی سے ایک رسالہ اردو منسوب ہے لیکن جب تک اس پر نظرِ غائر نہ ڈالی جائے اس کی قدامت و اصلیت کے متعلق صرف دو تین اشعار سے کچھ فیصلہ کرنا مناسب نہ ہوگا۔ لیکن ہندی کی واقفیت اور استعمال کی شہادت تو خود لطائفِ اشرفی میں موجود ہے۔

(عہدِ وسطیٰ کی ہندی ادبیات میں مسلمانوں کا حصہ ص:5352 ناشر: خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری پٹنہ)

ان دلائل و شواہد سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مخدوم اشرف جہانگیر سمنانی کا شمار اردو ادب کے سابقین اولین مصنفین میں ہوتا ہے اور آپ کا مذکورہ رسالہ اردو کی پہلی تصنیف ہے۔ حضرت مخدوم پاک کثیر التصانیف بزرگ تھے۔ بعض سوانح نگاروں نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ سلسلۂ چشتیہ میں آپ نے تصنیف و تالیف کی طرف جس قدر توجہ دی ہے اور جتنی کتابیں لکھی ہیں شاید ہی کوئی دوسرے چشتی بزرگ آپ کے مثل ہوئے ہوں۔ آپ کی زندگی کا چوتھائی حصہ (تقریباً تیس سال) سفر میں گذرا۔ سفر میں کتابوں کا ذخیرہ ساتھ رکھتے اور دورانِ سفر وعظ و ارشاد اور تعلیم و تلقین کا سلسلہ جاری رہتا۔ دورانِ سفر لوگوں کی فرمائش پر کتابیں لکھ کر ان کے حوالے کر دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ اگر آپ کی کتابوں کی نقلیں محفوظ رکھی جاتیں تو آج دنیا آپ کی تصنیفی کثرت کا اعجاز ملاحظہ کرتی۔ مجدّدِ سلسلہ اشرفیہ شیخ المشائخ حضرت مولانا شیخ محمد علی حسین اشرفی کچھوچھوی (معروف بہ اعلیٰ حضرت اشرفی میاں) آپ کی تصانیفِ عالیہ کے حوالے سے لکھتے ہیں:

حضرت مولانا ابوالفضائل نظام الدین یمنی خلیفۂ مخدوم اشرف و جامعِ ملفوظات لطائفِ اشرفی فرماتے ہیں کہ حضرت محبوب یزدانی کا علم عجیب خداداد علم تھا۔ روئے زمین میں جہاں تشریف لے جاتے وہیں کی زبان میں وعظ فرماتے اور اسی زبان میں کتاب تصنیف کر کے وہاں کے لوگوں کے لیے چھوڑ آتے۔ بہت سی کتابیں آپ نے عربی فارسی سوری زنگی اور ترکی مختلف ملک کی زبانوں میں تصنیف فرمائیں جن کی فہرست اگر لکھی جائے تو ایک طومار ہو جائے گی۔ علمائے جلیل القدر کا قول ہے کہ جس قدر تصانیف حضرت محبوب یزدانی نے فرمائیں بہت کم علماء اس قدر تصانیفِ کثیرہ کے مصنف ہوں گے۔ کتاب کنز الاسرار، ذکر اسمائے الٰہی اور تسخیرِ کواکب حضرت نے تالیف فرمائی جس کی تعلیم مجھ کو حضور سے حاصل ہوئی تھی۔ یہ عجیب کتاب آپ کی تالیفات سے فنِّ تکسیر میں تھی۔ تصانیفِ کثیرہ آپ کی اس قدر ہیں کہ جس کی فہرست لکھنا محال ہے۔ اکثر کتابیں آپ کی تالیفات سے بنام قدوۃ الخوانین حضرت سیف خاں (خلیفۂ مخدوم اشرف) جو داماد فیروز شاہ بادشاہ دہلی کے تھے تصنیف ہوئیں اور اس فقیر نظام یمنی نے دو جلدیں حضرت کے ملفوظات سے کتاب "لطائف اشرفی" اور کتاب "سرّ الاسرار" اور رقعات حضرت کے جمع کر کے اس کو "مرقوماتِ اشرفی" کے نام سے موسوم کیا اور کتاب "سکندر نامہ" حضرت نظامی گنجوی کی بھی شرح لکھی۔ ان کتب کے علاوہ مقاماتِ مختلفہ میں حضور محبوب یزدانی نے جو کتابیں تحریر فرمائیں ان میں سے خاص خاص کتابوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

امام عبداللہ یافعی کے ارشاد اور شیخ الشیوخ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی قدس سرہ کی روحانی بشارت سے کتاب "عوارف المعارف" کی آپ نے شرح لکھی۔ جب روم تشریف لے گئے تو حضرت مولانا شیخ محیی الدین ابن عربی قدس سرہ کی کتاب "فصوص الحکم" کی شرح لکھی اور اس کو صاحب المعارف شیخ نجم الدین ابن شیخ صدر الدین فغانی کے سامنے پیش کیا اور عرض کیا کہ میں نے اس شرح کو حضرت شیخِ اکبر کے حکم پر لکھا ہے۔

حضرت محبوب یزدانی جب عرب تشریف لے گئے تو اہلِ عرب نے حضرت کے رسائلِ تصوف کی طرف بڑی توجہ دی کیا اور وہاں آپ نے کتاب "قواعد العقائد" عربی زبان میں تصنیف فرمائی۔ حضرت نے اہلِ عرب میں تقسیم کے واسطے خاص کر یہ کتاب لکھی جیسا کہ مولانا اعظم مولانا علی نے لمعات کو عربی کیا۔ آپ نے اس کی شرح بھی عربی زبان میں لکھی اور بہت کچھ اسرارِ معارفِ الٰہی اس میں درج فرمائے۔ جب حضرت محبوب یزدانی اطرافِ عراق و خراسان و ماوراء النہر میں تشریف لے گئے تو وہاں کے سادات نے کتاب "بحر الانساب" پیش کی۔ حضرت محبوب یزدانی نے کتاب مذکور سے منتخب کتاب "اشرف الانساب" تصنیف کی اور کتاب "بحر الاذکار" بھی وہاں تصنیف فرمائی اور رسالہ "اشرف الفوائد" اور "فوائد الاشرف" صوبۂ گجرات میں تصنیف فرمایا اور کتاب "بشارۃ الذاکرین" اور رسالہ "تنبیہ الاخوان" اور رسالہ "بشارۃ الاخوان" بپاسِ خاطر حضرت سیف خان تصنیف فرمائے اور روم کے سفر میں رسالہ "مصطلحاتِ تصوف" تحریر فرمایا اور رسالہ "مناقب خلفائے راشدین و فضائل اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم" لکھا جس پر علمائے محمد آباد گوہنہ نے کثیر مناقبِ حضرت مولیٰ علی کرم اللہ وجہہ الکریم کے سبب اعتراض کیا تھا اور چند رسائل تصوف میں بمقام روم اور لکھے جن کے نام یاد نہیں۔ رسالہ "حجۃ الذاکرین" بنگال میں تصنیف فرمایا۔ اس رسالہ میں

پانچوں وقت بعد ادائے فریضہ تین بار بآوازِ بلند کلمۂ طیبہ کا ثبوت احادیث اور تفاسیر سے فرمایا ہے۔اس رسالہ کو" نصیحت نامہ" کے نام سے بھی موسوم کرتے ہیں۔کتاب" فتاوائے اشرفیہ" بزبان عربی محض بپاسِ خاطر حضرت نورالعین تحریر فرمایا۔اس کتاب میں مسائلِ فقہ بڑی بڑی کتابوں سے انتخاب کر کے تصنیف فرمایا۔یہ فتاویٰ جامعِ مسائل ضرور یہ مذہبِ حنفیہ میں اس خوبی کے ساتھ لکھا کہ کوئی ایسا مسئلہ نہ تھا کہ جس کی سفر وحضر میں دیکھنے کی ضرورت نہ ہو۔

علم تفسیر میں کتاب" تفسیرِ رنج سامانی" اور کتاب" تفسیرِ نوربخشیہ" تصنیف فرمائی اور کتاب" ارشادالاخوان" اوراوراد واشغالِ مشائخِ چشت اہلِ بہشت میں تصنیف فرمائی اور ایک رسالہ بحثِ" وحدۃ الوجود" میں لکھا یہ ایک نایاب رسالہ ہے جس میں" سرِّ ہمہ اوست" کو بہ دلائل احادیث وتفسیر تحریر فرمایا اور رسالہ" تجویزیہ" درجواز برلعنِ یزید جون پور میں علما کے مباحثہ کے بعد تحریر فرمایا اور موافقِ عقیدۂ صاحب شرحِ عقائد نسفی یزید پر لعنت فسقی کہنا جائزہ ثابت کیا اور کتاب" بحر الحقائق" میں معرفت وحقیقت کے اسرار ورموز بیان فرمائے۔علم نحو میں" نحوِ اشرفیہ" تصنیف فرمایا جس میں تمام مسائل نحوی بالتفصیل درج فرمائے۔نیز کتاب" کنز الدقائق" تصوف میں تصنیف فرمائی اور رسالہ" بشارۃ المریدین" حسبِ درخواست سلطان ابراہیم شرقی جون پور میں تصنیف کیا اور" رسالہ غوثیہ" ذکرِ مردان اہل خدمات ابدال واوتاد وغوث وقطب وغیرہ میں تصنیف کیا۔" رسالہ قبریہ" اپنی قبر شریف میں لکھا جس میں حالاتِ نزولِ ملائکہ اظہار اپنے عقائدِ حقہ اور بشارتِ عالمِ غیب تحریر فرمایا اور علم اصول میں" فصولِ اشرفی" لکھی۔ ایک جلد" مکتوباتِ اشرفی" آپ کے صاحبِ سجادہ حضرت نورالعین نے جمع کی۔ " مرقومات اشرفی" حضرت مولانا نظام الدین یمنی حضرت کے خلیفہ نے جمع کیا۔ایک جلد" رقعاتِ اشرفی" جس کو حضرت مولانا شیخ محمد دُرّ یتیم نے جمع کیا تھا۔اس میں مختصر رقعاتِ حضرت محبوب یزدانی درج کیے گئے ہیں اور" دیوانِ اشرف" ایک مبسوط کتاب منظوم ہے جس کو اہلِ زمانہ مثلِ دیوانِ حافظ شیرازی مانتے ہیں۔

(تحائفِ اشرفی حصہ اول ص:115 تا118 ناشر:ادارہ فیضانِ اشرف دارالعلوم محمدیہ ممبئی)

اس اقتباس سے حضرت مخدوم اشرف کی کثرتِ تصانیف کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔لہٰذا یہ بات دوٹوک کہی جاسکتی ہے کہ سید اشرف جہانگیر سمنانی اردو کے پہلے مصنف تھے اور اخلاق وتصوف کے موضوع پر آپ کا یہ رسالہ اردو کی پہلی نثری تصنیف ہے۔دردؔ کاکوروی سمیت اردو کے ایک درجن کے قریب محققین ومؤلفین کے اقوال وآرا ہمارے دعویٰ کی تائید وتوثیق کے لیے کافی ہیں۔

اقبال کا اثر ثقافتی اور مذہبی میدانوں سے نکل کر سیاست کے دائرے تک پھیل گیا۔خود ارادیت اور اسلامی ریاست کے قیام کے بارے میں ان کے نظریات نہ صرف جنوبی ایشیا بلکہ ایران سمیت دیگر مسلم اکثریتی خطوں میں بھی سیاسی فکر کی تشکیل میں اثر انداز تھے۔اقبال کی فصیح اور پر اثر شاعری نے فارسی ادب پر دیرپا نشان چھوڑا ہے۔اہل بیت کے بارے میں ان کی تصویر کشی نے ایرانی ادبی روایات کی فراوانی میں اہم کردار ادا کیا،شاعروں اور ادیبوں کی آنے والی نسلوں کو متاثر کیا۔اقبال کے اثر کو تسلیم کرتے ہوئے ایرانیوں میں ان کی شاعری کی انفرادی تشریحات مختلف ہوسکتی ہیں۔کچھ روحانی اور ثقافتی پہلوؤں پر زور دے سکتے ہیں،جبکہ دوسرے ان کے کام کی سیاسی اور فلسفیانہ جہتوں پر توجہ مرکوز کر سکتے ہیں۔مجموعی طور پر،اقبال کے اہل بیت کے تذکرے نے بلاشبہ ایرانیوں کے درمیان فکری اور ثقافتی گفتگو کی تشکیل میں اہم کردار ادا کیا ہے،ان کی مذہبی اور تاریخی جڑوں سے گہرا تعلق پیدا کیا ہے۔

مادری زبان کا عالمی دن،زبان کے حقوق کی وکالت کرنے،اور زندگی کے مختلف شعبوں میں زبانوں سے متعلق عصری چیلنجوں سے نمٹنے کے لیے ایک عالمی پلیٹ فارم کے طور پر استعمال ہورہا ہے۔مادری زبانوں کو منانے،ان کے تحفظ اور فروغ کے لیے جاری کوششیں ثقافتی تحفظ،سماجی شمولیت،اور عالمی سطح پر پائیدار ترقی کے وسیع اہداف میں حصہ ڈالتی ہیں

لسانی طور پر،اردو فارسی رسم الخط کی ایک ترمیم شدہ شکل میں لکھی جاتی ہے جسے نستعلیق رسم الخط کے نام سے جانا جاتا ہے۔رسم الخط اپنے بہتے اور خوبصورت انداز کے لیے جانا جاتا ہے اور اردو شاعری لکھنے کے لیے موزوں ہے۔زبان خود ایک پیچیدہ گرائمیکل ڈھانچہ رکھتی ہے،جس میں مختلف قسم کے فعل کی شکلیں،صنفی معاہدے،اور کیس مارکر ہوتے ہیں۔اردو شائستگی اور احترام کے اظہار کے لیے کئی اعزازات اور رسمی رجسٹروں کو بھی استعمال کرتی ہے۔

دہلی کالج جیسے اداروں کا قیام برصغیر پاک وہند میں غیر افسانوی ادب کی ترقی میں ایک اہم موڑ ہے۔وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ ادبی روایت پھلتی پھولتی،متنوع اور بدلتے ہوئے سماجی وسیاسی اور فکری منظرنامے کے مطابق ڈھالتی رہی۔اس نے ثقافت کے تحفظ،نوآبادیات پر تنقید،سماجی تبدیلی کی وکالت کرنے اور علم اور نظریات پر وسیع تر عالمی گفتگو میں اہم کردار ادا کیا۔

گوشہء نعتیہ ادب

متاع

ڈاکٹر ریاض مجید (ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ پبلی کیشنز)
رفاہ انٹرنیشنل یونیورسٹی۔فیصل آباد

معاصر اردو نعت میں جن شاعروں کی آمد سے اس صنف کے امکانات روشن ہوئے ہیں ان میں ایک نام اویس راجا کا بھی ہے جس طرح اُن کی آمد نے بہت کم وقت میں ہمارے نعتیہ منظر نامے کو چمکا دیا ہے اس سے مجھ جیسے نعت کے قارئین کو بہت خوشی ہوئی یہ ایک حقیقت ہے کہ وہ شاعر جو پختہ غزل گوئی کے بعد نعت کی طرف متوجہ ہوئے ہیں اُن کی نعتیہ شاعری میں غزل کے علائم و رموز بڑی مہارت سے منقلب ہوئے ہیں اگرچہ بعض شاعروں کے ہاں کہیں کہیں اب بھی نعتیہ واردات کے بیان میں غزل کا روائتی فکری تاثر ابھرتا ہے لیکن جن مدحت گزاروں نے کلاسیکی غزل کی فکری و فنی خصوصیات کو شائستگی کے ساتھ نعتیہ مضامین و موضوعات کے اظہار سے آمیز کیا ہے انہوں نے نعت کی شعری جمالیات میں صرف اضافہ ہی نہیں کیا بلکہ اس صنف کو ایک تکمیلی منصب کی طرف گامزن کرنے کی سعادت بھی حاصل کی ہے۔

'متاع' اویس راجا کا نعتیہ مجموعہ ہے جو اوّل تا آخر غزل کی صنف (ہئیت) میں ہے غزل میں تازہ کاری تلاش کرنے کا پہلا زینہ وہ شعری زمینیں ہوتی ہیں جن میں شاعر اپنے محسوسات و جذبات کا اظہار کرتا ہے ہر وہ فن پارہ (حمد، نعت، منقبت، سلام وغیرہ) جو غزل کی ہئیت میں لکھا جائے اپنی تازگی کا اظہار اُس مطلع سے کرتا ہے۔ نعتیہ خیالات و تجربات کے بیان میں شاعر جب کوئی پہلی سطر یا مصرع لکھتا ہے تو وہیں سے اُس کی تازہ بیانی کا اندازہ ہو جاتا ہے یہاں یہ بات یاد رہے کہ یہ اندازہ صرف تازگی تلاشوں کو ہوتا ہے دوسرے قارئین کی توجہ اس طرف نہیں جاتی یعنی ایک اعتبار سے شعر میں جدّت اور ندرت کی تلاش ایک اضافی شے ہے۔ ہر قاری کا اُس سے ایک جیسا محظوظ ہونا ضروری نہیں۔

نعتِ رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے مطالعات میں تازہ کاری کی بہت اہمیت بلکہ 'افضلیت' ہے۔ ہزاروں نعت نگاروں میں جو زیادہ تر غزل کی ہئیت میں اپنے جذبات و خیالات کا اظہار کر رہے ہیں منفرد اور معتبر وہی چند نام ہیں جو اپنے اظہار میں ہمہ پہلو تازہ بیانی کے خواہاں ہوتے ہیں (فطری طور پر ہمہ پہلو ندرت خصال اور جدّت شعار)۔ وہ اپنے فن میں اس بات کا خیال رکھتے ہیں کہ اُن کا اسلوبِ بیاں دوسروں سے مختلف ہو وہ نعتیہ جذبات و محسوسات کے اظہار کے لیے نئی شعری زمینیں، قوافی، ردیفیں اور تراکیب تلاشتے اور تراشتے ہیں۔

اویس راجا کا نعتیہ مجموعہ 'متاع' ایک ایسی ہی خوش آئند سعیٔ جمیلہ کا ترجمان ہے جس میں غزل کی ہئیت میں کہی جانے والی نعت کا نمایاں پہلو یہی جدّت ہے جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے ان کی نعتیہ زمینیں اردو نعت کے معاصر منظر نامے میں تازہ کاری کی نوید لئے ہوئے ہیں۔

اویس نے اپنی نعت گوئی کے لئے جو صنف چُنی ہے وہ غزل کی ہے اس صنف میں تازہ کاری اس شعری زمین سے پیدا ہوتی ہے جو شاعر استعمال کرتا ہے نعت کی شعری جمالیات کا بڑا دارومدار بھی زمین کی تازگی پر ہوتا ہے ہر زمین اپنے تازہ امکانات ساتھ لے کر آتی ہے۔ زمین جتنی نئی اور امکانات سے لبریز ہو گی نعت کا ماحول اتنا ہی تازہ اور بلیغ ہو گا اویس اس بنیادی رمز سے واقف ہیں انہوں نے بعض ایسے قوافی اور ردیفیں بھی برتی ہیں جو اردو نعت میں (شاید) پہلی بار استعمال ہوئی ہیں یا بہت کم ہوئی ہیں مثلاً یہ مطلع دیکھئے:

جس نے بھی اُس کو مان لیا ہے اَڑے بغیر
نکلے گا اپنی قبر سے تازہ سڑے بغیر

اعمال ہیں دوزخ کے سزاوار اغثنی
اے شافعِ محشر، شۂ ابرار اغثنی

میں نے نبی کی نعت کو لکھنا کیا شروع
سورج مرے وجود میں ہونے لگے طلوع

تازہ زمینوں کے سبب اویس کی نعت کے ماحول میں تازہ کاری کے عناصر نمایاں ہو گئے ہیں اُن کی نعت محض قافیہ پیمائی نہیں ان کے تجربوں نے شعری اور تخلیقی (Poetic and Creative) سطح پر ظہور کیا ہے یوں وہ اُس یکسانیت سے بچ گئے ہیں جو کئی عام نعت گو شاعروں کے کلام میں نظر آتی ہے۔

حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے جذبات و محسوسات کے بیان میں اویس نے اپنا جو رنگِ خاص نکالا ہے۔ وہ اُن کے نعتیہ کلام میں سیرتِ رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعات کی جھلک ہے ان سیرتی واقعات سے ہمارے اکثر قاری واقف ہیں اویس نے ان واقعات کو اپنے نعتیہ کلام کا حصہ اس غیر محسوس انداز میں بنایا ہے کہ بعض جگہوں پر اُن کی مہارت پر بے ساختہ داد دینے کو دل کرتا ہے وہ ایک دو لفظوں سے سیرتی واقعات کو اپنی نعت سے یوں آمیز کرتے ہیں کہ مختلف ذہنی سطح کے قاری اپنے خیال میں اس واقعہ کی جداگانہ تصویر بنا کر محظوظ ہوتے ہیں یوں ایسے اشعار اپنی

تلازماتی وسعتوں اور علامتی بہاؤ میں بڑے موثر ہو جاتے ہیں ایسے اشعار کی تفہیم کے دوران میں بعض اوقات قاری سعی تخلیق مکرّر (Recreative efferts) کی لذت سے بھی حظ اٹھاتا ہے وہ شاعر کا ہم تجربہ ہوتے ہوئے آپ بھی تخلیقی حظ اٹھانے کے تجربے سے گزرتا ہے۔ وہ سیرتی واقعات کے بیان کی تفصیل میں نہیں جاتے ان کی طرف صرف اشارہ کرتے ہیں اور تفہیم کا باقی کام قاری پر چھوڑ دیتے ہیں یہ شعری خلا (Poetic Gap) اچھی شاعری کی جان ہوتا ہے یہ شعر دیکھئے:

؎ نبی کی فرقتِ اقدس میں اونٹنی تھی نڈھال
کنارے آنکھ کے رہنے لگے تھے گیلے سے

؎ اس ہتھیلی پر یہ دنیا مثلِ رائی ہے میاں
اس طرح سے میں بھی ہوں دیکھا ہوا دلدار کا

؎ محمد مصطفی آ جائیں گے اس کی عیادت کو
یہ کوڑا پھینکتی بڑھیا نے بھی سوچا نہیں ہوگا

؎ وہ کیسے توڑ سکتا ہے کوئی دل
جو ''اُستُن'' کو دلاسے دے رہا ہے

؎ مائی کوڑا نہ پھینک پائے گر
خود عیادت کو جا پہنچتا ہے

؎ ہرنی کی طرح راجا بھی فریاد کناں ہے
آفات میں ہے یہ بھی گرفتار اغثنی

؎ لمسِ رسول سے ہوئے عامی نہال خاص
مردہ کھجور پا گئی ان سے کمال خاص

؎ تنا کھجور کا رویا تھا ہجرِ اقدس میں
اُسی تنے کی محبت کا پیروکار ہے دل

؎ درِ مصطفیٰ پر کھڑا ہوں میں راجا
مری چشمِ نم سے عقیدت رواں ہے

اویس کی نعت میں آل اطہار اور صحابہ کرامؓ کا ذکر بھی انتہائی عقیدت و محبت سے ملتا ہے۔ اس تذکار کا انداز بھی اشاراتی ہے وضاحتی نہیں۔ سیرتی واقعات کی طرح اہلِ بیت اطہار اور صحابہ کے تذکار میں بھی اویس نے ایک دو لفظی اشارے سے واقعات کی تصویر کھینچ دی ہے۔ یہ مناقب کا جداگانہ انداز ہے وہ کسی شخصیت کے اوصاف اور واقعہ کی تفصیل میں نہیں جاتے بلکہ سیرتی واقعات کی طرح مختصر اشاروں میں بات کرتے ہیں یہ اشارے اپنی تلازماتی وسعتوں اور علامتی بہاؤ میں بڑے بلیغ اور پُرتاثیر نظر آتے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے:

؎ مرے خمیر کو عشقِ بلالؓ حاصل ہے
سو دست بردِ زمانہ سے ڈھال ہے

؎ ان ہی گلیوں سے کبھی فاطمہ گزری ہوں گی
تم جو گزرو تو نگہ آج بھی اونچی نہیں دوست

؎ نہیں بھولے اسے وہ زندگی بھر
خدیجہؓ نے جو کی دلجوئی ان کی

؎ کہیں بھی حضرتِ آدمؑ سے لیکر ان کی آمد تک
کسی کے حکم پر سورج کبھی پلٹا نہیں ہوگا

؎ کاش میں ہوتا حلیمہ سعدیہ کے گاؤں سے
کاش میں بھی دیکھ لیتا بچپنا مختار کا

؎ اثر رکھتی ہے آپ کی نسبت راجا
عمر آتا ہے تو فاروقؓ بنا دیتے ہیں

؎ صدیق و بوتراب ہوں عثمانؓ یا عمر
کس کے شجر پہ مصطفوی پھل نہیں رہا

؎ کس درجہ مطمئن شبِ ہجرت ہیں بوتراب
تیغ و سنان کے سائے میں اوڑھے ہوئے لحاف

؎ مآلِ حکمِ عدولی میں زک اٹھانا پڑی
اتر گئے جو صحابہ احد کے ٹیلے سے

ہجرت کی رات بھی تو عجب رات تھی اویس
صدیق ایک رات ہی میں بن گیا چراغ

؎ علی ہیں اشرف حسن بھی افضل
حسین اکمل بتول کامل

؎ مرے خمیر کو عشقِ بلال حاصل ہے
سو دست بردِ زمانہ سے ڈھال حاصل ہے

محاکات شاعری میں بڑی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں نعت نگاری میں شائستگی سے کی گئی تمثال کاری نہ صرف پُرتاثیر ہوتی ہے بلکہ بحیثیت مجموعی شاعر کے کلام کو بھی بلیغ بنا دیتی ہے محاکات کا تعلق چونکہ حسیات کے ساتھ ہوتا ہے باصرہ، سامعہ، لامسہ، شامہ وغیرہ کے تناظر میں اویس نے نعت کے بڑے خوبصورت شعر تخلیق کیئے ہیں کچھ مثالیں دیکھئے:

؎ کٹ رہی ہے دفاعِ احمد میں
ایڑی، جو غار کے شگاف میں ہے

؎ گر ہو سکے کبوتروں کا روپ دھار لے

اور مصطفیٰ کے شہر کی آب و ہوا میں رہ

؎ میں بُن رہا ہوں شنا ثور کے دہانے پر
مرا خیال بھی مکڑی کا کوئی جالا ہے

؎ تم جا رہی ہو گنبدِ خضریٰ کو دیکھنے
آنکھو! حضورِ شاہ میں دن رات، احتیاط

؎ ہم دل سے سنیں گے تو سنائی ہمیں دیں گے
ہیں سمع نواز آپ کے بولے ہوئے الفاظ

؎ مَیں ان کے درِ ناز پہ خاموش تھا راجا
آنکھوں سے بہا کرتے تھے خود بولتے الفاظ

؎ سینے پہ ان کا نام لکھوں گھومتا پھروں
میں بھی درِ رسول کا بن کر گدا پھروں

؎ میں نے جیسے ہی انہیں آواز دی
بس مری دیوار میں در ہو گا

؎ نبی کی فرقتِ اقدس میں اونٹنی تھی نڈھال
کنارے آنکھ کے رہنے لگے تھے گیلے سے

'متاع' میں تمثال کاری کی ندرت قابل تعریف ہے۔ 'متاع کی تمثال نگاری' یہ ایک الگ لائق مقالہ موضوع ہے۔

'متاع' میں امیجز کی مختلف قسمیں ملتی ہیں ساکن تصویری امیج، متحرک امیجز، کلاسٹر (Cluster) امیج وغیرہ۔ اویس نے ان امیجز سے نہ صرف اپنی نعت بلکہ معاصر نعت کا اعتماد اور وقار بھی بڑھایا ہے اس کی تمثال نگاری کا یہ کمال ہے کہ اُن کے نعتیہ کلام میں امیج برائے امیج استعمال نہیں ہوئے بلکہ وہ اُن کی نعت نگاری کے معنوی سیاق و سباق کا حصہ بن کر آئے ہیں بعض اشعار میں اُن کی حیثیت علامت کی ہو گئی ہے۔

اویس نے زبان و بیان کے معاملے میں بعض رعائتیں بھی روا رکھی ہیں جو لسانی 'اجتہاد' کے زمرے میں آتی ہیں مثلاً لفظوں اور ترکیبوں کے حوالے سے کہیں کہیں اُن کے ہاں بے تکلفانہ انداز ملتا ہے جس میں مقامی زبان کے اثرات نمایاں ہیں اسی طرح اویس کی نعت میں ایک دو انگریزی الفاظ جن سے ہماری نعتیہ فضا ابھی پوری طرح مانوس نہیں ہوئی کا قرینہ بھی نظر آتا ہے (اگرچہ محسن کاکوروی کے معروف نعتیہ قصیدے ؎ سمتِ کاشی سے چلا جانبِ متھرا بادل ___ ہی سے نعت میں انگریزی لفظوں کا سراغ ملنا شروع ہو جاتا ہے) اویس راجا کے ہاں بعض قرآنی الفاظ بھی اپنے خاص مفہوم میں توجہ طلب ہیں۔ انہوں نے اپنے نعتیہ جذبات کی ترسیل میں 'مناسب جگہ پر مناسب الفاظ' (Proper words in proper places) کا فنکارانہ گُر استعمال کیا ہے۔ مثلاً داسی، درشن، پھاگن، سکول، کلاس، عینک، بیٹھک، چیچک جیسے الفاظ کو خوبصورتی سے برتا ہے۔

اویس کی نعتیہ لسانیات پر توجہات سے پتہ چلتا ہے کہ ان کے تخلیقی انداز میں اظہار اور ابلاغ کی اہمیت زیادہ ہے جو لفظ انہیں موقعہ و محل کی مناسبت سے بہتر لگتا ہے وہ بے تکلف اس کا استعمال کرتے ہیں۔ ان الفاظ ___ تراکیب اور ان کے استعمال کی کچھ ملی جلی مثالیں دیکھئے۔

؎ تم راعنا نہ کہنا یہ حکمِ صریح ہے
لوگو صدا کرو تو یہ رکھنا ہے دھیان خاص

؎ آقا ہو تمنائے مدینہ یہ امر کاش
ہر روز رہوں مَیں بھی وہاں شام و سحر کاش

؎ بھٹکا ہُوا ایک روز مدینے میں پہنچ جائے
الجھا ہوا حالات کی گنجلک میں بشر کاش

؎ داغ عصیاں کے تو آ جاتے مرے چہرے پر
ختم کرتے جو نہ سرکار یہ چیچک میری

؎ حضُور آپ کے ہاتھوں میں لاج ہے میری
مری سرشت میں عصیاں و بھول شامل ہے

؎ نعت لکھتا تھا نہ سنتا تھا نہ پڑھتا تھا کبھی
رات دن غم سے بھری رہتی تھی بیٹھک میری

؎ ان کو آواز بھی دینے کے ہیں آداب کئی
''راعنا'' جیسی کوئی لفظی گرانی نہیں دوست

؎ منہ کی کھانی پڑے خدا سے اسے
راعنا کہہ کے جو بلاتا ہے

؎ کیسی درگت بنائی ہے رب نے
وہ جو کہتے تھے راعنا، ان کی

؎ مچی ہوئی ہے عجب کھلبلی سی محشر میں
''کلاس'' جیسے ہو استاد کے بغیر آقا

؎ حراسی خامشی اپنا لو راجہ
تمہیں گر اپنا اندر مانجھنا ہے

؎ کیا ہے اخذ یہی میں نے کتبِ سیرت سے
خدا ادھر ہے جدھر مرتضیٰ کا 'لالا' ہے

؎دور پڑتا تھا اپنا آپ مجھے
ہو گیا پاس تر مدینے سے

؎تُو داسی بن محمد کی
کرے گا جگ ترے درشن
خزاں کا دور تھا راجا
وہ بن کر آ گئے پھاگن

؎یہ حمد و نعت سپاسی اساس ہے میری
مری نمود میں میرا سکول شامل ہے

؎دیکھ سکتا ہوں، جہاں بھی ہوں، مدینہ ان کا
دور و نزدیک کی اب ایک ہے عینک میری

؎نہیں خدا وہ خدا سے مگر جدا بھی نہیں
تو اپنی ٹیڑھی سی عینک ذرا اتار کے دیکھ

؎خدا کا ذکر کہ جو نور بھی ہے ٹھنڈک بھی
تو نعت پاک مری عین بھی ہے عینک بھی

؎نعلین اُن کے عرشِ بریں تک گئے ہوئے
سدرہ سے آگے 'شہرِ نہیں' تک گئے ہوئے

؎ذکر اب دونوں کریموں کا ہے ٹھنڈک میری
حمد ہے تاج مرا نعت ہے اجرک میری

داغ عصیاں کے تو آ جاتے مرے چہرے پر
ختم کرتے نہ جو سرکار یہ چیچک میری

دیکھیں 'چیچک' کا لفظ کیسے استعمال ہوا ہے یہاں میر تقی میر کا ایک شعر یاد آ رہا ہے جس میں انہوں نے 'پھوڑا' جیسے کریہہ الصّوت لفظ کو برتا ہے۔

پھوڑا سا ساری رات جو دکھتا رہے گا دل
تو صبح تک تو ہاتھ لگایا نہ جایا جائے گا

میرؔ نے اس شعر میں ایک خوبصورت تشبیہ سے پھوڑا کے لفظ کو کس طرح قابل قبول بنا دیا ہے اویس راجا کے ہاں 'چیچک' 'بیٹھک' 'عینک' اور دوسرے خط کشیدہ الفاظ و تراکیب دیکھئے۔ یہ نسبتاً غیر شاعرانہ اور غیر متداول استعمال ان کی نعت میں کیا خوبصورت انداز میں استعمال کیا ہے۔ اویس راجا کے ہاں نعتیہ سیاق و سباق میں اس استعمال کو بھی نا صرف مانوس بنا دیا ہے بلکہ مستقبل کی نعتیہ لسانیات اور لفظیات کی معنوی تازہ کاری (Neology) کے راستے کی نشاندہی بھی کر دی ہے۔ واضح رہے کہ اویس راجا کے ہاں یہ الفاظ صرف مفاہیم کو ہی اجاگر نہیں کرتے بلکہ اپنی دلالتِ وضعی میں بھی قرینے سے جُڑے ہوئے ہیں۔

نعت کی صنف سے اویس کا انسلاک رسمی اور جز وقتی نہیں فطری ہے انہوں نے نعت کے موضوع، نعت سے وابستگی، نعت کی برکت اور دوسرے ثنا نگاروں کے حوالے سے بھی کئی شعر لکھے ہیں جو نہ صرف نعت سے اُن کی فدویت اور شیفتگی کے مظہر ہیں بلکہ نعت سے زندگی میں پیدا ہونے والی بہجت اور سکینت کے ترجمان بھی ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں۔

؎تیرے نزدیک ہو گی صنفِ سخن
نعت کو میں عصا سمجھتا ہوں

؎صنفِ نعتِ رسول کو راجہ
شعر کا تزکیہ سمجھتا ہوں

؎میں ایک وقت میں طالب تھا دو جہانوں کا
نبی کی نعت سے ہونے لگی کمائی مری

؎جب بھی کہیے نبی کی نعت کوئی
ایک اک لفظ کو عطا کہیے

اویس راجا نے اپنے منفرد اندازِ نعت میں تراکیب پر بھی توجہ دی ہے بعض متداول تراکیب کو بھی خوبصورتی سے برتا ہے اور بعض نئی تراکیب بھی تخلیق (Coin) کی ہے یہاں کچھ ملی جلی تراکیب کی فہرست دی جا رہی ہے۔

رخِ یار، ثنا سراؤں، زوالِ خاص، لفظ و خیال خاص، حزن و ملال خاص، مجال خاص، خصال خاص، مخزنِ انوار، گل زار، امر کاش، زمینِ نعت، کاروانِ ثنا، شانِ کریمی، مآلِ حکمِ عدولی، فرقتِ اقدس، فردِ عصیاں، کفِ سخن، شرطِ قبول، بردِ زمانہ، اذنِ سوال، تابِ گدائی، میانِ حجرہ و منبر نشانِ رحمت، جہانِ رحمت، گمانِ رحمت، نامِ حضورِ والا، اذانِ رحمت، باغبانِ رحمت، بیانِ رحمت، سائبانِ رحمت، نانِ رحمت، دفاعِ احمد، مشامِ جاں، انتظارِ پیمبر، حسنِ عفو، جانِ گرامی، مختارِ نعمتاں، محیطِ عالم، اوجِ قسمت، ذکرِ احمد، عہدِ نارسائی، شہرِ ذکا، سینۂ موجِ ہوا، کنجِ ضیا، شہرِ بقا، رحمت رساں، شعارِ صبر و تحمل، بارِ غلامی، دستارِ غلامی، دیوارِ غلامی، اسرارِ غلامی، پندارِ غلامی، فردِ عصیاں، سوادِ اعظم، چشمِ سرکارِ دو عالم، خوفِ ہوا، رسولِ مکرم، طائرِ ثناء، رزقِ ثنا، کبرِ مؤدت، طرزِ استغاثہ، مقبولِ بارگاہ، دورانِ نعت، احسانِ نعت وغیرہ وغیرہ۔

اگر ان تراکیب کو شعروں کے سیاق و سباق میں دیکھیں تو تراکیب کے حسنِ استعمال کا اندازہ ہوتا ہے یہاں کچھ ایسے شعروں کی مثالیں دی جا رہی ہیں جن میں تراکیب کے استعمال سے نعتیہ شعروں کی جمالیات اور معنویت اوراجاگر ہو گئی۔

فی الوقت جیسا اب ہمیں عرفانِ نعت ہے

بس طرزِ استغاثہ ہی شایانِ نعت ہے
؎ دنیا تو دے رہی ہے صدا پر صدا مجھے
میں اٹھ کے جاؤں کیسے یہ دورانِ نعت ہے
؎ وہ لاشریک بھی خود ہے شریکِ بزم صلوٰۃ
خدائے پاک کا خود بھی تو ہے شعار درود

بحیثیت مجموعی اویس راجا عام مجلسی انداز کی نعت گوئی سے مختلف ادبی انداز کے نعت نگار ہیں 'مجلسی' اور 'ادبی' لفظوں کی وضاحت کی ضرورت شاید نہیں کہ ذرا غور کرنے سے نعت کے ان مختلف اسلوب کا فرق سمجھ میں آجاتا ہے ہماری اردو نعت میں مجلسی نعت گو وہ شاعر ہیں جن کے فکر وفن میں عوامی انداز کا لب ولہجہ نمایاں ہوتا ہے ان کے مضامین بھی عام طور پر وہ ہوتے ہیں جنہیں عوام پسند کرتے ہیں زبان و بیان کے لحاظ سے اور تلفظات کے اعتبار سے مجلسی نعتوں کا انداز کھلا ڈھلا ہوتا ہے نعت کا ادبی اسلوب مضامین اور اظہار دونوں حوالوں سے ذمہ دارانہ طرزِ فکر احترام انگیز اظہار کا حامل ہوتا ہے فنّی مہارت کا نمونہ اور جدّت وندرت کے ادبی وسائل اور ساز وسامان سے آراستہ ___ نعت گوئی اور نعت نگاری میں یہی فرق ہے جسے سنجیدہ فکرِ قارئین ہی سمجھ سکتے ہیں۔

اویس راجا کی نعت نگاری مجلسی انداز کی نعت گوئی سے بہت مختلف ہے ان کی نعتیہ زمینیں زیادہ تر طبع زاد ہیں اور تخلیقی امکانات کی عکاس ___ سیرتی واقعات کا شعری زبان میں ایسا اظہار جو محاکات اور ایجاز کی خصوصیات سے آراستہ ہے تشبیہ و استعارہ، علامات اور دوسرے شعری محاسن ان کے اسلوب میں نمایاں ہے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم آل اطہار اور صحابہ کی محبت اور ان کے احوال سیرت کا بیان بھی ایک قرینے سے ان کی نعت گوئی کا حصہ ہے ان کی نعت نگاری کے مضامین میں کچھ مضامین نعت ایسے بھی ہیں جو بالکل تازہ ہیں اور پہلی بار اردو نعت کا حصہ بنے ہیں۔ یہ شعر دیکھئے:

؎ نہیں لوٹا نواسہ کربلا سے
ابھی بیٹی نہیں ہے سوئی ان کی
؎ مدتوں سے مرے رسولِ کریم
ایک یثرب مرے مضاف میں ہے
؎ کہانی آ گئی عیسٰی کے دور تک لیکن
ادھوری تھی ترے میلاد کے بغیر آقا
؎ جب مرے پیشِ نظر آپ کا جلوہ ہوگا۔۔!
ایک وہ لمحہ بھی تو قبر کے لمحات میں ہے
؎ اگر پڑھے تُو بغور اس کو
کتاب کیا ہے سوائے مدحت
؎ ایسی کھلی ہے آنکھ انہیں دیکھنے کے بعد
اب تو خدا بھی آنکھ سے اوجھل نہیں رہا
؎ خموشی اوڑھ لی ہے تن بدن پر
سماعت کو زیادہ کر لیا ہے
؎ عشقِ نبی سے اتنا توازن تو آ گیا
سینے کے طاقچے میں ہیں دونوں، ہوا، چراغ

'متاع' اویس راجا کی نعتیہ شاعری کا پہلا پڑاؤ ہے جو اپنی شعری جمالیات اور تاثیر کے سبب ایک رجحان ساز مجموعہ ہے مجھے امید ہے وہ اپنی مصروفیات میں سے نعت نگاری کے لئے اور وقت نکالیں گے اور اردو نعت کو ایسے کئی مجموعے دیں گے اللہ ان کی توفیقات نعت میں اضافے فرمائے (آمین)

مرزا غالب کی عقیدت اہلِ بیت (علیہم السلام) کے حوالے سے بہت گہری اور محبت بھری تھی۔ ان کی شاعری میں اہلِ بیت کے مقام کو بہت بلند پیش کیا گیا ہے اور ان کے فضائل اور عظمت کو مختلف اشعاروں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ غالب کی شاعری میں اہلِ بیت کے حق میں عقائد کی واضح پیشگوئی کی گئی ہے، اور وہ اپنی شاعری کے ذریعے اہلِ بیت کے عظمت و فضائل کو اظہار کرتے رہے۔ ان کی شاعری میں اہلِ بیت کے مقام کو احترام سے نوازا گیا ہے اور ان کی محبت کا اظہار کیا گیا ہے۔

شاعری ایک حد تک آزادی اور لچک پیش کرتی ہے جس کی اکثر مواصلات کی دوسری شکلوں میں کمی ہوتی ہے۔ شاعروں کے پاس زبان، شکل اور ساخت کے ساتھ تجربہ کرنے کا تخلیقی اجازت نامہ ہوتا ہے، جس سے وہ اپنے آپ کو مستند اور بغیر کسی رکاوٹ کے اظہار کر سکتے ہیں۔

وقت گزرنے کے ساتھ، طنزیہ اور مزاحیہ مزاحیہ ادب مختلف شکلوں اور ذرائع کو گھیرنے کے لیے تیار ہوا، بدلتے ہوئے ثقافتی مناظر کے مطابق۔ اگرچہ روایتی ناول اور تحریری کام اثر انداز رہتے ہیں، ڈیجیٹل میڈیا کے عروج نے ویب کامکس، طنزیہ بلاگز، اور آن لائن پلیٹ فارمز کی ایک بڑی تعداد کو جنم دیا ہے جو مزاحیہ کنارے کے ساتھ تیز سماجی تبصرے پیش کرتے ہیں۔ یہ ارتقاء عصری مواصلاتی چینلز کے لیے صنف کی موافقت کی عکاسی کرتا ہے اور سامعین تک وسیع اور متنوع رسائی کی اجازت دیتا ہے۔

تفرداتِ جہاندار بحوالہ اجمعین

مرزا حفیظ اوج (ملتان)
معاون مدیر: سہ ماہی ورثہ نیویارک

جہاندار منظر القادری سے میرا پہلا تعارف سوشل میڈیا کے ذریعے ہوا۔ اب یہ تو یاد نہیں کہ میری طرف سے پہل ہوئی تھی یا ان کی طرف سے مگر اب رابطہ بہت مضبوط اور مستقل ہے اور اس کی ایک وجہ جو مجھے یاد ہے وہ یہ کہ جب میرا پہلا نعتیہ مجموعہ "ذکرِ منیر" شائع ہوا تو موصوف نے اس پر کمال لکھا اور ایسے نکات بیان کئے جو میں خود بھی نہیں جانتا تھا۔ جہاندار منظر القادری کی نسبت سلسلہ قادریہ رضوی عطاریہ سے ہے اور ابتدا سے ہی ان کا گھریلو دینی ماحول ان کی طبیعت کو وادیٔ نعت و مناقب کی طرف انگلی پکڑ کر چھوڑ آیا۔ ان کا وادیٔ نعت و مناقب میں ابھی تقریباً چھ برس کا وقت ہی گزرا ہے اور ان چھ سالوں میں ان کے دو نعتیہ مجموعے "کاسہ" اور "بخشش" اور ایک مجموعہ مناقب "اجمعین" نا صرف شائع ہوئے بلکہ علمی و ادبی حلقوں میں خوب پذیرائی حاصل کر چکے حالانکہ "اجمعین" ان کی حالیہ تصنیف ہے جو عقیدت نوائی پر مشتمل ہے۔

اجمعین موضوع کے اعتبار سے انفرادیت رکھتی ہے اور یہ سعادت بلاشبہ جہاندار منظر القادری کے حصے میں پہلے آ گئی۔ "اجمعین" کل نو ابواب پر مشتمل ہے۔

باب اول:

حمد و نعت کے بعد رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے والد گرامی حضرت عبداللہ اور والدہ ماجدہ حضرت آمنہ، رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رضاعی ماں حضرت حلیمہ سعدیہ، چچا حضرت حمزہ اور حضرت عباس اور حضرت حلیمہ کی بیٹی اور رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی رضاعی بہن حضرت شیما کے مناقب پر مشتمل ہے۔

باب دوم:

خلفائے راشدین کے فضائل و مناقب پر مشتمل ہے اور بلترتیب سب سے پہلے حضرت ابوبکر صدیق پھر حضرت عمر فاروق پھر حضرت عثمان غنی پھر حضرت علی المرتضیٰ رضوان اللہ علیہم اجمعین کے دو دو مناقب شامل ہیں۔ خلافت راشدہ کے تیس سالوں میں آخری چھ ماہ حضرت حسن مجتبیٰ کے بھی علمائے نے شامل کئے ہیں سو اسی مناسبت سے ان چاروں برگزیدہ ہستیوں کے بعد دو مناقب حضرت حسن مجتبیٰ کے اس باب میں شامل کئے گئے ہیں۔

باب سوم:

رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کے خاندان کے مناقب پر مشتمل جن میں سب سے پہلے حضرت فاطمہ، حضرت علی، حضرت حسن، حضرت حسین کے مناقب شامل ہیں ان کے بعد امہات المؤمنین کے مناقب بلترتیب جمع کئے گئے ہیں۔ امہات المؤمنین کے مناقب کے بعد رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی اولاد کے فضائل و مناقب شامل ہیں اور اس باب کے آخر میں حضرت سلمان فارسی کی ایک منقبت شامل کی گئی ہے جسے اس باب میں شامل کرنے کی وجہ موصوف نے خود بیان کی ہے۔

باب چہارم:

ان دس اصحاب مبشرہ کی منقبت پر مشتمل ہے جنہیں دنیا میں رہتے ہوئے رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم نے جنت کی سند عطا فرمائی۔ ان عشرہ مبشرہ کی تعریف و توصیف پر مشتمل اس باب میں دس مناقب شامل ہیں۔

باب پنجم:

آئمہ اہل بیت اطہار (بارہ اماموں) کے مناقب پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مولائے کائنات سے لے کر امام مہدی تک کے ائمہ کی شان بصورت اشعار کمال انداز میں بیان کی گئی۔ جسے اللہ کی عنایت اور شیوخ قادریہ کی خاص توجہ کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔

باب ششم:

چند صحابہ کرام جن میں حضرت ابوذر غفاری، حضرت بلال، حضرت خالد بن ولید، حضرت ابوہریرہ، حضرت حنظلہ، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت عمیر ابن عدی، حضرت حسان بن ثابت، حضرت معصب بن عمیر، حضرت سمیہ، یاسر بن عامر، عمار بن یاسر، صہیب رومی اور حضرت عبداللہ ابن مسعود رضوان اللہ علیہم اجمعین شامل ہیں کے مناقب پر مشتمل ہے۔ اور ان کے بعد حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد جو کربلا میں شہید ہوئی ان کے مناقب شامل ہیں۔

باب ہفتم:

پنجتن پاک اور شہدائے کربلا کے مناقب پر مشتمل ہے۔ اس باب میں کل سات کلام جمع کیے گئے ہیں۔

باب ہشتم:

اہلسنت کے چار اماموں کے مناقب پر مشتمل ہے۔ جن میں نعمان بن ثابت (امام اعظم ابوحنیفہ)، مالک بن انس (امام مالک) محمد بن ادریس شافعی (امام شافعی) اور امام احمد بن حنبل شامل ہیں۔ اس باب میں ان چاروں آئمہ کے خصائص کے پھول نہایت خوبصورتی سے اشعار کی مالا میں میں پروئے گئے ہیں۔

باب نہم:

جو جہاندار منظر القادری کی کتاب عقیدت "اجمعین" کا آخری باب ہے پانچ مناقب اور گیارہ قصائد پر مشتمل ہے۔ اس باب میں چاروں سلاسل کے آئمہ طریقت کے مناقب شامل ہیں۔ پہلی منقبت شیخ عبدالقادر جیلانی (غوث الاعظم)، دوسری شیخ بہاءالدین نقشبند، تیسری خواجہ معین الدین چشتی اجمیری، چوتھی شیخ شہاب الدین عمر سہروردی اور پانچویں منقب عبداللہ شاہ غازی کی تعریف وتوصیف پر مشتمل ہے۔ اسی باب میں گیارہ موضوعاتی قصائد بھی شامل کئے گئے ہیں جن میں قرآن، حرمین طیبین، غارِ حراوثور، قصر دنی، نجف، غدیر خم، کربلا، بیت المقدس اور بغداد معلیٰ کے قصائد شامل ہیں۔

مجموعی طور پر "اجمعین" ایک ایسی کتاب ہے جس میں انفرادیت کے ساتھ ساتھ جو خصوصیات دیکھی جاسکتی ہیں وہ یہ ہیں:

1۔ اجمعین میں زمانی ومکانی ترتیب کا التزام کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی شخصی درجہ بندی کو خاص اہمیت دی گئی ہے۔

2۔ اجمعین کے کلام حسن بلاغت سے بھرپور ہیں جنہیں پڑھ کر بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ جہاندار بھائی بات کہنے کا سلقیہ رکھتے ہیں۔ اور اس میدان میں مہارت تامہ رکھتے ہیں۔

3۔ اجمعین میں شامل بعض اردو مناقب تو ایسے ہیں جو شاید ان سے پہلے کسی نے نہیں کہے۔

4۔ تمام مناقب حسنِ ترتیب کے علاوہ مربوط، منظم اور شائستگی سے کہے گئے ہیں جب میں ایک خاص توازن نظر آتا ہے۔

5۔ اجمعین کی فہرست دیکھ کر لگتا ہے کہ یہ ساری تخلیق آورد ہے اور سوچے سمجھے انداز سے لکھی گئی ہے مگر جب کلام پڑھتے ہیں تو زور زبردستی سے کہا ہوا ایک شعر بھی نظر نہیں آتا بلکہ ساری کی ساری کتاب آمد اور عطا دیکھائی دیتی ہے۔

6۔ عصرِ حاضر میں لکھی جانی والی کتب مناقب میں تفرد کی حیثیت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس میں کچھ موضوعات ایسے ہیں جو ان سے پہلے ایک ہی کتاب میں جمع نہیں دیکھے گئے۔

7۔ اجمعین میں محاسن شعری کے ساتھ افراط وتفریط سے اجتناب نظر آتا ہے حالانکہ مناقب لکھنے والا اکثر اس کا شکار ہوجاتا ہے۔

8۔ اگر "اجمعین" کے مصادر کو دیکھا جائے تو امہات الکتب سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ساتھ ہی روایت کی صحت وسند بھی مستند نظر آتی ہیں۔

"اجمعین" کی اشاعت کے بعد جہاندار منظر القادری نے اہل قلم کے لئے مناقب کے کچھ ایسے باب بھی تشنہ چھوڑ دیئے جن پر کلام کہا جاسکتا ہے بلکہ کثیر اور مربوط کام کیا سکتا ہے۔ ان موضوعات میں

1۔ بدری صحابہ
2۔ عہد رسالت وخلافت راشدہ میں اسلام کے مشہور جرنیل وسپہ سالار
3۔ غزوات وسرایا میں شامل اسلامی افواج وفوجی
4۔ اسلامی فتوحات
5۔ اصحاب صفہ
6۔ رسول مکرم صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی مکی زندگی کے تبلیغی مراکز (دارِارقم وغیرہ)
7۔ ہجرت مدینہ کے بعد کے تبلیغی مراکز (مسجد نبوی وغیرہ)
8۔ کاتبین وحی وغیرہ

اجمعین بلاشبہ جہاندار منظر القادری کا منفرد کارنامہ ہے جس کی اشاعت پر میں انہیں دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ ان کی یہ کاوش اللہ ورسول عزوجل وصلی اللہ علیہ والہ وسلم کی بارگاہ میں مقبول ہو اور ان کے علم وقلم میں اللہ مزید برکات واضافہ فرمائے۔

یہ درست ہے کہ تھیٹر آف دی ایبسرڈ اردو ادب کی صنف نہیں ہے۔ یہ ایک اصطلاح ہے جو بنیادی طور پر مغربی ڈرامہ اور ادب سے وابستہ ہے، خاص طور پر 20ویں صدی کے وسط میں یورپی ڈرامہ نگاروں کے کام۔ یہ وجودیت اور انسانی وجود کی مضحکہ خیزی سے متعلق موضوعات پر مرکوز ہے، جیسا کہ میرے پچھلے جواب میں ذکر کیا گیا ہے۔
دوسری طرف اردو ادب کی اپنی ایک بھرپور روایت اور انواع ہیں، جن میں شاعری، افسانہ، ڈرامہ اور مضامین شامل ہیں۔ اگرچہ اردو ادب وجودی موضوعات اور انسانی حالت کو بھی تلاش کرسکتا ہے، لیکن یہ اردو بولنے والی دنیا کے ثقافتی اور لسانی تناظر میں ایسا کرتا ہے۔ اردو کے ممتاز ادیبوں اور ڈرامہ نگاروں نے اپنے منفرد اسلوب اور موضوعات کے ساتھ اردو ادب کی ترقی میں اپنا حصہ ڈالا ہے لیکن تھیٹر آف دی ایبسرڈ کا تصور اس روایت کا حصہ نہیں ہے۔

طنزیہ اور مزاحیہ مزاحیہ ادب، اپنی مختلف شکلوں اور ذرائع میں، ثقافتی گفتگو کو تشکیل دینے میں ایک متحرک اور بااثر قوت کے طور پر جاری ہے۔ جیسے جیسے معاشرہ ترقی کرتا ہے، اسی طرح طنز کی نوعیت، نئی ٹیکنالوجیز کے مطابق ہوتی ہے اور عالمی ثقافت کی بدلتی ہوئی حرکیات کی عکاسی کرتی ہے۔ چیلنجوں اور تنازعات کا سامنا کرتے ہوئے، یہ صنف تنقیدی سوچ کو فروغ دینے، اتھارٹی کو چیلنج کرنے، اور ہمیشہ سے پیچیدہ دنیا میں انتہائی ضروری مزاحیہ ریلیف فراہم کرنے کے لیے ایک لازمی ذریعہ بنی ہوئی ہے۔ جیسا کہ تخلیق کار طنز پیش کرنے کے جدید طریقے تلاش کرتے ہیں، اس صنف کی سوچ کو بھڑکانے اور تفریح فراہم کرنے کی صلاحیت بے حد معلوم ہوتی ہے۔

گوشہء غزلیات

انصر رشید

اس کو قدموں پہ نہیں دار پہ رکھا جائے
سر اگر سر ہے تو معیار پہ رکھا جائے

درد دل ہے یہ دواؤں کا نہیں کام کوئی
ہاتھ ہی اب دل بیمار پہ رکھا جائے

صرف کردار کہانی میں رکھے جاتے ہیں
اب کہانی کو بھی کردار پہ رکھا جائے

ہر دیا تیز ہواؤں سے نہیں بجھ سکتا
کیوں نہ اس دل کو ہی دیوار پہ رکھا جائے

حاصل زیست مرے دوست مرا سرمایہ
آسرا کیوں کوئی اغیار پہ رکھا جائے

اور بڑھ جائے گی سورج کی تمازت اس سے
زلف خم دار کو رخسار پہ رکھا جائے

ہاتھ تلوار پہ رکھنا ہے تو پہلے انصر
اپنی گردن کو ہی تلوار پہ رکھا جائے

نیاز جیراجپوری

یاد آتی رہتی ہے جب تب تمہارے چہرے کی
رنگتیں سب حاضر و غائب تمہارے چہرے کی

چودھویں کی رات تھی کل اِنشاؔ جی کے ساتھ ساتھ
کر رہے تھے باتیں سب کے سب تمہارے چہرے کی

نیند تو آتی نہیں ہے خواب آتے رہتے ہیں
دیکھ لی آنکھوں نے جب سے چھب تمہارے چہرے کی

باغی ہو جائیں گی آنکھیں ورنہ یُوں ہی میں کبھی
عیب جوئی کرتا بے مطلب تمہارے چہرے کی

سُننے میں آتا ہے اِس کا چاند چوری ہو گیا
آسماں لے گا تلاشی اب تمہارے چہرے کی

لوگ اُٹھا لیں گے سَروں پر آسماں کو ورنہ تو
سَیر کرنا چاہیں میرے لب تمہارے چہرے کی

کیا کہا جائے نہ اس کہہ پانے کو اُس سے نیازؔ
جُستجو آنکھوں کو روز و شب تمہارے چہرے کی

شاداب احسانی

دن رات جو اک ساتھ گزارے
سارے ہی کرتوت ہمارے ہیں ہمارے

انسان ہی انسان کا دشمن ہے مری جان!
دھرتی پہ قیامت کے اشارے ہیں اشارے

فطرت کی کشش اپنی طرف کھینچ رہی ہے
تا حد نظر ایسے نظارے ہیں نظارے

اُس کی نظر ایسی پڑی ایسی پڑی مجھ پر
اب تو مرے بھی وارے نیارے ہیں نیارے

تقدیر ہے تدبیر کے پردے میں نمایاں
خود اپنے تعاقب میں ستارے ہیں ستارے

وہ ہم ہی سمندر تھے کبھی نیند و بلا خیز
اور آج سمندر کے کنارے ہیں کنارے

ہر عہد میں ہے عشق کی یہ کارگزاری
شاداب تمہارے تھے تمہارے ہیں تمہارے

بالی ووڈ فلموں میں اکثر ثقافتی تہواروں اور روایات کو دکھایا جاتا ہے، جن میں اردو ثقافت کی جڑیں بھی شامل ہیں۔ عید، دیوالی، ہولی اور دیگر تہواروں کو فلموں میں دکھایا جاتا ہے، جس سے ناظرین ان مواقع سے منسلک رسوم، رسومات اور تقریبات کے بارے میں بصیرت حاصل کر سکتے ہیں۔ یہ نہ صرف ثقافتی بیداری کو فروغ دیتا ہے بلکہ ہندوستان میں متنوع برادریوں کے درمیان اتحاد اور افہام و تفہیم کے احساس کو بھی فروغ دیتا ہے۔

روایتی شکلوں کا احیاء: کچھ ڈرامہ نگار اور تھیٹر گروپ اردو ڈرامے کی روایتی شکلوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں اور اسے بحال کر رہے ہیں، جیسے "داستان گوئی" (کہانی سنانے) اور "کٹھ پتلی تھیٹر"۔ یہ احیاء ایک عصری موڑ کا اضافہ کرتے ہوئے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے میں مدد کرتا ہے۔

اردو ڈرامہ معاشرے اور فنون لطیفہ کی بدلتی ہوئی حرکیات کے مطابق ارتقاء اور ڈھل رہا ہے۔ یہ اظہار کی ایک متحرک اور بااثر شکل ہے، جدت اور تنوع کو اپناتے ہوئے موضوعات اور مسائل کی ایک وسیع رینج کو حل کرتی ہے۔ یہاں جن رجحانات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ڈرامہ ادب اور فنون لطیفہ کی عصری دنیا میں نہ صرف زندہ ہے بلکہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔

گل بخشالوی

مکین گھر کا خود اپنے ہاتھوں ہی گھر جلائے
سلگتی لاشوں پہ اشک آ کر بھی خود بہائے

ہے گھر میں دشمن، تو میرا دشمن نہیں ہے پاگل
کہ میرے گلشن میں آئے آ کر لہو بہائے

صدائے حق میں قلم زباں کے وہ تھے مجاہد
نجانے کتنے جوان جذبے لہو نہائے

جو تھے محافظ عظیم ملت کے ان کے ہاتھوں
جوان لاشیں ضعیف کندھوں پہ ہیں اٹھائے

سڑک پہ بھوکی سفید پوشی کو دیکھ کر ہی
کسی کی آنکھوں میں اشک کوئی تو جھلملائے

میں گھر کے اندر اداس لمحوں میں در ہوں کھولے
کوئی تو آئے خوشی کا نغمہ مجھے سنائے

وہ جن کے شانوں سے گل سروں کو کٹا رہے ہیں
ان ہی نے عشق مدینہ ثانی کے گیت گائے

عنبریں حسیب عنبر

وہ مسیحا نہ بنا ہم نے بھی خواہش نہیں کی
اپنی شرطوں پہ جیے اس سے گزارش نہیں کی

اس نے اک روز کیا ہم سے اچانک وہ سوال
دھڑکنیں تھم سی گئیں وقت نے جنبش نہیں کی

کس لئے بجھنے لگے اول شب سارے چراغ
آندھیوں نے بھی اگرچہ کوئی سازش نہیں کی

اب کے ہم نے بھی دیا ترک تعلق کا جواب
ہونٹ خاموش رہے آنکھ نے بارش نہیں کی

ہم تو سنتے تھے کہ مل جاتے ہیں بچھڑے ہوئے لوگ
تو جو بچھڑا ہے تو کیا وقت نے گردش نہیں کی

ڈاکٹر فیاض احمد علیگ

ہار جانا مجھے یوں بھی کبھی منظور نہیں
وار تیرا بھی تو ظالم کوئی بھرپور نہیں .

کتنی سفاک ہے دنیا یہ کبھی دیکھ ذرا
ہم ہیں مجبور خدایا تو تو مجبور نہیں .

تیرے جانے سے مری جان یہ نقصان ہوا
گل میں وہ رنگ نہیں شمع میں وہ نور نہیں .

خون دل سے جو لکھا میں نے فسانہ یارو
اس فسانے میں مرا نام ہی مذکور نہیں .

دیکھ ! زاہد ! مجھے حوروں کا حوالہ مت دے
میری لیلی کے مقابل تو کوئی حور نہیں .

جب سے پھیری ہیں مری جان نگاہیں تم نے
تب سے رندوں میں کوئی شخص بھی مخمور نہیں .

دل کو فیاض طلب ہے تو اسی کی اب بھی
اس سے کم تو کوئی صورت اسے منظور نہیں

ریپ (نظم)

نصیر وارثی

عدل کے ایوانوں میں انصاف جب کہ بکتا ہے
ظالموں کے قدموں پر انصاف سارا جھکتا ہے

جب یہ کالی وردی والے سایہ دارِ قاتل ہوں
کون مرحم رکھ سکتا ہے؟ ہر جا پہ ہی کربل ہوں

ریپ کا مجرم کیسے دیکھو دندناتا پھرتا ہے
مظلموں کی دادرسی کی کون حامی بھرتا ہے

ساری تقریری ہیں جھوٹی، سارے وعدے جھوٹے ہیں
سب وزیر و سینٹ ممبر مجھ کو ڈاکو لگتے ہیں

کیسا نظم وضبط ہے یہ اور کیسا کھیل تماشہ ہے
جب یہاں پر مجرم خود سے ہی محافظ بنتا ہے

گویا کہ انصاف خرید و جس کے ہاتھ میں پیسے ہیں
اربابِ حل العقد یہاں پر خنجر لے کے پھرتے ہیں

سب نشہ اس طاقت کا ہے جس سے وحشی بنتے ہیں
اور مظلموں کی آہیں گردِ راہ بناتے ہیں

یاد کرو کہ ظلم کی عمریں اتنی لمبی کب ہوتی ہیں
ظالموں کے ظلم کے آگے جنم بغاوت لیتی ہے

اب قلم سے مل کر سارے ضربیں خوب لگائیں گے
ظلم کے ایوانوں کو ہم جا کے ہوش دلائیں گے

اب یہاں پُر جوش جواں ہر ایک گلی میں آئیں گے
بے نوا سے لوگ بھی مل کر جنگ لڑنے جائیں گے

یہ جو تخت نشیں بیٹھے ہیں قاتلوں کے حامی ہیں
اصل میں یہ لوگ نصیر اس معاشرے کی خامی ہیں

گوشہء افسانہ

کلموہی

حنا خراسانی رضوی (سویڈن)
نمائندہ خصوصی سہ ماہی ورثہ نیویارک

نرجس کمرے کے دروازے کے باہر کھڑی پالنے میں لیٹے اپنے چھوٹے بھائی عابد کو اشتیاق اور محبت سے دیکھ رہی تھی کہ اچانک اُس کی چھوٹی امّی شائلہ وہاں آ گئی۔

نرجس کو دیکھ کر وہ تیز آواز میں برہمی سے بولی۔" یہاں کیا کر رہی ہو؟ تم نا کہ عابد کے پاس نہیں جایا کرو سمجھ میں کیوں نہیں آتا تمہاری۔۔۔لگتا مجھے پھر سے تمہارا دماغ اچھی طرح درست کرنا پڑے گا۔"

کہا۔۔۔شائلہ کی آواز سن کر نرجس کی دادی حمیدہ بیگم ہاتھ میں تسبیح گھماتی تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنے کمرے سے نکل کر آئیں اور نرجس کے پاس آ کر اس کی پیٹھ پر دوہنٹر لگا کر بولیں۔" ہائے ہائے! کیا کیا ہے تم نے؟""

مم۔میں نے کچھ بھی نہیں کیا دادی۔۔۔مم میں تو صرف یہاں کھڑے ہو کر عابد کو دور سے دیکھ رہی تھی۔" نرجس بکلا بکلا کر خوفزدہ لہجے میں بتانے لگی۔" ایک تو تم بڑوں کا کہنا نہیں سنتی ہو اور پھر جھوٹ بھی فراٹے سے بولتی ہو۔حد ہے بھئی ڈھٹائی کی بھی۔ میں نے خود دیکھا ہے تمہیں پالنے کے پاس۔مجھے دیکھ کر باہر بھاگی ہو تم۔" شائلہ بے دردی سے نرجس کے کان مروڑ کر غلط بیانی کرنے لگی۔

" ارے دلہن! تمہیں بھی تو میں نے کتنی بار کہا ہے کہ بچے کو اکیلا نہ چھوڑا کرو۔پہلوٹھی کا بچہ ہے۔اُن کا خون ہلکا ہوتا ہے۔۔۔اور خاص کر اس وقت تو بالکل بھی نہیں جب یہ کلموہی گھر پر ہو۔۔۔بخدا مجھے تو ہر وقت یہی ڈر لگا رہتا ہے کہ کہیں کسی دن یہ بچے کو کوئی نقصان ہی نہ پہنچا دے۔دو بھائیوں اور ماں کو تو کھا ہی چکی ہے ڈائن۔حمیدہ بیگم بہو سے بولیں۔"

شائلہ خود کو یوں ٹوکے جانے پر بھڑک ہی اٹھی اور بدلحاظی سے کہنے لگی۔

اللہ نہ کرے خالہ اماں جو میرے بچے پر اس کے منحوس وجود کا سایہ بھی پڑے میں کہاں چھوڑتی ہوں عابد کو کبھی اکیلا۔بس دلیہ لینے گئی تھی باورچی خانے تک، پتہ نہیں یہ کہاں سے آ دھمکی۔اتنی دفعہ سزا دے چکی ہوں مگر مجال ہے جو یہ باز آ جائے۔اب کیا میں اسے تالے چابی میں بند کر کے رکھوں؟"

نرجس مار اور سزا ملنے کے خوف سے گھبرا کر تیزی سے شائلہ کے ہاتھوں سے اپنا کان چھڑا کر اپنے کمرے کی طرف بھاگی اور اپنے پلنگ کے نیچے چھپ کر بیٹھ گئی۔چھوٹی امّی کے بے دردی سے کان مروڑنے کی وجہ کان میں

سے شدید دکھن ہو رہی تھی۔وہ اپنا ہاتھ کان پر رکھ کر گھٹ گھٹ کر رونے لگی کہ کہیں اس کے رونے کی آواز سن کر چھوٹی امّی یا دادی کو مزید غصہ نہ آ جائے، پھر تو اُسے کوئی سزا سے نہیں بچا سکے گا۔۔۔لیکن جب کافی دیر ہو گئی اور کمرے کی طرف کوئی نہیں آیا تو وہ آہستہ سے پلنگ کے نیچے سے نکلی اور ہاتھوں سے آنسو پونچھ کر اپنا بستہ کھول کر اسکول کا کام کرنے بیٹھ گئی۔

نرجس کو اپنا چھوٹا بھائی عابد بہت اچھا لگتا تھا۔وہ اُس سے چھ سال چھوٹا تھا۔اس کا بڑا دل چاہتا تھا کہ وہ عابد کے ساتھ کھیلے اور اُسے گود میں اٹھائے اٹھائے پھرے لیکن گود میں اٹھانا تو دور کی بات تھی وہ تو اُس کے آس پاس بھی دکھائی دے جاتی تھی تو چھوٹی امّی اور دادی کے ہاتھوں اُس کی شامت آ جاتی تھی۔اُس کا معصوم ذہن دادی اور چھوٹی امّی کی یہ بات سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ اپنی منحوسیت سے عابد کو کیسے نقصان پہنچائے گی۔وہ تو اپنے پیر کے نیچے آنے والے کیڑوں مکوڑوں کو بھی نہیں مارتی تھی اور عابد، وہ تو اُس کا پیارا سا بھائی ہے۔جس سے وہ بہت پیار کرتی ہے۔

دن اسی طرح گزرتے گزرتے ماہ و سال میں تبدیل ہوتے گئے اور نرجس تیرہ سال کی ہو گئی۔اب دادی اور چھوٹی امّی بات بات پر اُس پر ہاتھ تو نہیں اٹھاتی تھیں مگر اسے برا بھلا کہنے اور طعنے اور کوسنے دینے میں کسی قسم کا کوئی لحاظ نہیں کرتی تھیں۔خاص کر دادی، جو اُس سے اپنی نفرت کو کبھی چھپاتی بھی نہیں تھیں۔نرجس سے اس کی دادی کی نفرت کا عالم یہ تھا کہ وہ اُسے اس کے نام نام سے پکارنا بھی گوارا نہیں کرتی تھیں اور اُسے کلموہی کہہ کر بلاتی تھیں۔اُس کا نام نرجس اُس کی مرحومہ ماں نے رکھا تھا۔لیکن اب گھر میں کوئی اُسے اُس کے اصلی نام سے نہیں پکارتا تھا۔دادی اُسے کلموہی کہتی تھیں اور چھوٹی امّی اسے منحوس، کم بختی کی ماری اور سبز قدم جیسے ناموں سے بلاتی تھیں۔اور رہے آتا۔۔۔وہ تو اب اُسے کبھی پکارتے ہی نہیں تھے نہ اس کے نام سے اور نہ ہی دادی اور چھوٹی امّی کے دیئے ہوئے القابات س سے۔

اسکول میں اس کی دوستیں جب کبھی اپنے اپنے ابا کے پیار اور اُن کے ساتھ کیے مزے کے قصے سناتیں تو وہ سوچتی کہ میرے ابا ان کے ابا کے جیسے کیوں نہیں ہیں۔میں تو ان کی بیٹی ہوں مگر وہ مجھ سے پیار نہیں کرتے صرف عابد سے ہی پیار ہیں۔دفتر سے آ کر ہمیشہ عابد کو آواز دیتے ہیں، اُسے گود میں بٹھاتے ہیں اور ہی کھلونے اور اچھی اچھی چیزیں لاتے ہیں۔۔۔وہ تو ہمیشہ منتظر ہی رہتی کہ کب ابا اُسے بھی نرجس بیٹی کہہ کر پیار

سے پکاریں گے اور اپنے پاس بٹھا کر اسے بھی پیاری پیاری چیزیں دیں گے۔۔۔لیکن ایسا کبھی ہوا ہی نہیں۔ ابا تو اُس کی ضرورت کی چیزیں بھی اُسے کبھی خود نہیں دیتے تھے بلکہ چھوٹی امّی کے ہاتھ بھجوا دیتے تھے جو وہ سو باتیں سنا کر اسے دیتی تھیں۔

نرجس کے ابا انوار علی کی پہلی شادی اُن کی اپنی پسند سے ہوئی تھی۔ راحت اُن کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی تھی۔ انوار علی کی والدہ حمیدہ بیگم کو بیٹے کی یہ بات پسند نہیں آئی مگر اکلوتے بیٹے کی خوشی کی خاطر انہوں نے اُن کی ضد مان لی اور راحت کو دلہن بنا کر گھر لے آئیں مگر راحت ان کو اوّل دن سے نہیں بھائی۔ حمیدہ بیگم مزاجاً دقیانوس خیالات کی مالک اور حد درجے کی توہم پرست عورت تھیں۔ خاص کر عورتوں اور لڑکیوں کے بارے میں۔ اُن کے نزدیک لڑکیاں زیادہ پڑھ لکھ کر اتنی تیز طرار اور بے شرم ہو جاتی ہیں کہ اپنا بر بھی خود تلاش کر لیتی ہیں۔ اور اس کی مثال ہمیشہ اپنی بہو راحت کی دیتی تھیں کہ میرے معصوم اور سیدھے سادھے بیٹے کو اپنے جال میں پھانس لیا یونی ورسٹی میں پڑھنے والی بے شرم لڑکی نے۔

وہ شادی کے دوسرے سال ہی انوار علی اور راحت کے یہاں جڑواں بچوں کی پیدائش ہوئی۔ ایک لڑکی اور ایک لڑکا۔ راحت نے لڑکی کا نام نرجس رکھا اور لڑکے کا نام ساجد۔ لیکن وقت سے پہلے ساتویں مہینے میں پیدا ہو جانے سے دونوں بچوں کی صحت مکمل ٹھیک نہیں تھی تو انہیں پیدائش کے بعد اسپیشل کیئر وارڈ میں رکھا گیا۔ تین ہفتوں کے بعد نرجس صحت یاب ہو گئی مگر ساجد سنبھل نہ سکا اور انتقال کر گیا۔ حمیدہ بیگم نے پوتے کی موت کا بڑا واویلا مچایا اور اُس کا ذمہ دار نرجس کو ٹھہرایا کہ ایسی کلموہی لڑکی پیدا ہوئی ہے کہ دنیا میں آتے ہی بھائی کو کھا گئی۔ لیکن جب نرجس تین سال کی تھی تو انوار علی کے یہاں ایک اور بیٹے سجاد کی پیدائش ہوئی تو وہ اس بات کو بھول گئیں اور اپنے پہلے پوتے کی دیکھ بھال میں لگ گئیں۔ ستم ظریفی قسمت کہ اُن کی یہ خوشی وقتی ثابت ہوئی۔ سجاد جب چھ مہینے کا تھا تو راحت اپنے دونوں بچوں کے ساتھ رکشے پر اپنے ماموں کے گھر تقریب میں جا رہی تھی کہ بجری سے بھرے ٹرک کی ٹکر سے رکشہ اُلٹ گیا اور راحت اور اُس کی گود میں بیٹھا سجاد ٹرک کے پہیوں سے کچل کر موقع پر ہی جاں بحق ہو گئے۔ جبکہ نرجس کو معمولی چوٹیں آئیں جو چند دنوں میں ٹھیک ہو گئیں۔ اُس دن سے حمیدہ بیگم کی اپنی پوتی سے نفرت دوچند ہو گئی اور انہوں نے اس بات پر گرہ لگا دی کہ یہ لڑکی منحوس اپنے دو بھائیوں اور ماں کو کھا گئی۔ اٹھتے بیٹھتے وہ اُسے کوسنے دیتیں اور کلموہی کہہ کر پکارتیں۔ رفتہ رفتہ ان کی زبان پر یہی نام چڑھ گیا اور اُس کے نام نرجس کو انہوں نے فراموش ہی کر دیا۔

راحت کے مرنے کے چار مہینے کے بعد ہی حمیدہ بیگم نے انوار علی کی شادی اپنی بھانجی شائلہ سے کروا دی جو انہی کی ہم مزاج اور ہم خیال تھی۔ انوار علی دوسری شادی نہیں کرنا چاہتے تھے لیکن حمیدہ بیگم کے اصرار اور بار بار یہ جتانے پر کہ انہوں نے پہلی شادی ماں کی مرضی کے خلاف اپنی پسند سے کی تھی اس لیے اس کا انجام کتنا برا ہوا، بالآخر انہوں نے ماں کے آگے سر جھکا دیا۔ وہ ماں کی مرضی شائلہ کو رخصت کرا لے تو آئے مگر راحت کی موت اُن کو ایک چپ سے سی لگ گئی تھی۔ وہ اب کسی بھی معاملے میں کچھ نہیں بولتے تھے۔ جیسا ماں اور بیوی کہتیں وہ کر دیتے۔ وہ جس کام سے منع کرتیں اُس سے رک جاتے۔ یہاں تک کہ وہ نرجس کے معاملے پر بھی کچھ نہیں بولتے تھے جو اُن کی پہلی اولاد تھی اور ہو بہو ان کی محبوب بیوی راحت کی شکل تھی۔

نرجس کو لگتا تھا کہ ابا بھی اُس کی طرح دادی اور چھوٹی امّی سے ڈرتے ہیں۔ کیونکہ دادی اور چھوٹی امّی جب بھی اُسے مارتیں، سزا دیتیں یا برا بھلا کہتیں، ابا انہیں کبھی منع نہیں کرتے تھے بلکہ خاموشی سے سر جھکا کر وہاں سے اٹھ کر یوں چلے جاتے تھے کہ جیسے بات اُن کی بیٹی کی نہیں کسی ایرے غیرے کی ہو جس سے انہیں کوئی سروکار نہیں۔

اس کے باوجود نرجس کو اپنے ابا برے نہیں لگتے تھے گرچہ وہ اس کو کبھی محبت سے اس کا نام لے کر اسے مخاطب نہیں کرتے تھے مگر کم از کم وہ اسے اُن سے بھی نہیں بلاتے تھے جو دادی اور چھوٹی امّی کی زبان سے وہ چھوٹی عمر سے سنتی چلی آ رہی تھی۔ خاص کر کلموہی، جس سے اسے شدید نفرت تھی۔ اسی وجہ سے اُسے دادی اور چھوٹی امّی کبھی اچھی نہیں لگتی تھیں۔

وہ عابد گھر میں اُسے اپنا چھوٹا بھائی عابد سب سے زیادہ اچھا لگتا تھا اور اس کا دل چاہتا تھا کہ وہ اس کے ساتھ وقت گزارے اور وہ اسے ساری مزے مزے کہانیاں سنائے جو وہ اسکول کی لائبریری سے لا کر پڑھتی تھی۔ عابد بھی اُس کو دیکھ کر خوش ہوتا تھا اور اسے اپنے ساتھ کھیلنے کو کہتا تھا مگر دادی اور چھوٹی امّی کے سامنے نرجس اس سے حتی المقدور دور ہی رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اسکول سے آ کر نہا دھو کر کھانا کھاتی اور پھر اپنے کمرے میں چلی جاتی۔ البتہ جب اسے موقع ملتا کو گود میں اٹھا کر چپکے سے پیار کر لیتی تھی۔ اور یہ موقع اُسے تب زیادہ میسر آنے لگا جب عابد بھی اس کے ساتھ اسکول جانے لگا۔ شائلہ عابد کا داخلہ اسی اسکول میں نہیں کروانا چاہتی تھی جہاں نرجس پڑھتی تھی۔ اس نے یہ کہہ کر صاف انکار کر دیا تھا کہ وہ اپنے اکلوتے اور پہلوٹھی کے بچے کو نرجس کے وجود سے دور ہی رکھنا چاہتی ہیں مگر انوار علی کے سمجھانے پر وہ راضی ہو گئی کہ ایک تو وہ شہر کا نامی گرامی اور اچھا اسکول ہے اور دوسرے یہ کہ نرجس تو اب سیکنڈری جماعت میں ہے اور اس کا سیکشن تو عابد کے پرائمری سیکشن بالکل الگ ہے، دونوں صرف صبح ساتھ جائیں گے واپسی میں تو عابد نرجس سے پہلے ہی گھر آ جایا کرے گا۔ نرجس اور عابد کا اسکول اُن کے گھر سے تھوڑے فاصلے پر تھا اسی لیے انوار علی نے

دونوں بچوں کے لیے اسکول کی بس لگوا رکھی تھی۔ دن اسی طرح گزرتے رہے۔ ایک دن صبح نرجس اسکول جانے کے لیے دروازے پر تیار کھڑی بس کا انتظار کر رہی تھی جو کہ کچھ ہی دیر میں والی تھی مگر عابد کا ابھی تک ناشتہ ختم نہیں ہوا تھا۔ شمائلہ صحن میں بیٹے کے پیچھے پیچھے اُس کا ناشتہ لیے پھر رہی تھی جو وہ کسی صورت نہیں کھانا چاہ رہا تھا اور ادھر ادھر بھاگ کر ماں کو پریشان کیے ہوئے تھا۔ حمیدہ بیگم نے بہو کو بچے کے پیچھے ہلکان ہوتے تخت دیکھا تو صحن میں بچھے سے اتر کر انوار علی سے کہنے لگیں کہ وہ عابد کو گود میں اٹھا کر لائے وہ اسے بہلا پھسلا کے ناشتہ کرا دیں گی۔ انوار علی اخبار تہہ کر کے عابد کو پکڑنے کے لیے اٹھے ہی تھے کہ عابد باپ کو آتا دیکھ کر شرارت میں تیزی سے کھلے دروازے سے باہر بھاگ گیا۔ انوار علی کا گھر لبِ سڑک تھا اور اس سڑک پر گاڑیوں کی کافی آمد و رفت رہتی تھی۔ خاص کر اسکول کے جانے اور آنے کے وقت تو ٹریفک کچھ زیادہ ہی ہوتا تھا اور تیز رفتار بھی۔ یوں لگتا تھا کہ ہنگامی حالات نافذ ہو گئے ہیں اور ہر کسی کو بھاگنے کی جلدی ہے۔ عابد تیزی سے دوڑتا ہوا سڑک پر آ گیا۔ نرجس نے دیکھا کہ ایک تیز رفتار منی بس اسی رخ پر تیزی سے چلی آ رہی ہے۔ نرجس نے دوسرے ہی لمحے اپنا بستہ پیٹھ پر سے اتار کر پھینکا اور عابد کی طرف دوڑی اور تیزی سے اسے سڑک سے کھینچ کر کنارے کی طرف دھکا دے کر تو بچا لیا مگر اُس تیز رفتار بس سے خود کو نہ بچا سکی اور اس کے پہیوں سے رگڑتی ہوئی سڑک پر دور جا کر گری۔ حادثہ دیکھ کر آس پاس موجود لوگ سڑک: اُس حصے کی طرف بھاگے جہاں نرجس پڑی تھی۔ بس کے پہیوں کی رگڑ اس کا سے سر اس بری طرح کچلا تھا کہ وہ ننھی سی جان زندگی کی بازی ہار چکی تھی۔ پاس کھڑی ایک عورت نے جلدی سے اپنی چادر اتار کر نرجس کے کچلے ہوئے جسم پر ڈال دی۔ انوار علی بھی تیزی سے دوڑتے ہوئے اس طرف آئے اور نرجس کے پاس آ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ کر کانپتے ہاتھوں سے اس پر پڑی چادر ہٹا کر اُسے نرجس نرجس کہہ کر آوازیں دینے لگے مگر جب نرجس کے جسم میں زندگی کی کوئی رمق نہ دیکھی تو اس کی لاش کو ہاتھوں میں اٹھا کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے۔ نرجس کی آنکھیں کھلی ہوئی تھی اور اس کا معصوم چہرہ پرسکون تھا گویا وہ اُن کھلی آنکھوں اور پرسکون چہرے سے باپ سے کہہ رہی ہو" ابا اب تو کوئی مجھے کلموہی نہیں کہے گا نا، میں نے اپنے بھائی پر اپنی زندگی نچھاور کر کے یہ داغ دھو دیا ہے۔"

اردو ادب میں ہائیکو کا استعمال، ایک الگ ادبی روایت والی زبان، نسبتاً حالیہ ہے اور اسے ثقافتی اثرات کی ایک شکل کے طور پر دیکھا جا سکتا ہے۔ ہائیکو کو اردو ادب میں ان شاعروں اور ادیبوں نے متعارف کرایا جو مختلف شکلوں اور اسلوب کے ساتھ تجربہ کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ان شاعروں نے 5-7-5 حرف کی ساخت کو برقرار رکھتے ہوئے روایتی جاپانی شکل کو اردو ادب کے کنونشن اور موضوعات کے مطابق ڈھال لیا۔

تحت الثریٰ کی دُکھتی رگیں

ڈاکٹر توصیف بریلوی
شعبۂ اردو، البرکات کالج آف گریجویٹ اسٹڈیز، علی گڑھ، ہندوستان

اسے کئی روز سے اپنے ہم نفسوں کے خون کی بو آ رہی تھی لیکن وہ اس بو کے تعاقب میں جا بھی نہیں سکتا تھا۔ ہاں اس کے اندر سے ایک ہول ضرور اٹھ رہی تھی کہ کچھ بہت بھیانک ہونے والا ہے۔ پورا جنگل روز جن پرندوں کی چہچہاہٹوں سے اپنی صبح کرتا تھا اب وہ آوازیں خاموش ہونے والی تھیں۔ آخر ایسا بھی کیا ہو گیا تھا.....؟ وہ اس پسرتی ہوئی خاموشی کا پتا لگانا چاہتا تھا لیکن اس سے کچھ کرتے نہیں بن پڑ رہا تھا۔ آخر وہ کر بھی کیا سکتا تھا؟ اپنوں کے خون کی بو کے ساتھ ہی دل کو تھرّا دینے والی آوازیں بھی متواتر اس کے قریب بڑھنے لگی تھیں۔ آخر ایک روز اسے دکھائی دینے لگا کہ جنگل کے ایک سرے پر درختوں کو تہس نہس کرتی ہوئی مشینیں آگے بڑھ رہی ہیں اور درختوں کا صفایا کر رہی ہیں۔ یہ وہ جنگل تھا کہ جس نے اپنے اندر مختلف قبائل سے لے کر مختلف قسم کے جانور صدیوں سے پالے تھے۔ پھر اس کے بعد شکارگاہ اور دیگر سرگرمیوں کے طور پر راجاؤں، سلاطین اور بادشاہوں نے اس کا استعمال کیا۔ انگریزوں نے جنگل میں نہ صرف شکار کھیلے بلکہ اس کی قیمتی لکڑی کو بھی خوب لوٹا۔ صدیوں پرانے درختوں کی لکڑی سے ان کی کوٹھیوں کے دروازے، کھڑکیاں، کرسیاں اور میزیں بنیں۔ انگریزوں سے نجات ملے ابھی کچھ دیر بھی نہیں ہوئی تھی کہ یہ جنگل پھر ملک کے مختلف رؤسا اور نوابوں کے تصرف میں چلا گیا۔ استحصال کے منازل طے کرتے کرتے اب جنگل کی مستقل صفائی کا حکم جاری ہو گیا تھا جس کے سبب درختوں کی کٹائی جدید مشینوں سے کی جا رہی تھی تاکہ وقت اور سرمایہ دونوں کو بچایا جا سکے۔

سب سے پہلے صدیوں پرانے درخت کو اس اس کے اپنوں کے قتل کی خبر ہوا نے اپنے دوش پر لا کر دی تھی۔ وہ بے حد انمول درخت اب تنہا رہ گیا تھا جس کے خاندانی درخت اب دنیا میں نہیں رہے تھے۔ مشین تو مشین ہوتی ہے، اسے کہاں معلوم ہوتا ہے کہ کون سا درخت خطرے کے نشان سے اوپر ہے اور کون سا نیچے، کون سا درخت Red Data Book میں درج ہے اور کون سا نہیں۔ اس نادر درخت نے اندازہ لگا لیا تھا کہ جس تیزی سے جنگل کا صفایا ہو رہا ہے اس میں وہ چند ہی دن اور زندہ رہ سکے گا۔ اس کا پتّا پتّا اداس اور پریشان تھا، اس میں کوئی ترنگ اور سرسراہٹ باقی نہیں رہ گئی تھی۔ موت سامنے سے قتل و غارت گری کے ڈھول بجاتی آ رہی ہو تو چین و سکون

کب دل سے نکل کر دور کھڑے تماش بین بن جائیں، کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ اصل میں یہ گھبراہٹ موت کی نہیں تھی بلکہ وجود کے کھو جانے کی تھی۔ درخت کے پھل سوکھ کر تیار تھے جو شاید کسی بہت اہم نسخے کے طور پر کام آتے ہوں گے لیکن ان نسخوں کو جاننے اور تیار کرنے والوں کا بھی اب اتا پتا نہیں تھا کیوں کہ زمانہ اب حکیموں اور ویدوں کا نہیں بلکہ ڈاکٹروں کا تھا۔

وہ اپنے خاندان کے ساتھ صدیوں سے اس جنگل میں زندگی بسر کر رہا تھا۔ اس کے ہی سامنے نہ جانے کتنے درخت زمین سے سر اٹھا کر کھڑے ہوئے اور ختم بھی ہو گئے۔ اب اس کے پیچھے وجوہات جو بھی رہے ہوں یعنی موسمیاتی تبدیلیاں یا پھر انسانوں کی ستم ظریفیاں۔ وہ خود بہت پر شکوہ اور خاندانی درخت تھا اور آس پاس کے گاؤں والے اس کے تمام خاندانی درختوں کو مقدس بھی مانتے تھے۔ وہ موسمیاتی تبدیلیوں کا مقابلہ کرنے میں بھی کامیاب رہا تھا اس لیے اس کی نسل بچی رہی اور نسب آگے بڑھتا رہا۔ اس نے جنگل میں بے شمار سرشاری کے دن دیکھے تھے۔ جانوروں کے چھوٹے چھوٹے بچوں کی شرارتیں، بلوغ کی طرف بڑھتے ہوئے جانوروں کی سرمستیاں، خاص طور پر بارہ سنگھوں اور نیل گایوں کی افزائش نسل کے مناظر دیکھے تھے۔ ساتھ ہی شیروں کے شکار بھی اچھی طرح دیکھے تھے۔ آس پاس کے گاؤں والوں کا جب جنگل میں دخل بڑھنے لگا تو شیر، چیتے اور دیگر جانور اندر کی طرف پناہ لینے لگے پھر بھی دن میں دو بار وہ جانور اس درخت کی طرف سے ضرور گزرتے تھے کیوں کہ پانی وہاں سے قریب تھا۔ سبزہ زار کا عالم یہ تھا کہ سبز رنگ کے علاوہ دوسرا رنگ صرف پھولوں اور پھلوں کا دکھائی دیتا تھا۔ سورج کی کرن شاید ہی کہیں زمین کو چھو سکتی تھی۔ پرندے، چرندے اور درندے خوش خوش غذا حاصل کرتے اور اپنی نسل بڑھاتے۔

ایک اندھیری رات میں اس بھرپور لدے پھندے سرسبز درخت نے خواب دیکھا:

> ''ایک سمندری سبز آنکھوں والی، لمبی اور چھریری لڑکی اس مقدس درخت کے سامنے تنگ اور جدید لباس میں دوزانو بیٹھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ درخت اس سے نہ جانے کس زبان میں باتیں کر رہا ہے جو اسے سمجھ میں آ رہی ہے لیکن وہ درخت کی زخمی آواز سے پریشان ہو جاتی ہے۔''

وہ پہلی خاتون نہیں تھی بلکہ اس کی نہ جانے کتنی پشتیں اس درخت کو پوجتی آ رہی تھیں۔ اس مقدس درخت سے ان کا پرانا تعلق تھا۔ وہ اپنے دکھ سکھ بانٹتے بلکہ وہ اپنے دکھ اس درخت کو ضرور بتاتے اور بدلے میں درخت کے سوکھے پھل اپنے ساتھ تبرک کے طور پر لے جاتے۔ گھر لے جا کر اس کے پھل کو تمام افراد چکھ لیتے، اس کے بیجوں کو اپنے لیے بابرکت سمجھتے اور انہیں اپنے خزانوں میں اضافے کی نیت سے رکھ دیتے تھے۔ انسان اور جانور سب کے اپنے اوقات مقرر تھے کوئی کسی کے آڑے نہیں آتا تھا اور اس طرح یہ سلسلہ صدیوں پر پھیلتا گیا۔

جنگل صدیوں سے تھا اور اب اپنے اختتام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ اس کے وارث بدلتے رہے تھے اور اپنی ضرورت، ہوس اور غرض کے تحت سب نے اس کو لوٹا تھا۔ اس نقصان کی بھرپائی کچھ حد تک یوں ہوئی کہ جب انگریز کمزور پڑنے لگے تو پھر زمین کی سطح سے درخت سر اٹھانے لگے۔ مقدس درخت اس لیے بچے رہے کہ آس پاس کے لوگوں کی دلی وابستگی ان سے تھی اور انگریزوں کے نزدیک وہ درخت بے مصرف تھے۔

جنگل اگر شہر کی طرف بڑھے تو یہ نیک شگون ہوتا ہے لیکن شہر جب جنگل کی طرف بڑھنے لگے تو یہ صریحاً بدشگون ہی ہے کیوں کہ شہر کا پھیلاؤ بہت غیر منظم، بڑا ہی جارحانہ اور بھیانک ہوتا ہے۔ وہ نہ تو سبزہ زار کو بخشتا ہے اور نہ ہی کمزور گھروں کو۔ 'ایسا لگتا ہے شہر کو لوگ نہیں بلکہ لوگوں کو شہر چلاتا ہے۔'

اسی رات دور دراز کے کسی علاقے میں ایک لڑکی کو بھی وہی خواب دکھائی دیتا ہے جو اس مقدس درخت نے دیکھا تھا۔ 'یہ اس کا پہلا خواب نہیں تھا۔' دوشیزہ بہت گھبرائی اور سمجھ نہیں پا رہی تھی کہ اسے کیا کرنا چاہئے۔ وہ ماضی-خواب-تخیل کی دنیا میں گم ہو گئی۔ کسی نتیجے پر پہنچنے میں اسے وقت لگا لیکن وہ جیسے ہی کچھ سمجھی تو فوراً ہی اجڑتے ہوئے جنگل کے لیے روانہ ہو گئی اور بڑے بڑے علاقائی سیاست دانوں، تنظیموں اور کئی لوگوں سے رابطہ کرنے کے باوجود بھی جنگل کے کسی درخت کو بچا نہ سکی۔ لڑکی کی کسی بھی بات پر توجہ نہیں دی گئی اور وہ مشینیں درختوں کو الٹتے ہوئے آگے بڑھتی گئیں۔ دوشیزہ نے دیکھا کہ اب کچھ نہیں ہو سکتا اس لیے وہ زمین پر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ اس نے آنکھیں بند کیں اور ہاتھ جوڑ لیے۔ پھر اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کے خشک پھل توڑنے کی کوشش کی لیکن ناکام رہی کیوں کہ پھل کی ٹہنی تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ سکا۔ فوراً وہ درخت پر چڑھ گئی، اس کے پاس جوتے اتارنے کا بھی وقت نہیں تھا۔ ابھی وہ چند ہی پھلوں کو توڑ کر اپنی جیب میں ٹھونس پائی تھی کہ مشین درخت کی طرف بڑھ چکی تھی۔ لڑکی کو پہلے ہی حکم دے دیا گیا تھا کہ وہ اگر اس اجڑے ہوئے جنگل میں دکھائی دی تو اپنی حالت کی ذمے دار خود ہو گی۔ درخت کے زمیں بوس ہونے سے پہلے لڑکی پیڑ سے کود کر بھاگنے میں کامیاب رہی لیکن کچھ غنڈے اس کے پیچھے پڑ گئے تھے۔ لڑکی وہاں سے گرتے پڑتے کسی طرح سڑک پر پہنچی جہاں ایک نئے زمانے کی کار اس کا پہلے ہی انتظار کر رہی تھی۔

☆☆☆

دوشیزہ اپنی زندگی سے بہت مایوس تھی۔ یوں تو وہ بہت ہنر مند، پڑھی لکھی اور ہونہار تھی لیکن اس کا ماضی اسے چین سے نہیں جینے دیتا تھا یا یوں کہیں کہ اس کے دادا نے اسے کچھ کہانیاں سنائی تھیں جن کا اثر بھی اس کی زندگی پر پڑا تھا جسے وہ چاہ کر بھی اپنے وجود سے الگ نہ کر سکی۔ اس کی راتوں کو برے خوابوں نے آلیا تھا۔ جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے کے بعد بہت کم راتیں اس کی زندگی میں پرسکون گزری تھیں۔ اِدھر کچھ نئے خوابوں کا سلسلہ بھی اس کی زندگی میں شروع ہوا تھا۔

خواب-۱: سفید ساڑی میں لپٹی ہوئی نوجوان عورت جس کا بدن زیورات سے یکسر خالی، چہرے پر ایک قسم کی گلابی چمک لیے ہوئے، بے انتہا خوبصورت، درخت کے سامنے دوزانو ہو کر بیٹھی تھی۔ محافظ دستہ خاصے فاصلے پر اس کی جانب پیٹھ کیے کھڑا تھا۔ ساتھ ہی اس کی پالکی رکھی تھی جو خالص زر سے بنی ہوئی تھی اور مختلف قسم کے بیش قیمت پتھروں سے مزین تھی۔

خواب-۲: وہی مقدس درخت اور اس کے سامنے تنِ تنہا دوزانو بیٹھی ہوئی ایک راہبہ جس نے شاید دنیا سے منہ موڑا ہوا تھا۔ اس کے چہرے کی رونق اور ملاحت قابل دید تھی۔

خواب-۳: ایک نیا شادی شدہ کم عمر جوڑا مقدس درخت کے سامنے کھڑا تھا۔ فوجی دستہ دور پیٹھ کیے کھڑا تھا اور ایک سفید اعلیٰ نسلی گھوڑا اور خوبصورت پتھروں سے مزین خالص سونے سے بنی ہوئی پالکی بھی قریب ہی رکھی تھی۔

خواب-۴: تلواروں کی آوازیں، لڑتے ہوئے سپاہی، خون میں لتھ پتھ لاشیں، چیختے چنگھاڑتے کٹے پھٹے اجسام.....خون میں لتھڑے ہوئے زرہ بکتر پہنے ہوئے دو نوجوان جو غالباً بھائی تھے، اس مقدس درخت کے سامنے ہاتھ جوڑے گھٹنوں پر دکھائی دیے۔ حفاظتی دستہ حد فاصل پر تھا لیکن اس بار ان کی پیٹھ نہیں بلکہ منہ اس مقدس درخت کی جانب تھے۔ دو اعلیٰ نسلی گھوڑے شان و شوکت کے ساتھ کھڑے سبزے پر منہ مار لیتے تھے۔

خواب-۵: ایک سمندری سبز آنکھوں والی، لمبی اور چھریری لڑکی اس مقدس درخت کے سامنے تنگ اور جدید لباس میں دوزانو بیٹھنے کی کوشش کر رہی ہے۔ درخت اس سے نہ جانے کس زبان میں باتیں کر رہا ہے جو اسے سمجھ میں آ رہی ہے لیکن وہ درخت کی زخمی آواز سے پریشان ہو جاتی ہے۔

اگلی صبح جب وہ جاگتی ہے تو حیران و پریشان تھی۔ دن کا کچھ حصہ باہر گزارنے کے بعد جب وہ اپنے گھر لوٹی تو بستر پر گرتے ہی انوکھی دنیا میں دھنستی ہی چلی گئی۔ وہ کھلی آنکھوں سے اس مقدس درخت کو دیکھ رہی تھی اور خود اپنے جسم سے نکل کر اس درخت سے جا لپٹتی ہے۔ وہ اس درخت کو ایسے چومنے چاٹنے لگتی ہے جیسے کوئی انسان دوسرے انسان کو۔ درخت کی شاخیں سرمستی کے عالم میں جھومنے لگتی ہیں۔ فرط جذبات اس نے اپنے بہت سے پتّے نیچے گرا دیے۔ ابھی درخت کے پھلوں کا موسم نہیں آیا تھا۔ آس پاس کے درختوں سے سفید، گلابی اور زرد پھول برس رہے تھے۔ لڑکی بھی درخت کی گرفت میں بہت بیتاب ہو رہی تھی۔ وہ اب زمین پر نہیں بلکہ درخت کی شاخوں میں پھنسی ہوئی اس کے تنے سے لپٹی سرور کے جام پی رہی تھی۔ وہ وقت بھی آیا کہ جب درخت نے اپنی شاخوں سے لڑکی کو پکڑ کر تنے سے کس کے چمٹا لیا۔ شاید یہی تخلیقی وقت تھا۔ دوشیزہ کا پورا بدن اب شاخوں سے لپٹا اور تنے سے چمٹا ہوا تھا۔ اس کے جسم پر اب لباس نہیں بلکہ درخت کی ملائم شاخیں تھیں۔ لڑکی نے اپنے لمبے لمبے ناخن درخت کے تنے میں اتار دیے اور اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

وہ بستر سے اٹھ کھڑی ہوئی۔ اس کی سانسیں بہت تیز تھیں۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ اب اسے کہاں اور کیوں جانا ہے۔

جنگلی زمین کی بے پناہ گہرائیوں میں اتری ہوئی چند درختوں کی جڑیں آپس میں رابطے میں تھیں اور کہیں نہ کہیں انہوں نے ایک نظام بنایا ہوا تھا۔ یہ نظام اپنی عمیق گہرائیوں سے جنگل کو مضبوطی، شادابی اور توازن دیتا تھا لیکن جب ان درختوں کے تنے ہی نہیں رہیں گے تو ان جڑوں کا کیا ہوگا؟ آخر کب تک وہ اس نظام کو بنائے رکھ سکیں گی؟ زمین کی گہرائیوں میں دور تک جانے والی یہ جڑیں نہیں بلکہ زمین کی رگیں ہیں جو اسے بہت کچھ دیتی ہیں اور اس سے بہت کچھ لیتی بھی ہیں جسے ہم انسان کتنا سمجھ سکتے ہیں اور ساری بات تو سمجھ ہی کی ہوتی ہے۔ باقی اس دنیا میں کیا ہے جس پر غور و فکر کیا جائے۔ یہ سمجھ ہی تو ہمیں کسی قابل بناتی ہے۔ تحت الثریٰ جب بانجھ ہونے لگے تو دنیا پر پھر سے جنگل بسائے جا رہے ہوتے ہیں ہاں یہ بھی مسلمہ حقیقت ہے کہ وہ جنگل پتھر، کنکریٹ، سیمنٹ اور لوہے کے ہوتے ہیں۔ بہت سے درختوں کی لاشیں ان جنگلوں کی دیواروں میں چنی ہوتی ہیں۔ کنکریٹ سے بنے جنگل کے کچھ خانوں میں سرخ لکڑی کے کچھ جانوروں اور برہنہ عورتوں کی مورتیں لوگ فخریہ رکھتے ہیں۔ اس کے پیچھے کی بے وقوفانہ منطق صرف اتنی سی ہے کہ وہ درخت بیش قیمت اور دنیا پر بہت کم تعداد میں ہوتے ہیں۔ ان لکڑی کی برہنہ مورتوں کو اپنے ٹھکانوں اور اڈوں پر سجانے والے بھی عام نہیں بلکہ خونخوار ہوتے ہیں۔

مقدس درخت مشین کے سامنے سرنگوں ہو کر گرا اور اس کا تعلق لمحہ بھر میں تحت الثریٰ سے منقطع ہو گیا۔ یہ تعلقات کے خاتمے کا وقت تھا۔ درخت کے گرتے ہی جھاڑی سے خوبصورت ہرن نکل کر بھاگا اور اوبڑ کھابڑ سی زمین پر چھپنے کے لیے درختوں اور جھاڑیوں کو ڈھونڈنے لگا لیکن اس کی رہائش اب کہاں تھی یہ اسے کیسے معلوم ہو سکتا تھا۔ اس کے کنبے کے بقیہ افراد جنگل کے قتل عام کی آندھی میں کہاں تتر بتر

ہو گئے تھے، اسے اندازہ بھی نہیں تھا۔ وہ غریب تو اپنا وجود بچانے میں سرگرداں تھا اور اجڑے جنگل کے کسی کنارے پر پھیلے ہوئے جال میں پھنس جانا اس کا مقدر تھا۔

☆☆☆

لڑکی زخمی حالت میں ایک خوبرو نوجوان کے سامنے کھڑی تھی۔ نوجوان کی آنکھوں میں استعجاب اترا ہوا تھا اور دوشیزہ کی آنکھوں میں حقائق کے ڈورے تیر رہے تھے۔ اس نے اپنی حالت کے بارے میں بتانے کے بعد نوجوان کو بہت کچھ بتایا اور سمجھایا بھی۔ دوشیزہ کے اس نئے روپ سے نوجوان پریشان ہوا اٹھا تھا۔ ابھی وہ کچھ اور استفسار کرتا کہ لڑکی نے بڑے ہی تحکمانہ انداز میں کہا:

''مرنے کے بعد مجھے ملحدوں کے قبرستان میں ہی دفنانا۔ وہ جگہ تم نے کئی بار دیکھی ہے۔''

کہتے ہوئے اس نے ایک چھوٹی سی پوٹلی نوجوان کے ہاتھ پر رکھی اور رازداری کے انداز میں اس کے کان میں پھر کچھ کہنا شروع کیا۔ بات مکمل کرتے ہی دوشیزہ نڈھال سی نوجوان کی بانہوں میں آ رہی۔ بدن کے کئی حصوں سے خون رِس رِس کر خشک ہو چکا تھا اور اس کے داہنے کندھے سے گولی بھی چھو کر گزری تھی۔

سرسبز جنگل مکمل طور پر محض زمین کے وسیع و عریض قطعے میں تبدیل ہو چکا تھا اور وہاں پر مصنوعی جنگل تیار کیا جا رہا تھا۔ اس مصنوعی جنگل میں گھاس سے لے کر بڑے بڑے درخت، سب مصنوعی تھے، البتہ جانور اصلی رکھے جانے تھے جن کے لیے مخصوص جگہ بنائی گئی تھی۔ یہ کوئی چڑیا گھر یا پناہ گاہ نہیں بلکہ یہ کچھ اور ہی تھا جہاں مختلف قسم کے برقی - جالبینی تماشے ہونے ابھی باقی تھے۔ چوں کہ شہر روز بروز قریب تر آتا جا رہا تھا اور اپنے ساتھ سبزے کو مٹاتے ہوئے آنا اس کی فطرت نہیں بلکہ ضرورت تھی۔ شہری بچوں نے جنگل کہاں دیکھے تھے؟ اب انہیں مہنگے ٹکٹ لے کر مصنوعی جنگل دیکھنے کا شوق چرّایا تھا۔ یہ کتنا خوفناک عمل تھا کہ جس کا مداوا کسی صورت ممکن نہیں تھا۔ اصل جنگل کو ختم کر کے مصنوعی جنگل بنانا، یہ خود کو دھوکا دینا تھا۔ شہر دھیرے دھیرے اب مصنوعی جنگل سے ہم کنار ہو رہا تھا اور اس کی کثافت بڑھتی ہی جا رہی تھی۔

☆☆☆

اُس حادثے کے بعد لڑکی جاں بر نہ ہو سکی۔ اس کی صحت دن بہ دن گرتی گئی اور بدن اتنا لاغر ہو چکا تھا کہ بستر سے اٹھنا بھی محال تھا۔ نوجوان برسہا برس سے دوشیزہ کا وفادار تھا اسی لیے دوشیزہ کا سر وہ اپنی گود میں لیے ہوئے بیٹھا تھا کہ تبھی دوشیزہ نے وہ پوٹلی مانگی اور اس میں سے ایک بیج منہ میں رکھ کر پانی کے ساتھ نگل لیا۔ پوٹلی اس لڑکے کو دیتے ہوئے اس نے کہا:

''تم جانتے ہو تمہیں کیا کرنا ہے۔''

نوجوان نے بڑی ہی محبت اور سعادت مندی کے ساتھ اپنا سر خم کیا۔ دوشیزہ کی آنکھوں میں اطمینان صاف طور پر جھلک رہا تھا اور دھیرے دھیرے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔

بے جان دوشیزہ میں کشش نام کی کوئی بھی شے باقی نہیں رہ گئی تھی۔ نوجوان کے خیالات چوں کہ دوشیزہ سے بہت ملتے جلتے تھے اور وہ اس کا لمبے وقت سے ساتھی بھی تھا اس لیے اس نے دوشیزہ کی ساری وسیعتیں پوری کرنے کا مصمم ارادہ کیا ہوا تھا۔ لڑکی کے جسد کو قبر میں اتارنے کے بعد نوجوان نے اپنی جیب سے پوٹلی نکالی اور اس میں سے مقدس درخت کے بیج نکال کر لڑکی کے کانوں اور ناک میں رکھ دیے، اس کے بعد پستانوں کے درمیان، ناف کے گڑھے میں اور یہاں تک کہ پردۂ بکارت تک بھی بیجوں کو پہنچانے کا حکم اسے ملا ہوا تھا۔ بقیہ بیجوں کو اسے کسی خاص پتے پر پہنچانے جانا تھا۔ ملحدوں کے قبرستان میں بڑا سا قطعہ لڑکی نے بہت پہلے ہی خرید رکھا تھا جس میں اس کی قبر بنائی گئی۔ دفینے کے بعد بھاری قدموں سے نوجوان الٹے پاؤں چند قدم چلا اور بڑے ہی احترام سے اپنا سر خم کیا۔ جیسے آخری سلام کرتے ہوئے کہہ رہا ہو میں نے اپنے وعدے پورے کیے اور آگے بھی کروں گا۔

نوجوان نئے سفر پر تھا اور مصنوعی جنگل کے مالکان کی زمینیں اور Shares مہنگے ہوتے جا رہے تھے۔ شہر میں کثافت، حبس اور امراض کا قبضہ عروج پر تھا کیوں کہ وہاں نئے نئے امراض اور نئے نئے Industrial Park کھلتے ہی رہے تھے۔ مصنوعی جنگل یخ بستہ تھے، صاف تھے لیکن وہاں کچھ ہی دیر گھومنے کے لیے بھاری قیمت چکانی پڑتی تھی اور شہر گھٹ رہا تھا، تڑپ رہا تھا۔

برسوں بعد ایک UFO نما Aerocar ملحدوں کے قبرستان میں بلا برقی اجازت اترتی ہے جس میں پہلے سے کہیں زیادہ قبریں بن چکی ہیں لیکن کار جس کتبے کے سامنے رکتی ہے اس قبر کا قطعہ بہت بڑا ہے۔ قبر کے مقام سے ایک ایسا درخت نکلا ہوا ہے جو ایک ہی قسم کے کئی درختوں کا مجموعہ معلوم ہوتا ہے اور تناور درخت بننے کی راہ پر گامزن دکھائی دیتا ہے جس کے سبب قبر کا نام و نشان بھی معلوم نہیں ہوتا۔ ہوائی کار میں سے ایک روبوٹ باہر آتا ہے جو اس جوان درخت کے سامنے گھٹنوں پر بیٹھ جاتا ہے اور اپنا سر خم کرتا ہے۔ پھر کچھ دیر بعد اس درخت پر لٹکنے والے چند خشک پھلوں کو توڑتا ہے ایسا کرتے ہی قبرستان کے تمام کیمرے اور سینسرز روبوٹ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور ایک برقی آواز سے اسے تنبیہ کرتے ہیں۔ روبوٹ اپنا کام کر لینے کے بعد ہوائی کار میں بیٹھ کر آسمان کی بلندیوں میں کہیں گم ہو جاتا ہے۔

خونی لکیر

رمّانہ تبسم
پٹنہ سٹی (انڈیا)

سندیپ گرو ہر دو منٹ پر اسے کال کر رہا تھا۔۔۔۔۔

سندیپ گرو کی بات سن کر وہ کافی پریشان تھا۔اس کے دماغ میں میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔۔۔۔۔تبھی اس کی بیوی گیتا کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔

''دو بج گئے ہیں، گڑیا کو اسکول سے جا کر لے آئیں۔''

''ابھی میں ضروری کام سے باہر جا رہا ہوں، مجھے آنے میں دیر ہوگی، تم چلی جاؤ۔'' رنجیش نے موبائل آف کرتے ہوئے کہا۔

''آج آپ اسے چھوڑنے بھی نہیں گئے۔''

''روز جاتا ہوں نا، آج نہیں گیا تو پہاڑ ٹوٹ پڑا۔'' رنجیش جھلا کر بولا۔جلدی جلدی قمیص پہنی باہر آ کر گاڑی اسٹارٹ کی اور تیزی سے نکل گیا۔۔۔۔۔

جب اس نے سندیپ گرو کے فارم ہاؤس میں قدم رکھا تو ایک گلاب کی کلی اس کے دامن سے لپٹ گئی اس نے کلی کو الگ کیا اور فارم ہاؤس کے اندر پہنچا تو سندیپ گرو کچھ سیاسی لیڈران کے ساتھ بیٹھا سگار کے کش لے رہا تھا۔ٹیبل پر شراب کی بوتل رکھی ہوئی تھی۔حالاں کہ شراب پر سخت پابندی لگی ہے لیکن سیاسی رہنماؤں پر کوئی پابندی نہیں وہ کل بھی پوری آزادی سے استعمال کرتے تھے اور آج بھی کر رہے ہیں۔

''پرنام سندیپ گرو۔'' رنجیش نے آہستہ سے کہا۔

''آؤ رنجیش! آج آنے میں بڑی دیر کر دی۔'' سندیپ گرو سگار کے ہلکے ہلکے کش لیتے ہوئے بولا۔

''سندیپ گرو! آج کے بعد میں یہاں نہیں آؤں گا۔'' رنجیش نے نیچی نگاہ کرتے ہوئے کہا۔

سندیپ گرو نے اسے سر سے پیر تک گھور کر دیکھا۔سگار کی لمبی کش لی اور آہستہ آہستہ منہ سے دھواں چھوڑتے ہوئے بولا، ''کیوں۔۔۔۔۔؟''

''گرو جی! مجھ سے اب یہ کام نہیں ہوگا۔'' رنجیش نے پیشانی رگڑتے ہوئے کہا۔

''کیا بکواس کر رہے ہو، کیوں نہیں ہوگا؟ میں نے تمہیں زمین سے اٹھا کر آسمان پر بیٹھا دیا ہے۔'' سندیپ گرو غصے سے لال پیلے آنکھیں نکال کر اسے سر سے پیر تک گھورتے ہوئے بولا۔پھر شراب کی بوتل اٹھا کر تین چار گھونٹ منہ میں انڈیلی۔۔۔۔۔

''گرو! اگر اس نے کام نہیں کیا تو آپ کے لیے جھمیلا کھڑا ہو سکتا ہے۔'' یہاں بیٹھے ایک لیڈر نے یک لخت ایش ٹرے میں سگریٹ کو مسلتے ہوئے سندیپ گرو کے کان کے پاس آہستہ سے بولا۔

''ابے سالا شبھ شبھ بول، اتنے دنوں سے حرام کا کھا رہا ہے کبھی عقل سے بات کر۔یہی بھرسٹ بدھی کی وجہ سے تیری جوڑوا اپنے نئے یار کے ساتھ پھرُ رر۔۔۔۔۔ہو گئی اور یہ سالا کرے گا کیوں نہیں اس کا باپ بھی کرے گا۔'' سندیپ گرو نے شراب کا گلاس ہاتھ میں گھماتے ہوئے رنجیش کی طرف دیکھ کر کہا۔

''گرو جی! میں جب بھی یہ کام کرتا ہوں میری آتما اندر سے دھتکارتی ہے، اس کام سے نجات چاہتا ہوں۔'' رنجیش نے ہاتھ جوڑتے ہوئے کہا۔پسینے کے قطرے اس کے پورے جسم میں آری ترچھی ہو کر رینگنے لگے۔جس کی وجہ سے کپڑے بدن سے چپک گئے۔۔۔۔۔جس سے پسینے کی بدبو آ رہی تھی۔اس کی باتیں سنکر سندیپ گرو چند لمحے خاموش رہا پھر ہلکا سا قہقہہ لگایا شراب کی بوتل ٹیبل پر سے اٹھا کر غٹ غٹ منہ میں انڈیلی پھر ایک لمبی سانس لے کر بولا۔

''رنجیش! جس روز تم کام کی تلاش میں میرے پاس آئے تھے۔۔۔۔۔اس روز تمہارے بدن سے اسی طرح بدبو آ رہی تھی لیکن میرے یہاں کام کرنے کے بعد کچھ ہی دنوں میں تمہارے بدن کی بدبو پرفیوم میں بدل گئی، تمہاری تنگ دستی دور ہو گئی۔۔۔۔۔پھر آج یہ کام کرنے میں تمہارے قدم پیچھے کیوں ہٹ رہے ہیں۔'' سندیپ گرو نے خشک لہجے میں کہا۔

''گرو! پیٹ کی آگ بجھانے کے لیے مجبور ہو گیا تھا لیکن اب نہیں، مجھے چھما کر دیں۔۔۔۔۔میں یہ کام نہیں کروں گا۔۔۔۔۔ایک وقت کی روٹی کھاؤں گا لیکن سکون کی۔''

رنجیش کی باتیں سن کر سندیپ گرو نچلا ہونٹ چبانے لگا۔۔۔۔۔کچھ دیر کے بعد بولا، ''رنجیش! پچھلے سال تم نے جو بھی کام کئے تھے، اس کے لیے بھاری رقم دی تھی کہ تم نے چھے ماہ تک عیش کیا۔اس لیے اتنے جذباتی نہیں بنو، ہوش سے کام لو۔لوک سبھا الیکشن کی تاریخ کا اعلان ہو چکا ہے، اس کے بعد مجھے سانس لینے کی بھی فرصت نہیں ملے گی۔ایک روز میں کئی کئی سبھائیں کرنی پڑیں گی۔یہ لو جتنی رقم لینی ہے لے لو اور عیش کرو۔'' سندیپ گرو نے نوٹ کی گڈی اس کی طرف پھینکتے ہوئے کہا۔

رنجیش نے کنکھیوں سے نوٹ کی گڈیوں کی طرف دیکھا۔۔۔۔۔پھر خشک ہوئے ہونٹ پر زبان پھیرا۔۔۔۔۔اور بند بورے کی طرف نظر ڈالی جس سے ایک کلی لپٹی ہوئی تھی یہ دیکھ کر اس پر لرزش طاری ہو گئی۔

سندیپ گرو ہتھیار کا تسکری کرتا تھا۔ کئی بار جیل بھی جا چکا تھا۔ کچھ سیاسی لیڈران سے اس کا رابطہ تھا۔ ان کے اشارے پر جیل سے چھوٹ جایا کرتا تھا۔ ہتھیار تسکری کا کام وہ سیاسی رہنماؤں کے اشارے پر انجام دے رہا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے اندر بھی اقتدار کا نشہ چھانے لگا۔ سیاسی لوگوں کے سانٹھ گانٹھ کی وجہ سے اسے ٹکٹ مل گیا۔ پچھلے بیس سال سے ہتھیار کے بل پر لوک سبھا الیکشن میں جیت حاصل کرتا آ رہا تھا اور سیاست میں وہ گرو کے نام سے مشہور ہوتا چلا گیا۔ اس کے اندر اقتدار کے ساتھ عورت کا نشہ بھی چھانے لگا۔۔۔۔۔ اپنے فارم ہاؤس میں شکار منگاتا تا اور اب تک نا معلوم کتنی کلیوں کو مسل چکا تھا۔ رجنیش اس کے کام میں برابر کا شریک تھا۔ گرو کلیوں کو روندنے کے بعد رجنیش کے حوالے کر دیتا۔۔۔۔۔ مسلی ہوئی کلیوں کو وہ انجام تک پہنچا تا۔ اس کے عوض میں اسے موٹی رقم ملتی تھی۔ جس سے اس کے پاس اپنا گھر، گاڑی، بینک بیلنس سب کچھ ہو گیا تھا۔۔۔۔۔ اور اس کا شمار شہر کے امیر لوگوں میں ہونے لگا۔ نہیں تو پہلے صبح کھاتا تو رات کی سوچتا تھا۔

''رجنیش! اس سے پہلے کم پیسے میں بھی یہ کام انجام تک پہنچا چکے ہو۔ جلدی کرو ہمارے پاس وقت بہت کم ہے اور رات بھی گہری ہوتی جا رہی ہے۔'' گرو نے اس کی پیٹھ تھپتھپاتے ہوئے کہا لیکن اس کے قدم برف کی مانند ایک جگہ جم گئے تھے۔۔۔۔۔ وہ پورے بدن سے کانپ رہا تھا۔۔۔۔۔ پیشانی سے پسینے کی ننھی بوندیں پھوٹ رہی تھیں۔۔۔۔۔

''کم آن رجنیش!'' گرو نے اسے جھنجھوڑا۔

رجنیش دھیرے دھیرے قدم بڑھاتا ہوا آگے بڑھا۔۔۔۔۔ اس کے دل کی دھڑکن کافی تیز چل رہی تھی۔۔۔۔۔ کانپتے ہوئے ہاتھ سے بورے کو اٹھانے کے لیے جھکا تو کلی اس کے دامن سے پھر لپٹ گئی۔ اس نے کلی کو جھٹکے سے الگ کیا۔۔۔۔۔ بورے کو اٹھا کر گاڑی میں رکھا۔۔۔۔۔ اور اندھیری رات میں کالی سڑک پر گاڑی تیز رفتار میں اِدھر سے اُدھر دوڑانے لگا۔۔۔۔۔ سڑک کے دونوں جانب قطار سے درخت کھڑے تھے۔ جو رات کے سیاہی کی وجہ سے کالے دیو کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔ اس نے ایک گھنے جنگل میں گاڑی روکی۔ یہاں چہار اطراف اندھیرے کی حکمرانی تھی۔ یہاں سے کچھ دوری پر ندی تھی۔ ندی کا کنارا کافی چوڑا تھا۔ یہاں ریت ہی ریت بھرے تھے۔ اس نے گاڑی پھر اسٹارٹ کی۔ گاڑی کے پہیے ریت میں دھنس رہے تھے اور پہیے سے ریت اڑ رہی تھیں۔۔۔۔۔ کسی طرح وہ ندی کے قریب پہنچا۔ اس وقت ندی کی بے قرار لہریں خاموش بہہ رہی تھیں۔ لہروں سے بھیانک آواز نکل رہی تھیں۔ اس نے کانپتے ہوئے ہاتھ سے بورے کو ندی میں چھپاک۔۔۔۔۔ سے پھینکا، پانی اس کے جسم کے اوپر پڑا۔۔۔۔۔ اور سر سے پیر تک بھینگ گیا۔ پھر وہ مڑا گاڑی اسٹارٹ کی اور تیز رفتار سے چلاتا ہوا واپس لوٹنے لگا تو اسے ایک معصوم کلی کی چیخ سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔۔۔۔۔ کالی سڑک کے علاوہ کوئی نہیں تھا لیکن جیسے جیسے گاڑی آگے بڑھ رہی تھی چیخ اور تیز ہوتی جا رہی تھی۔ چیخ سن کر اس کے رونگٹے کھڑے ہونے لگے کہ اچانک ایک جگہ گاڑی رک گئی۔ اس نے دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن نہیں ہوئی تو گاڑی کھول کر انجن دیکھنے لگا۔ دوبارہ اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی لیکن جب نہیں چلی تو اسے وہیں چھوڑ کر دوسرے راستے سے تیز رفتار میں چلنے لگا۔۔۔۔۔ زمین جگہ جگہ ابھری ہوئی تھی، بڑے بڑے پتھر راستے میں پڑے ہوئے تھے، اس کا پیر پتھر سے ٹکرایا اور منہ کے بل گر پڑا۔۔۔۔۔ اس کے گھٹنے اور کہنیوں میں خراشیں پڑ گئیں۔ پیر کی انگلیاں زخمی ہو گئیں۔۔۔۔۔ ان سے خون نکل کر انگلیوں میں جم گئے۔ خون اس کے پتلون کے پائنچے میں لگ گئے تھے۔ وہ پیروں کو گھسیٹ کا چل رہا تھا۔ چلتے چلتے پھر وہ دوڑنے لگا۔۔۔۔۔ دوڑتے دوڑتے اس کے دائیں پیر کی چپل کے فیتے نکل گئے۔ فیتے سوراخ میں ڈالنے کی کئی بار کوشش کی۔۔۔۔۔ جب نہیں گیا تو چپل ہاتھ میں اٹھا لیا۔۔۔۔ اس نے پھر دیکھا کہ کلی ابھی بھی اس کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے۔ اس نے کلی کو نوچ کر دور پھینکا اور پھر دوڑنے لگا۔۔۔۔۔ اسے یوں محسوس ہوا کوئی سایا بھی اس کے پیچھے دوڑ رہا ہے۔۔۔۔۔ اس نے کئی بار پیچھے مڑ کر دیکھا۔ دوڑتے دوڑتے اس کی سانس پھولنے لگی لیکن وہ لگاتار دوڑتا رہا۔ ایک جگہ اس نے سوچا کچھ دیر بیٹھ جائے لیکن اس پر خوف طاری تھی۔ اس وقت ہوائیں بھی ہولناک چل رہی تھیں۔۔۔۔۔ الّو اور کتے کی آواز اس کے سماعت سے ٹکرا رہی تھیں۔ وہ دوڑتا رہا۔۔۔۔۔

اس نے ہانپتے ہوئے گھر کی چوکھٹ پر قدم رکھا تو دروازہ کھلا تھا۔ اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا کہ اتنی رات دروازہ پہلے کبھی نہیں کھلا رہا تھا آج کیا وجہ ہے۔ اس نے لڑکھڑاتے قدموں سے گھر کے اندر قدم رکھا تو اس کی بیوی آنکھوں میں آنسو لیے گم سم بیٹھی تھی۔ اس کے ارد گرد محلے کی کچھ عورتیں بیٹھیں اسے ڈھارس دے رہی تھیں۔۔۔۔۔ اس کے دل کا زور سے دھڑکنا کچھ لمحہ پہلے کم ہوا تھا کہ بیوی کی حالت دیکھ کر پھر سے بے تاب ہو کر اچھلنے لگا۔ وہ خشک آنکھوں سے سب کو دیکھ رہا تھا۔ گیتا کی نظر جب اس پر پڑی تو دوڑ کر اس سے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''کیا ہوا۔۔۔۔۔ اس طرح کیوں رو رہی ہو؟'' رجنیش نے گھبرا کر پوچھا۔

آنسوؤں سے گیتا کا چہرہ تر تھا۔۔۔۔

رجنیش نے گیتا کے آنسو انگلیوں سے صاف کیے۔ کچھ دیر کے بعد پھر پوچھا، ''جلدی

بتاؤ کیا ہوا۔۔۔۔؟

''آپ کہاں چلے گئے تھے؟

''کام سے گیا تھا۔۔۔۔روز ہی جاتا ہوں، اس میں رونے کی کیا بات ہے ۔۔۔۔ہاں آج کچھ دیر ہوگئی؟

گیتا پھر زار قطار رونے لگی۔۔۔۔

''اب آ گیا ہوں نا، آج کے بعد نہیں جاؤں گا۔'' رجنیش نے کان پکڑتے ہوئے گیتا کے آنسوؤں سے بھری آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔۔۔۔

گڑیا کے باپو! ہماری بیٹی گھر واپس نہیں آئی ہے۔'' گیتا رندھی ہوئی آواز میں بولی اور لمبی لمبی آہیں بھرنے لگی۔

''کیا۔۔۔۔؟

''ہاں۔۔۔۔!''

''گڑیا اسکول سے واپس نہیں آئی۔۔۔۔تم گئی تھی لانے۔''

''ہاں۔۔۔۔! لیکن وہ اسکول سے نہیں نکلی۔''

''تم نے اس کے اسکول اور سہیلی کے گھر فون کر کے پوچھا'' رجنیش نے اضطرابی کی حالت میں پوچھا۔''

''سبھی جگہ فون کیا۔۔۔۔اسکول کی ٹیچر سے بات کی ان کا کہنا ہے کہ آج گڑیا اسکول ہی نہیں آئی تھی۔'' گیتا ہچکی لیتے ہوئی بولی۔

''گڑیا اسکول نہیں پہنچی تو پھر۔۔۔۔کہاں گئی؟'' وہ سر کھجاتا ہوا بولا۔

''پتا نہیں۔۔۔۔ہر جگہ تلاش کیا۔۔۔۔ہماری بیٹی کو زمین نگل گئی۔۔۔۔یا آسمان کھا گیا۔'' گیتا سسکتے ہوئے بولی تو اس کی آنکھ میں بھی آنسو بھر گئے اور ٹپ ٹپ گرنے لگے۔ وہ قمیص کی آستین میں آنسو پونچھتے ہوئے بولا۔

''گھبراؤ نہیں۔۔۔۔ہماری بیٹی آجائے گی۔۔۔۔صبح تھانہ میں رپورٹ لکھا دیں گے۔'' رجنیش گیلی آواز میں بولا۔

''آپ کو آنے میں۔۔۔۔دیر ہو رہی تھی۔۔۔۔پڑوسیوں نے ۔۔۔۔رپورٹ لکھا دی ہے۔'' گیتا رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ روتے روتے اس کی آواز بیٹھ گئی تھی۔ گیتا کو بار بار دانت لگ رہے تھے۔۔۔۔اس کے پاس بیٹھی عورتیں اس کے چہرے پر پانی چھیٹ کر اسے ہوش میں لا رہی تھیں اور پانی کا گلاس منہ سے لگا رہی تھیں۔

رجنیش نے اضطرابی سے ٹہلتے ہوئے ایک نظر گیتا پر ڈالی جو بے سدھ دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھی تھی۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس کے قریب آ کر بیٹھ گیا اور اس کا سر اپنے شانے سے ٹکا لیا۔ چھت پر بلیوں کے رونے کی آوازیں آ رہی تھیں اور گلی میں کتّے کے بھونکنے کی آواز کے ساتھ کچھ اس کے دروازے سے منہ لگا کر رو رہے تھے۔ جس سے رات اور ڈراؤنی معلوم ہو رہی تھی۔ اس کا دل بند دروازے سے زور زور سے ٹکرانے لگا کہ دروازہ توڑ کر باہر نکل آئے گا۔ اس نے سینے پر ہاتھ رکھ لیا۔۔۔۔پھر آہستہ آہستہ چلتا ہوا چھوٹی سی فریم میں لگی بھگوان رام کی مورتی کے سامنے کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ جوڑ کر پراتھنا کرنے لگا۔۔۔۔بے شمار آنسو بھگون کی چرنوں میں گرنے لگے۔ روتے روتے اسے ہلکی سی جھپکی آنے لگی۔ اسے یوں محسوس ہوا کہ وہ سمندر کے کنارے کھڑا ہے۔ سمندر کی لہریں کبھی اوپر اٹھتی کبھی تھک کر سمندر سے لپٹ جاتی اور کبھی پلٹ کر ساحل کی طرف آ کر اس کے دونوں پیروں کو بھگونے لگتی ہیں۔۔۔۔ہوا کے تیز جھونکے اسے پیچھے کی طرف ڈھکیل رہی ہیں۔۔۔۔ایک مگرمچھ نے پانی سے نکل کر چھوٹی بچی کو اپنے جبڑے میں دبا لیا۔۔۔۔اچانک اس کی نیند ٹوٹ گئی۔

تبھی گھر کے باہر لوگوں کی شور سنائی پڑی۔۔۔۔

اس نے سر کو جھٹکا دیا۔۔۔۔

ابھی ہلکی سی صبح نمودار ہوئی تھی۔ رجنیش جلدی سے اٹھا۔۔۔۔گھر کے باہر آ کر دیکھا تو دروازے پر لوگوں کا ہجوم تھا۔ کچھ لوگ دوڑ کر اس طرف جا رہے تھے۔ جہاں سے ندی کا راستہ شروع ہوتا تھا۔ سب کی زبان پر ایک ہی بات تھی کہ ندی کے کنارے ایک بہتی ہوئی لاش ملی ہے۔

یہ سن کر اس کا دل دھک سے ہو کر رہ گیا۔ اس کے قدم بھی لوگوں کے پیچھے بڑھ گئے۔ اس نے دیکھا کہ وہ کلی ابھی بھی اس کے دامن سے لپٹی ہوئی ہے۔ جو مرجھا کر کلی خون کی گہری لکیر میں بدل گئی ہے اور خون سے اس کا دامن تر بتر ہے۔۔۔۔

خودنوشت نگاری نے اردو ادب میں ایک نیا مرحلہ کھولا ہے جو زندگی کی حقیقتوں کو نہایت خصوصی اور زبانی ہنرمندانہ شکل میں بیان کرتا ہے۔ یہ ادبی ہنر نے اہلیان کو مختلف پہلوؤں سے جدوجہد کرنے اور اپنے تجربات کو دوسروں کے ساتھ بانٹنے کے لئے ایک ذریعہ فراہم کیا ہے۔

خودنوشت نگاری نے اردو ادب کو ایک نیا طریقۂ تفکر فراہم کیا ہے جس نے سماجی، سیاسی، اور فرہنگی تبدیلیوں کا سامنا کرنے کے لئے نیا آئینہ فراہم کیا ہے۔ اردو خودنوشت ادبیات نے اہلیان کو اپنے زمانے کے معاشرتی، سیاسی، اور اقتصادی مضامین پر غور کرنے اور اپنی رائے کو آرٹسٹک اور خودنوشت طریقے سے اظہار کرنے کا موقع دیا ہے۔

خصوصی رپورٹ: مشرف حسنی (نمائندہ خصوصی، کینیڈا)

انٹرنیشنل کونسل آف آرٹس (کینیڈا) کے زیر اہتمام رئیس وارثی کے اعزاز میں ایک شام وشاندار مشاعرہ کا انعقاد

(کینیڈا، 13 اکتوبر 2024) انٹرنیشنل کونسل آف آرٹس (کینیڈا) نے اُردو مرکز نیو یارک کے بانی صدر اور عالمی ادبی جریدہ "سہ ماہی ورثہ نیو یارک" کے چیف ایڈیٹر رئیس وارثی کے اعزاز میں ایک خصوصی تقریب اور مشاعرے کا اہتمام کیا۔ یہ تقریب

رئیس وارثی کو امریکی صدارتی ایوارڈ ملنے کی خوشی میں منعقد کی گئی۔ تقریب کی صدارت معروف شاعر محترم رشید صدیقی نے کی، جبکہ قونصل جنرل آف پاکستان جناب خلیل احمد باجوہ تقریب کے مہمان خصوصی تھے۔ نیشنل کونسل آف آرٹس کے صدر شعب ناصر نے تقریب کی نظامت کے فرائض احسن انداز میں انجام دیئے۔ اس شام کو نہ صرف اردو ادب کے ممتاز شعرا نے اپنے کلام سے رونق بخشی بلکہ رئیس وارثی کی ادبی خدمات اور "ورثہ" کے ذریعے اردو ادب کے فروغ کے لیے ان کی کاوشوں کو سراہا گیا۔ مقررین نے اس بات پر زور دیا کہ رئیس وارثی کا کام نہ صرف اردو زبان کی بقا بلکہ اس کے عالمی سطح پر فروغ میں بھی اہم کردار ادا کر رہا ہے۔ مشاعرے میں شرکت کرنے والے شاعروں اور ادیبوں نے اپنی نظموں اور غزلوں کے ذریعے رئیس وارثی کو خراجِ تحسین

پیش کیا۔ اس موقع پر رئیس وارثی نے حاضرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اس اعزاز کو اردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے اپنی کوششوں کا تسلسل قرار دیا۔ یہ شام ادب اور محبت کی ایک یادگار محفل ثابت ہوئی، جس میں حاضرین نے اردو زبان کی خوبصورتی اور رئیس وارثی کی خدمات کا کھلے دل سے اعتراف کیا۔

تقریب کے اختتام پر حاضرین نے رئیس وارثی کو امریکی صدارتی ایوارڈ ملنے پر مبارکباد پیش کی اور اردو ادب کے فروغ میں ان کے عزم اور مستقل مزاجی کی تعریف کی۔ قونصل جنرل خلیل احمد باجوہ نے بھی اس موقع پر خطاب کرتے ہوئے رئیس وارثی کو سراہا اور کہا کہ ان جیسے افراد اردو زبان کے سفیر ہیں جو بیرونِ ملک رہ کر بھی اپنی ثقافت اور زبان سے گہرا تعلق برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ انہوں نے "ورثہ" جریدے کو اردو ادب کے فروغ کا ایک موثر پلیٹ فارم قرار دیا۔ نظامت کے فرائض انجام دیتے ہوئے شعب ناصر نے رئیس وارثی کی ادبی خدمات کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی اور ان کے فن اور شخصیت کو اردو زبان کے ایک نمایاں اثاثے کے طور پر پیش کیا۔ مشاعرے میں مختلف شعرا نے اپنے کلام کے ذریعے رئیس وارثی کو خراجِ تحسین پیش کیا، جن میں جدید لب و لہجے کے ساتھ روایتی شعری رنگ بھی نمایاں تھا۔ اس یادگار تقریب نے ثابت کیا کہ ادب کی دنیا میں رئیس وارثی کی خدمات کو بھرپور انداز میں تسلیم کیا جا رہا ہے، اور یہ ایوارڈ ان کے لیے ایک نیا سنگِ میل ثابت ہوگا۔ شرکاء نے اس بات پر بھی زور دیا کہ اردو زبان کی ترقی اور بقا کے لیے ایسی تقریبات اور مشاعروں کا انعقاد نہایت ضروری ہے تاکہ نئے لکھنے والوں کو بھی حوصلہ ملے اور وہ اس سفر میں شریک ہو سکیں۔ تقریب کا اختتام دعائیہ کلمات اور رئیس وارثی کے اعزاز میں کھڑے ہو کر دادِ تحسین دینے کے ساتھ ہوا۔ شرکاء نے اس موقع پر رئیس وارثی کے ساتھ تصاویر بنوائیں اور اردو ادب کے فروغ کے لیے اپنے تعاون کا یقین دلایا۔

عالمی ادبی خبریں

ترتیب: عشرت وارثی

امریکن صدارتی ایوارڈ یافتہ رئیس وارثی کے اعزاز میں
نیویارک میں تقریب اور عشائیے کا انعقاد

اُردو مرکز نیویارک کے صدر اور عالمی ادبی جریدہ ورثہ کے مدیر اعلیٰ جناب رئیس وارثی کو امریکن صدارتی ایوارڈ ملنے پر ایک اعزازی تقریب کا اہتمام کیا گیا۔ معروف کمیونیٹی شخصیت جناب عاطف خان کی قیام گاہ پر تقریب کا انعقاد کیا گیا۔ پاکستان

سے آئے ہوئے صحافیوں کی جانب سے رئیس وارثی کو اعزازی شیلڈ پیش کی گئی۔

تقریب میں نیویارک کی ادبی، صحافتی اور سماجی حلقوں کی اہم شخصیات نے شرکت کی اور رئیس وارثی کی خدمات کو سراہا۔ ان کی جانب سے اُردو زبان اور ادب کے فروغ کے لیے کی جانے والی کوششوں اور نیویارک میں ادبی سرگرمیوں کو بڑھانے میں اُن کے کردار کی تعریف کی گئی۔

رئیس وارثی، جو امریکن صدارتی ایوارڈ حاصل کرنے والی چند اہم شخصیات میں سے ایک ہیں، نے اس موقع پر اپنی مسرت اور شکرگزاری کا اظہار کیا اور کہا کہ یہ ایوارڈ نہ صرف ان کی ذاتی کامیابی ہے بلکہ یہ اُردو زبان کے عالمی سطح پر فروغ کا اعتراف ہے۔

تقریب کے اختتام پر شرکاء کے لیے پُرتکلف عشائیے کا اہتمام کیا گیا جس میں نیویارک کی کمیونیٹی شخصیات، صحافیوں اور دیگر مہمانوں نے شرکت کی۔

انجمن اُردو ویسٹرن میری لینڈ کا سالانہ مشاعرہ

انجمن اُردو ویسٹرن میری لینڈ کا سالانہ مشاعرہ 24 اگست 2024ء کو ہیگر سٹاؤن میری لینڈ میں منعقد ہوا اس مشاعرے کی صدارت محترم مومون ایمن کی اور مہمان خصوصی نئی نسل کے معروف شاعر وصی شاہ تھے جو اس مشاعرے میں شرکت کے لئے خصوصی طور پر پاکستان سے تشریف لائے تھی۔ پر جبکہ مشاعرے کی نظامت کر فرائض رئیس وارثی نے انجام دئے جس کو حاضرین نے بہت سراہا۔ پُرتکلف عشائیہ کے بعد کے بعد مشاعرے کا آغاز کیا گیا اس مشاعرے میں ایریزونا سے خصوصی شرکت کے لئے آئے معروف مزاحمتی شاعر ڈاکٹر جمال قادری، واشنگٹن سے علی گڑھ المنائی کے روح رواں ڈاکٹر عبداللہ اور نیویارک، نیوجرسی سے تعلق رکھنے والے شعراء اعجاز بھٹی، اویس راجہ، اور عامر بیگ نے اپنا کلام پیش کیا۔

پیرس ادبی فورم کا انالکو یونیورسٹی میں پہلے عالمی مشاعرے کا
انعقاد، سفیر پاکستان کی بھی شرکت

پیرس ادبی فورم کا انالکو یونیورسٹی پیرس میں پہلی ایک عالمی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا۔ مشاعرہ پیرس کی معروف تنظیم پیرس ادبی فورم کے زیر اہتمام اور تعاون سے منعقد ہوا۔

عالمی مشاعرے میں یورپ کے معروف شعراء کرام اشتیاق میر انگلینڈ، نعیم حیدر برمنگھم، غزل انصاری انگلینڈ، تسنیم حسن یوکے، سمیہ ناز انگلینڈ، راحت زاہد اسکاٹ لینڈ، سے شریک ہوئے۔ مشاعرے کی صدارت انگلینڈ کے معروف شاعر اشتیاق میر نے کی جبکہ نظامت کے فرائض پیرس ادبی فورم کی صدر اور شاعرہ مسمن شاہ نے ادا کیے۔ فرانس کی کسی یونیورسٹی میں یہ پہلا عالمی مشاعرہ منعقد ہوا اس لحاظ سے یہ ایک تاریخی تقریب تھی۔ مشاعرے میں فرانس میں سفارت خانہ پاکستان سے سفیر پاکستان عاصم افتخار احمد نے خصوصی شرکت کی اور مشاعرے کے شرکاء کو مبارکباد دی۔ شعراء کرام نے اپنے دلکش کلام سے حاضرین محفل کو خوب محظوظ کیا اور ڈھیروں داد وصول کی۔ مشاعرے کے اختتام پر پیرس ادبی فورم کی جنرل سیکریٹری ناصرہ خان نے

سفیر پاکستان اور مہمان شعراء کو پھول پیش کیے۔ اورانا لکو کے اردو ڈپارٹمنٹ میں اردو کے پروفیسر شاہ زمان حق کا شکریہ ادا کرتے ہوئے کہا کہ یہ مشاعرہ انکی انتھک محنت اور کوشش سے ممکن ہوا۔ ناصرہ خان نے ان کے بھرپور تعاون کو سراہا اور تقریب میں شریک تمام مہمان شعراء حاضرین محفل جن میں پیرس کی معروف شخصیات فیشن ڈیزائنر نیناں خان مشہور سیاسی وسماجی شخصیت روحی بانو، سمیت میڈیا کا شکریہ ادا کیا۔ اس موقع پر پیرس ادبی فورم فرانس کی کامیابی کے دس سال مکمل ہونے پر پیرس ادبی فورم کے سفر پر مبنی رپورٹ پیش کی گئی۔

دبئی کے عظیم الشان عالمی مشاعرے کا انعقاد

دبئی کے عالمی مشاعرے میں مشہور ہندوستانی شاعرہ فوزیہ رباب نے شرکت کی۔

جہاں ہزاروں کی تعداد میں شریک سامعین نے ان کے کلام کی غیر معمولی پذیرائی کی۔ یہاں جاری ایک ریلیز کے مطابق گوا سے تعلق رکھنے والی مشہور شاعرہ، معروف ادبی و تعلیمی تنظیم رباب فاؤنڈیشن کی بانی صدر فوزیہ رباب کی محبت اور سماجی حسیت سے بھر پور شاعری کو وہاں موجود سخن فہم سامعین نے پسند کیا اور بر پور داد و تحسین سے نواز

سعودی عرب کے معروف تخیل ادبی فورم کے زیر اہتمام عالمی مشاعرے کا انعقاد

سعودی عرب کے معروف تخیل ادبی فورم کے زیر اہتمام الریاض میں عالمی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس میں پاکستان، سمیت بحرین، کویت اور سعودی عرب کے شعرا نے اپنا اپنا کلام سنا کر سامعین کے دل جیت لئے۔

تقریب کے مہمانانِ خصوصی پاکستان سے آئے ہوئے علمی شہرت یافتہ شعراء عمیر نجمی اور عمار اقبال نے تخیل ادبی فورم کی فروغ ادب کیلئے کی جانے والی کوششوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ مشاعرے اور ادبی تقاریب ہماری زبان اور ثقافت کے فروغ کا اہم ذریعہ ہے مشاعرے کیلئے اچھی شاعری اور باذوق سامع کا ہونا ضروری ہے۔ تقریب سے خطاب کرتے ہوئے فورم کے سرپرست اعلی منصور محبوب چوہدری نے کہا کہ معاشرے میں تعمیری سرگرمیوں کے فروغ اور مثبت اقدار کی ترویج کے لیے ادب کا کردار بہت اہمیت کا حامل ہے تقریب سے؛ گوہر رفیق؛ صابر امانی، راشد محمود، عظمت اللہ بھٹہ شاہد ریاض، پیر اسد کمال، شاہد خیالوی، ساجدہ چوہدری، فیصل اکرم گیلانی اور دیگر نے بھی اپنے اپنے کلام سے حاضرین کو خوب محظوظ کیا اور داد وصول کی تقریب کے آخر میں مہمانانِ خصوصی شعراء کو تخیل ادبی ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔

حلقہ بیت الادب، بارسلونا کے زیر اہتمام عالمی مشاعرہ

امریکہ، برطانیہ، جرمنی، فرانس اور سپین کے شعراء کی شرکت

حلقہ بیت الادب کے زیر اہتمام بارسلونا میں عالمی مشاعرہ کا اہتمام کیا گیا، جس کی

صدارت قونصل جنرل بارسلونا مراد علی وزیر نے کی۔ مشاعرہ میں امریکہ، برطانیہ، پیرس، جرمنی سے شعراء اکرام نے شرکت کی۔

مشاعرہ کا آغاز تلاوت قرآن مجید سے ہوا، جبکہ ہدیہ نعت مظہر حسین راجہ نے پیش کیا۔ نظامت کے فرائض صدر حلقہ بیت الادب رانا نیئر اقبال نے سرانجام دیئے۔ عالمی مشاعرہ میں میاں محمود عامر (امریکہ) محترمہ فرزانہ فرحت (لندن) محترمہ طاہرہ رباب (جرمنی) شفیق مراد (جرمنی) کامران شفیق (پیرس) اور محمود احمد راہی (پیرس) سے شرکت کی اور اپنی شاعری کے ذریعے سامعین کو محظوظ کیا۔ اور خوبصورت شاعری پر حاضرین نے دل کھول کر شعراء کو داد دی۔ سپین کے مقامی شعراء میں ارشد نذیر ساحل، ارشد اعوان، نیئر اقبال نجمی، رؤف آرائیں، راج کمار پنڈوری، شبیر گلو، شہباز

جامی، اشفاق احمد، میاں عمران تبسم اور دیگر شامل نے کلام پیش کیا۔

محفلِ سخن جشنِ طارق قمر میں سجی رنگین شام

جے پور کے سوڈالہ میں منعقدہ جشنِ طارق قمر محفلِ سخن میں ملک و بیرون ملک کے مشہور شاعروں نے اپنے حیرت انگیز کلام سے ماحول کو خوبصورت بنا دیا۔ پروگرام کے نگران لوکیش کمار سنگھ ساحل نے بتایا کہ اس میں لکھنؤ سے ڈاکٹر طارق قمر، جودھپور سے ایم آئی ظاہر، جے پور سے ملکہ نسیم، ڈاکٹر عادل رضا منصوری، تبسم رحمانی، انعام شرر، ڈاکٹر رفیق ہاشمی، لوکیش۔ کمار سنگھ ساحل، پریم پہاڑ پوری، آلوک چترویدی اعجاز الحق شہاب، سہیل ہاشمی اور سنیل جشن نے بہترین غزلیں پیش کیں۔ بزرگ شاعر تبسم رحمانی نے صدارت کی اور لکھنؤ کے شاعر ڈاکٹر طارق قمر کو دُشالہ، ناریل اور سند سے نوازا گیا۔ پروگرام کی نظامت ایجاز الحق شہاب نے کی۔ آخر میں سہیل ہاشمی نے سب کا شکریہ ادا کیا۔ اس محفل میں راجستھان اردو اکیڈمی کے سابق صدر ڈاکٹر حسین رضا بھی موجود تھے، جنہوں نے اس ثقافتی تقریب کی تعریف کی۔

رام بھدر آچاریہ کو سنسکرت اور گلزار کو اردو کے لئے گیان پیٹھ ایوارڈ

ایوارڈ یافتگان کو 11 لاکھ روپے کی انعامی رقم، واگ دیوی کا مجسمہ اور توصیفی سند سے نوازا گیا۔

2024 کا نوبل انعام برائے ادب جنوبی کوریا کی مصنفہ ہان کانگ کے نام

جنوبی کوریا کی معروف مصنفہ ہان کانگ کو 2024 کا نوبل انعام برائے ادب دیا گیا ہے۔ ان کو یہ اعزاز" ان کی شاعرانہ نثر، جو تاریخی سانحات کا سامنا کرتی ہے اور انسانی زندگی کی ناپائیداری کو بے نقاب کرتی ہے" کے اعتراف میں دیا گیا۔ ہان کانگ 1970 میں جنوبی کوریا کے شہر گوانگجو میں پیدا ہوئیں اور نو سال کی عمر میں اپنے خاندان کے ساتھ سیول منتقل ہوگئیں۔ ان کا ادبی پس منظر ہے کیونکہ ان کے والد بھی مشہور ناول نگار ہیں۔

انہوں نے 1993 میں شاعری سے اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اور 1995 میں اپنے اولین افسانوی مجموعے "Love of Yeosu" کے ذریعے نثر نگاری میں قدم رکھا۔ ان کا سب سے بڑا بین الاقوامی کامیاب ناول "The Vegetarian" (2007) ہے، جس نے انہیں عالمی شہرت بخشی۔ اس ناول میں مرکزی کردار کے ذریعے روایتی غذائی عادات سے انکار اور اس کے تشدد آمیز نتائج کو بیان کیا گیا ہے۔

لاہور پریس کلب کے زیر انتظام 3 روزہ کتاب میلہ

لاہور پریس کلب کے زیر انتظام 3 روزہ کتاب میلہ اختتام پذیر ہوگیا۔ کتاب میلے میں لاہور کے 15 بڑے پبلشرز نے حصہ لیا۔ تین روزہ کتاب میلے میں مجموعی طور پر 1500 کتابیں فروخت ہوئیں۔ کتاب میلہ ہر روز دوپہر 12 بجے سے رات 10 بجے ہوا۔ اس طرح مجموعی طور پر تیس گھنٹے میں 1500 کتابیں بکیں اور ہر 10 گھنٹے میں 500 کتابیں فروخت ہوئیں۔

فرینکفرٹ میں ساٹھویں بین الاقوامی کتاب میلے کا افتتاح

ساہتیہ اکادمی کی فرینکفرٹ بین الاقوامی کتاب میلے میں شرکت

فرنکفرٹ کتاب میلے کے ڈائرکٹر یورگن بوؤس امسالو میلے کی افتتاحی تقریب میں

جرمن شہر فرینکفرٹ میں منعقد ہونے والے امسالہ بین الاقوامی کتاب میلے کی افتتاحی تقریب میں جرمن وزیر خارجہ فرانک والٹر شٹائن مائر اور ترکی کے صدر عبداللہ گل نے حصہ لیا۔ سو سے زائد ممالک کے سات ہزار چار سو نمائش کنندگان فرنکفرٹ کے ساٹھویں بین الاقوامی کتاب میلے میں حصہ لے رہے ہیں۔ منی ایشاء کے نام سے جانا جانے والا ملک ترکی اس بار کے کتاب میلے کا مہمان خصوصی اور پارٹنر ملک ہے۔

ایشیاء اور یورپ کے سنگم پر واقع مشرقی اور مغربی تہذیب کے انوکھے امتزاج کی جیتی جاگتی مثال ترکی کے صدر عبداللہ گل کا خیر مقدم کرتے ہوئے امسالہ کتاب میلے کی افتتاحی تقریب میں وفاقی جرمن وزیر خارجہ فرانک والٹر اشٹائن مائر نے کہا کہ ترکی دو براعظموں کے بیچ ایک ثقافتی پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ ترکی ادب کی وسعت پر روشنی ڈالتے ہوئے جرمن وزیر خارجہ نے کہا کہ اس ادب میں ترک معاشرے کے اندر پائے جانے والے تزادات سے لے کر قدیم روایات، مذہبی اقدار اور موڈرن ریاست کے سماجی اور سیاسی تقاضوں جیسے متنازع موضوعات اور سب ہی کچھ شامل ہے۔ اشٹائن مائر کے مطابق تمام دنیاء خاص طور سے جرمنی کے لئے یہ ایک انوکھا موقع ہے ترکی کی رنگ برنگی ثقافت اور اسکے ادب کے بارے میں قریب سے آشنائی حاصل کرنے کا۔ انھوں نے کہا کہ اسکے ساتھ ہی جرمنی کی کوشش ہے کہ ترکی میں جرمن ادب اور ثقافت کو زیادہ سے زیادہ متعارف کروایا جائے۔

بھارتی مصنفہ نے امریکی ایوارڈ ٹھکرا دیا

قبائلی مصنفہ جسنتا کیرکیٹا نے فلسطینیوں کے ساتھ یکجہتی کے اظہار کے لیے امریکہ کا روم ٹو ریڈ ینگ آتھر ایوارڈ لینے سے انکار کر دیا ہے۔ بچوں کے لیے ان کے شعری مجموعہ جرہل کو ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔ جسنتا کیرکیٹا کا کہنا ہے کہ ایک شاعرہ کی حیثیت سے وہ فلسطین کے بچوں، خواتین اور متاثرین کے ساتھ یکجہتی کا اظہار

کرنا چاہتی ہیں جسنتا کیرکیٹا کا کہنا ہے کہ ایک شاعرہ کی حیثیت سے وہ فلسطین کے بچوں، خواتین اور متاثرین کے ساتھ یکجہتی کا اظہار کرنا چاہتی ہیں۔ بھارتی صوبے جھارکھنڈ کے مغربی سنگھ بھوم ضلعے سے تعلق رکھنے والی مصنفہ، شاعرہ اور سماجی کارکن اکتالیس سالہ جسنتا کیرکیٹا کو ان کے شعری مجموعہ 'جرہل' کو بچوں کے ادب کے مصنفین کے ایوارڈز میں 'روم ٹو ریڈ ینگ آتھر ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا تھا۔

الحمرا میں محفل مشاعرہ کا انعقاد

نامور شاعر اور سماجی ادبی شخصیت عباس تابش نے مشاعرے کی صدارت کی چیئر مین الحمرا رضی احمد کی خصوصی شرکت الحمرا ایسی تقریبات کی حوصلہ افزائی کرتا ہے جس سے ادبی روایات کو تقویت ملے۔ شعراء کرام نے اپنا بہترین کلام پیش کیا۔ صوفیہ بیدار، صائمہ آفتاب، شوکت فہمی، خالد ندیم شانی، خرم آفاق، عمیر مشتاق، دیگر نامور شعرا نے اپنا اپنا کلام پیش کیا شعراء نے اشعار، غزلیں، نظمیں پیش کر کے سماں بدل دیا ہال میں موجود سامعین نے عمدہ شعروں پر دل کھول کر داد دی۔

جناب عارف نقوی کے انتقال پر اردو ادبی حلقوں کا گہرا رنج وغم

سہ ماہی ورثہ اردو مرکز نیویارک کی جانب سے، ان کے انتقال پر دلی تعزیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ جرمنی میں مقیم اردو ادب کی معروف شخصیت، جناب عارف نقوی کے انتقال کی خبر سن کر اردو ادبی حلقوں میں گہرے رنج وغم کی لہر دوڑ گئی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ عارف نقوی صاحب، جو ادب کے شعبے میں اپنی گراں قدر خدمات اور اردو زبان کے فروغ کے لیے اپنے غیر معمولی کردار کی وجہ سے جانے جاتے تھے، اب ہم میں نہیں رہے۔

عارف نقوی صاحب نے اپنی زندگی کا بڑا حصہ اردو زبان و ادب کی خدمت میں گزارا اور دیارِ غیر میں رہتے ہوئے اردو کو فروغ دینے کے لیے متعدد اقدامات کیے۔ ان کی تحریروں نے نہ صرف قارئین کو متاثر کیا بلکہ اردو ادب کے طلبا کے لیے راہیں ہموار کیں اور آنے والی نسلوں کے لیے قیمتی اثاثہ چھوڑا۔ سہ ماہی ورثہ اردو مرکز نیویارک کی جانب سے، ان کے انتقال پر دلی تعزیت کا اظہار کیا گیا ہے۔ ورثہ کے مدیران نے اپنے بیان میں کہا کہ" عارف نقوی صاحب کا انتقال اردو ادب کے لیے ایک ناقابل

تلافی نقصان ہے۔ وہ ایک عظیم انسان اور سچے اردو دوست تھے، جن کی کمی ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔"

غضنفر ادب اکیڈمی پاکستان کا سالانہ نعتیہ مشاعرہ

غضنفر ادب اکیڈمی پاکستان کم وبیش عرصہ بارہ سال سے سرزمینِ خانیوال پر نشستوں اور مشاعروں کی صورت میں ادب کو فروغ دینے میں مصروفِ عمل ہے اگرچہ درمیان میں کچھ مسائل کی وجہ سے وقفہ جات بھی رہے مگر یہ سلسلہ رکا نہیں اور آج بھی اسی جوش وجذبے سے جاری وساری ہے یہ سب اراکینِ اکیڈمی کا عزم واستقلال ہے جو اتنے عرصہ میں لاتعداد نشستیں، مشاعرے منعقد کر چکی ہے جن میں نعتیہ مشاعرے، مسالمہ، غزلیہ مشاعرے اور دیگر نشستیں وغیرہ شامل ہیں یہ ادبی تنظیم پاکستان کے معروف نعت گو شاعر قبلہ عباس عدیم قریشی صاحب کی سرپرستی میں پھل پھول رہی ہے عہدِ حاضر میں عباس عدیم قریشی صاحب ان اساتذہ میں شامل ہیں جو عروض اور فنی وفکری محاسن پر کمال دسترس رکھتے ہیں اور یقیناً نعت، سلام، منقبت، غزل اور دیگر اصنافِ سخن میں ہمارے لیے ایک مستند اور مضبوط حوالہ ہیں۔

27 ستمبر بروز جمعہ شام 4 بجے غضنفر ادب اکیڈمی خانیوال کا ایک اور اہم پڑاؤ یعنی محفلِ نعت ذکرِ سرورِ کونین، خاتم النبین، محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم گورنمنٹ پوسٹ گریجویٹ کالج خانیوال میں منعقد ہوئی۔ اس مقدس اور خوبصورت عشقِ رسول ص سے سجی محفلِ نعت کا آغاز حسبِ روایت تلاوتِ کلامِ پاک سے ہوا جس کی سعادت جناب مجاہد علی یاسر نے حاصل کی اس کے بعد خانیوال کے معروف خوش لحن نعت خوان جناب حسن شاہ سعیدی نے بارگاہِ رسولِ مقبول ص میں قبلہ عباس عدیم قریشی کی نعت پیش کر کے محفل کو اپنے خوبصورت ترنم سے بابرکت بنا دیا جبکہ نظامت کے فرائض راقم الحروف محسن رضا شافی نے سرانجام دیے ذکرِ محمد وآلِ محمد ص کی اس مبروک محفل کا مزید احوال کچھ اس طرح رہا

صدارت: قبلہ عباس عدیم قریشی، مہمانانِ خاص: پروفیسر ناصر عباس اطہر، ڈاکٹر یوسف سمرا، امتیاز علی اسد، مہمانانِ اعزاز: مجاہد علی یاسر، طارق جاوید، عقیل شیخ، عاطف نیازی، راؤ سانول سجاد، مشرف عباس عبیر

میزبان شعراء: ندیم رضا فارق، عارش خان، فرہاد حسین رومی، محسن رضا شافی، شاہد منیر رائے، شاہد اقبال، سلیم رضا سمرا۔ اس رحمت بھری محفلِ نعت میں تمام مہمان ومیزبان شعراء نے بارگاہِ سرورِ کونین ص میں عشق کے جذبات سے لبریز اپنے عقیدت نامے پیش کر کے نجات ورحمت کے خزینے اپنے نام کیے۔

مجلسِ فروغِ ادب کبیر والا کا تیسرا سالانہ نعتیہ مشاعرہ

مجلسِ فروغِ ادب کبیر والا نے 21 ستمبر 2024 کو (37 ویں نشست) تیسرا سالانہ نعتیہ مشاعرہ جناح میونسپل لائبریری کبیر والا میں منعقد کیا اور اگلے ہی روز مختصر وقت میں انتظامات مکمل کر کے 22 ستمبر 2024 بروز اتوار دن 10 بجے دن المرتضیٰ ہاؤس (نزد المدینہ موبائل شاپ) کبیر والا میں ایک مختصر مگر بھرپور نعتیہ مشاعرہ (38 ویں نشست) منعقد کیا یہ محفلِ نعت ٹیکسلا راولپنڈی سے آئے ہوئے خوبصورت نعت گو شاعر جناب صدام فدا کے اعزاز میں رکھی گئی۔ ذکرِ محمد وآلِ محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سجی اس بابرکت اور وجد آفریں محفلِ نعت کا احوال پیش ہے۔ صدارت: سید طاہر شاہ (وہوا)، مہمانِ خاص: صدام فدا (ٹیکسلا)، مہمانِ اعزاز: تاثیر جعفری کبیر والا، تلاوت: مزمل ادراک، نعت: اویس حیدر جعفری، نظامت محسن رضا شافی۔ نعتیہ مشاعرہ: (ترتیب اول تا آخر) محسن رضا شافی، مشرف عباس عبیر، مزمل ادراک، سید حسین اکبر، راؤ سانول سجاد، سید فرخ رضا ترمذی، طارق جاوید، تاثیر جعفری، صدام فدا، سید طاہر شاہ دیگر شرکاء میں اویس حیدر جعفری، سنی خان، شہباز خان سیال، اسلم رفیق، چودھری آصف، اشعل عباس شامل تھے۔ آخر میں خطبہ صدارت کے ساتھ جناب سید طاہر شاہ نے مجلسِ فروغِ ادب کبیر والا کی ادبی خدمات کو سراہتے ہوئے خراجِ تحسین پیش کیا خاص کر کبیر والا میں نعت گوئی اور محفلِ نعت کے سلسلے کو جاری رکھنے پر نیک تمنائیں پیش کیں اور نوجوان شعراء کی بھرپور حوصلہ افزائی کی۔

ممتاز اردو اسکالر، ممتاز نقاد، محقق، مترجم صحافی پروفیسر ضیاء الرحمان صدیقی کو ایم پی اردو اکادمی، وزارت ثقافت مدھیہ پردیش نے ایک قومی اردو ایوارڈ سے نوازا گیا ہے۔

یہ قومی ایوارڈ وزیر ثقافت مسٹر لودھی اور اکیڈمی کے ڈائریکٹر ڈاکٹر نصرت مہدی نے ان کے شاندار کام اور اردو تحقیق اور شراکت پر دیا ہے۔ خاص طور پر ان کی مشہور کتاب

"تحریک آزادی اور اردو نثر" پر جس کے مندرجات اور اس کے مضامین جیسے افسانہ، ڈرامہ، مزاح اور طنز وصحافت وغیرہ شامل ہیں۔ پروفیسر ضیاء الرحمن صدیقی کی قابل ذکر خدمات جیسے اردو ادب کی تاریخ، اردو ہندی لغت، ارمغان تحقیق، اصولی فکر، بنگالی کہانیاں، دون کا سبزہ (اردو ترجمہ رسکن بانڈ) سوانگ سانگ کا سفر ہندوستان اردو ترجمہ، اسان اردو گرامر وغیرہ۔ انہوں نے ہندوستان اور بیرون ملک مشہور جرائد میں دو سو تحقیقی مقالے بھی لکھے ہیں۔ پروفیسر صدیقی انٹرنیشنل جرنل ورسانیو یارک اور اردو AMU جرنل دانش کے ایڈیٹر (ر) بھی ہیں۔ پچھلے تیس سالوں سے وہ یومن خدمات فراہم کر رہے ہیں اور تدریس اور تحقیق میں مصروف ہیں۔ پروفیسر کیو ایچ فریدی، چیئر مین پروفیسر ایس سراج اجملی اور دیگر فیکلٹی ممبران نے ان کی شاندار کامیابی پر خوشی کا اظہار کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ نہ صرف شعبہ بلکہ پوری یونیورسٹی کے لیے ایک قابل فخر لمحہ ہے۔ ان کی اردو کے لیے خدمات اور شراکت کو یو کے کی تاریخ میں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی (اسلام آباد) میں ادبی سوسائٹی کے قیام کی افتتاحی تقریب کا انعقاد

علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، اسلام آباد میں ادبی سوسائٹی کے قیام کی افتتاحی تقریب اور پہلے سیشن کا انعقاد گذشتہ روز ہوا۔ ڈی جی کوالٹی ایشورنس ایجنسی ایچ ای سی سید ناصر شاہ مہمان خصوصی تھے جبکہ پرنسپل پوسٹ گریجویٹ ایچ 8 کالج اسلام آباد پروفیسر ڈاکٹر

محمد خالد نے صدارت کے فرائض انجام دیئے۔ ادبی سوسائٹی کے پہلے سیشن کے مہمان مقرر ڈین کلیہ سماجی علوم پروفیسر ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر نے اپنے خطاب میں کہا کہ برصغیر میں جب انگریز آئے تو انہوں نے سب سے پہلے ادب اور ثقافت پر قبضہ کیا، جو قومیں آزاد ہیں ان کا ادب بھی زندہ ہے اور جو قومیں غلام ہوتی ہیں ان کی کوئی جمالیات نہیں ہوتیں۔ انہوں نے مزید کہا کہ اس طرح کی تقریبات علم، ادب و زبان کے فروغ میں اندھیرے میں چراغ کا کام کرتی ہیں اور یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہے گا۔

مشہور شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی نے شاعری اور افسانہ نگاری کو نئی سمت دی، ادبی تقریب میں متعدد مقررین نے کیا

مشہور شاعرہ رفیعہ شبنم عابدی نے شاعری اور افسانہ نگاری کو نئی سمت دی ہے اس کا اظہار متعدد مقررین نے کیا اور ان کک ادبی خدمات کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی کے زیر اہتمام میرا ادبی سفر" کے عنوان کے تحت یہ سلسلے وار

پانچواں پروگرام تھا۔ اس ادبی سفر کی خصوصی مہمان پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی نے محترمہ برہانی کالج اور مہاراشٹر کالج ممبئی میں ایک عرصہ تک درس و تدریس کی خدمات انجام دینے کے بعد شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی میں شعبۂ صدر کے عہدے پر رہ کر سبکدوش ہوئیں۔

اس موقع صدر شعبہ ڈاکٹر عبداللہ امتیاز احمد، (صدر شعبۂ اردو ممبئی یونیورسٹی) نے افتتاحی کلمات سے تقریب کا آغاز کیا اور رفیعہ شبنم عابدی کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کیا۔ اُردو پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی شاعرہ کی حیثیت سے پوری اردو دنیا میں مشہور و معروف ہیں۔ اس کے علاوہ انہوں نے تحقیق و تنقید کے میدان میں بھی اپنے نقش ثبت کیے ہیں۔

گوشہء کتب

سودائے جنوں

(جاسوسی کہانیوں کا مجموعہ)

حنا خراسانی رضوی سویڈن میں مقیم ایک ممتاز ادیبہ ہیں، جو اردو ادب میں اپنے منفرد اسلوب اور تخلیقی کہانیوں کی بدولت پہچانی جاتی ہیں۔ان کی کتاب سودائے جنوں، ایک سنسنی خیز جاسوسی کہانیوں کا مجموعہ، قاری میں تجسس اور معمہ حل کرنے کا شوق بیدار کرتی ہے۔

حنا خراسانی رضوی کی کتاب سودائے جنوں ایک منفرد اور دلچسپ جاسوسی کہانیوں کا مجموعہ ہے، جو قاری کو سنسنی خیز دنیا میں لے جاتی ہے۔ یہ کہانیاں نہ صرف ذہنی چالاکی، معمہ سازی اور انسانی نفسیات کے پیچیدہ پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں بلکہ جرائم کے پیچھے موجود سماجی، نفسیاتی اور جذباتی عوامل کو بھی سامنے لاتی ہیں۔کتاب کی ہر کہانی ایک الگ معمہ پیش کرتی ہے اور مصنفہ نے بڑی خوبصورتی سے مختلف کرداروں کے ذریعے کہانیوں کو ترتیب دیا ہے۔کہانیوں کا ماحول حقیقت کے قریب اور پلاٹ میں پیش آنے والے واقعات قاری کے دل میں تجسس اور تجزیے کی جستجو پیدا کرتے ہیں۔ ہر کہانی میں ایسا موڑ موجود ہوتا ہے جہاں قاری حیران رہ جاتا ہے اور انجام تک پہنچنے کے لیے اپنی ذہانت استعمال کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

اردو زبان میں بیسیویں تصنیف

قانتہ رابعہ (لندن)

برصغیر پاک و ہند کی مایہ ناز افسانہ نگار اور کہانی کار آپا قانتہ رابعہ کی اردو زبان میں بیسیویں تصنیف شائع ہوگئی ہے۔ عالمی اشاعتی ادارے پریس فار پیس کے زیر اہتمام کہانیوں کا مجموعہ" تیمور کیسے بدلہ؟ رنگین آرٹ پیپر کے اضافی صفحات کے ساتھ دیدہ زیب تصاویر کے ساتھ شائع کیا گیا ہے۔قانتہ رابعہ کی اس نئی تصنیف میں بچوں اور بڑوں کی اخلاقی تربیت کے مختلف عنوانات کے تحت دلچسپ اور مزے دار کہانیوں کو شامل کیا گیا ہے۔قانتہ رابعہ کی تحریریں اہم ملکی اخبارات اور جرائد میں شائع ہوتی ہیں۔قبل ازیں ان کی کتب سرکاری تعلیمی اداروں کی لائبریریاں کے لئے خصوصی پراجیکٹ کے طور پر شائع ہو چکی ہیں۔مصنفہ ملکی اور قومی سطح کے متعدد اعزازت اور انعامات بھی جیت چکی ہیں۔دو ہزار چوبیس میں ان کی تحریر کردہ ایک اور کتاب" ننھا بہادر" انڈیا اور پاکستان سے بیک وقت شایع ہو کر قارئین اور مبصرین سے داد و تحسین وصول کر چکی ہے۔

سلمی صنم شخصیت اور فن

محقق و مصنف سید مبارک علی شمسی پاکستان

بنگلور (کرناٹک) میں مقیم انڈیا کی معروف افسانہ نگار کے سلمی صنم کے فن اور شخصیت پر مبنی مذکورہ تحقیقی کتاب منظر عام پر آچکی ہے۔اس میں پروفیسر عاصم بخاری، یسین ثاقب بلوچ، اعظم سہیل ہارون، سارہ آغا اور فرزانہ یاسمین کی ماہرانہ آراء شامل ہیں 390 صفحات کی کتاب 8 ابواب پر مشتمل ہے۔باب اول مضامین باب دوم تبصرے مجموعہ طور پر گیا ہوا شخص باب سوئم تبصرے مجموعہ پت جھڑ کے لوگ، باب چہارم تبصرے مجموعہ پانچویں سمت، باب پنجم تبصرے مجموعہ قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں، باب ششم تجزیے، باب ہفتم انٹرویوز، باب ہشتم مشاہیر کی آراء شامل ہیں۔کتاب کا دیدہ زیب ٹائٹل عمران شاور نے بنایا ہے۔اس کی حسن ترتیب محمد افضل خان وینس، اقبال خان وسیر اور تزئین و اہتمام اعظم سہیل ہارون نے کی ہے۔کتاب ادبی تنظیم بزم شمسی پاکستان (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام شاہ شمس مطبوعات لاہور/ حاصل پور/ ملتان نے شائع کی ہے۔

لفظ بولتے ہیں

تابندہ سلیم

لفظ بولتے ہیں محترمہ تابندہ سلیم کے کالموں کا مجموعہ ہے. وہ ایک مدت سے ملک کے مختلف اخبارات میں کالم نگاری کر رہی ہیں. تابندہ سلیم ایک تجربہ کار کالم نگار ہیں جنہوں نے مختلف النوع موضوعات پر دلچسپ اور معیاری کالم تحریر کر کے اپنا لوہا منوایا ہے. انہوں نے اپنی کتاب کا انتساب اپنی والدہ کے نام کیا ہے وہ لکھتی ہیں" اس ہستی کے نام جس کی گود میری پہلی درسگاہ تھی میری ماں کے نام کہ ان کا سکھایا ہوا آج صفحہ قرطاس پر منتقل ہوا" انہوں نے اپنی کتاب کے اغاز میں اظہار تشکر کے زیر عنوان تحریر فرمایا ہے کہ" میرے کالموں کا مجموعہ لفظ بولتے ہیں کو تحریر کرنے کے دوران بہت سے ایسے مواقع آئے کہ جب میری ہمت اور حوصلہ جواب دے گیا، دل اچاٹ ہوا تو میں نے اللہ تعالی سے کامیابی کی دعا کی اللہ تعالی جو اپنے بندوں کو کبھی ناکام نہیں دیکھ سکتا اس نے مجھے ایسی سرفرازی بخشی جو آج آپ کے سامنے ہے میرے والدین اور دوست احباب نے بھی میری ہمت کو بڑھایا میرے لیے اور میری کامیابی کی دعا کی اسی طرح میرے کولیگز نے بھی بہت حوصلہ افزائی کی جن کی تہہ دل سے شکر گزار ہوں اور سمجھتی ہوں کہ ان معاملات میں مخلص دوست احباب کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی کی وجہ سے میرے کالموں کا مجموعہ لفظ بولتے ہیں آپ تک پہنچ سکا". کتاب کا بغور مطالعہ ہمیں یہ آگاہی فراہم کرتا ہے۔

امِ زہرا سیدہ خدیجہ (سلام اللہ علیہا)

نصیر وارثی

نصیر وارثی کی کتاب ام زہراؑ اشاعت کے آخری مراحل میں 315 صفحات پر مشتمل اس کتاب میں حضرت خدیجہؑ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کو علمی اور تحقیقی انداز میں بیان کیا گیا ہے۔

معروف شاعر، ادیب، اور محقق نصیر وارثی کی زیرِ ترتیب کتاب ام زہراؑ، جس میں ام المومنین حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی شخصیت اور نقوشِ حیات پر تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے، اشاعت کے آخری مراحل میں داخل ہو چکی ہے۔ 315 صفحات پر مشتمل یہ کتاب حضرت خدیجہؑ کی حیاتِ مبارکہ کے مختلف پہلوؤں کو علمی اور تحقیقی انداز میں بیان کرتی ہے، اور اسلامی تاریخ میں ان کے اہم کردار کو اجاگر کرتی ہے۔

ام زہراؑ کی تیاری کے دوران نصیر وارثی نے قدیم اسلامی ماخذ اور جدید تحقیقاتی طریقوں کو بروئے کار لاتے ہوئے اس کتاب کو ایک جامع، مفصل، اور مستند تاریخی دستاویز میں ڈھالنے کی کوشش کی ہے۔ اس کتاب میں حضرت خدیجہ سلام اللہ علیہا کی ذاتی اور سماجی زندگی، اسلام کے ابتدائی مراحل میں ان کی قربانیاں، اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ ان کے تعلقات پر مفصل مضامین شامل ہیں۔

کتاب کی اہمیت میں اضافے کے لیے معروف علمی و ادبی شخصیات کے تبصرے بھی شامل کیے گئے ہیں، جنہوں نے نصیر وارثی کے اس علمی کارنامے کو سراہتے ہوئے اسے اسلامی تاریخ اور ادب کے میدان میں ایک منفرد اضافہ قرار دیا ہے۔ نصیر وارثی کے مداح اور علمی دنیا میں ان کے کام کو سراہنے والے افراد کے لیے یہ کتاب ایک نایاب تحفہ ہوگی، جس سے حضرت خدیجہؑ کی شخصیت اور ان کے کارناموں سے متعلق قیمتی معلومات فراہم ہوں گی۔

نصیر وارثی کا پہلا نعتیہ مجموعہ کلام

"عشقِ شاہِ اُمم"

اشاعت کے قریب

اردو ادب کی دنیا میں نمایاں مقام رکھنے والے شاعر، ادیب، نصیر وارثی کا پہلا نعتیہ مجموعہ "عشقِ شاہ امم" زیر ترتیب ہے اور جلد ہی اشاعت کے مراحل سے گزر کر قارئین کے ہاتھوں میں پہنچنے والا ہے۔ اس مجموعے میں نصیر وارثی نے نبی اکرم ﷺ کی محبت اور عقیدت کو شاعری کے خوبصورت پیرایے میں پیش کیا ہے۔ اس مجموعہ کلام پر نعتیہ ادب کی معروف علمی شخصیات کی رائے بھی شامل کی گئیں ہیں۔

اس کے حوالے سے نصیر وارثی کا کہنا ہے کہ "عشقِ شاہ امم" کا مقصد رسول اکرم ﷺ سے محبت کو عام لوگوں تک پہنچانا ہے تا کہ وہ محبت جو انسانیت کا پیغام ہے، ان کے دلوں میں جاگزیں ہو۔ ان کی شاعری میں نبی ﷺ کی حیاتِ مبارکہ اور ان کے پیغامِ انسانیت کو خوبصورتی سے بیان کیا گیا ہے۔

ادبی حلقوں میں "عشقِ شاہ امم" کے منتظر قارئین اور نصیر وارثی کے مداحوں کے لیے یہ مجموعہ ایک بیش قیمت تحفہ ثابت ہوگا۔ اس مجموعے کی اشاعت کی تاریخ اور تفصیلات جلد ہی فراہم کی جائیں گی۔

ادارہ، ورثہ پبلی کیشنز، اُردو مرکز نیو یارک

یادرفتگاں

ڈاکٹر عبادت بریلوی

ادیب، محقق، اور نقاد

ڈاکٹر عبادت بریلوی ایک معروف پاکستانی ادیب، محقق، اور نقاد تھے جنہوں نے اردو ادب میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔ ان کی خاص توجہ اردو زبان و ادب کی تنقید اور تحقیق پر رہی۔ ان کی تحریریں اردو ادب کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرتی ہیں، خاص طور پر تنقید کے میدان میں انہوں نے قابل ذکر کام کیا۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی کا تعلق بریلی، بھارت سے تھا، مگر انہوں نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ پاکستان میں گزارا اور اردو ادب کے فروغ کے لیے کام کیا۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کی پہچان اردو تنقید ہے، وہ اردو کے صفِ اول کے نقاد مانے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ محقق اور سفر نامہ نگار بھی ہیں۔ ان کی تصانیف میں اردو تنقید کا ارتقا، تنقیدی زاویے، غزل اور مطالعۂ غزل، غالب کا فن، غالب اور مطالعۂ غالب، تنقیدی تجربے، جدید اردو تنقید، جدید اردو ادب، اقبال کی اردو نثر اور شاعری، شاعری کی تنقید کے نام سرفہرست ہیں۔ ان کے سفر ناموں میں ارضِ پاک سے دیارِ فرنگ تک، ترکی میں دو سال، دیارِ حبیب میں چند روز اور لندن کی ڈائری اور آپ بیتی یادِ عہدِ رفتہ کے نام شامل ہیں۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی 14 اگست، 1920ء کو بریلی، اتر پردیش، برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ ان کا اصل نام عبادت یار خان تھا۔ 1942ء میں انہوں نے لکھنؤ یونیورسٹی سے ایم اے اور 1946ء میں اسی یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

حصول تعلیم کے بعد تدریسی زندگی اختیار کی۔ پہلے اینگلو عربک کالج دہلی میں مدرس ہوئے لیکن تقسیم ملک کے بعد ہجرت کر کے پاکستان چلے گئے۔ لاہور میں اورینٹل کالج، پنجاب یونیورسٹی سے وابستہ ہوئے اور ترقی کرتے ہوئے شعبہ اردو کے صدر بن گئے۔ ڈین فیکلٹی آف آرٹس بھی ہوئے۔ اورینٹل کالج کے پرنسپل بھی رہے۔ 1980ء میں اپنے عہدہ سے سبکدوش ہوئے۔ عبادت بریلوی نے انقرہ یونیورسٹی، ٹرکی اور اسکول آف افریقن اورینٹل اسٹڈیز لندن میں استاد کی خدمات انجام دیں۔

عبادت بریلوی اردو کے نامور نقاد اور محقق ہیں۔ ان کی بعض کتابیں ہندو پاک کی مختلف یونیورسٹیوں کے نصاب میں رہی ہیں۔ ان کی شہرت کی ایک وجہ یہ بھی ہے۔ ویسے انہوں نے اردو تنقید میں اپنی ایک مخصوص جگہ بنالی ہے۔ اس حد تک کہ یہ نام فراموش نہیں کیا جاسکتا۔ ان کی تصنیف و تالیف کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ چند کے نام ہیں: ''اردو تنقید کا ارتقا''، ''تنقیدی زاویے''، ''غزل اور مطالعہ غزل''، ''غالب کا فن''، ''روایت کی اہمیت''، ''جدید شاعری''، ''جدید اردو ادب'' اور ''میر تقی میر''۔ یہ ساری کتابیں اہم سمجھی جاتی ہیں۔ طلبا کے لیے یہ مفید تو ہیں ہی اردو شعر و ادب کے مزاج کی تفہیم میں ذہین لوگوں کے لئے بھی راہیں متعین کرتی ہیں۔ 19 دسمبر 1998ء کو ڈاکٹر عبادت بریلوی لاہور میں وفات پا گئے۔ وہ لاہور میں سمن آباد کے قبرستان میں آسودۂ خاک ہیں۔

نیاز فتحپوری

بانی: ادبی رسالہ نگار

نیاز فتحپوری کا اصل نام: نیاز محمد خان اور تاریخی نام: لیاقت علی خاں تھا۔ وہ 1884ء میں بارہ بنکی ضلع کی تحصیل رام سنیہی گھاٹ میں پیدا ہوئے جہاں ان کے والد امیر خاں بطور پولیس انسپکٹر تعینات تھے۔ امیر خان اچھے ادبی ذوق کے مالک تھے اور ان کا مطالعہ بہت وسیع تھا۔ نیاز نے ابتدائی تعلیم فتحپور، ندوہ اور رامپور کے مدارس میں حاصل کی۔ مدرسوں میں وہ درس نظامی پڑھتے تھے لیکن گھر پر ان کے والد ان کو فارسی پڑھاتے تھے اور وہ بھی فارسی کی ابتدائی کتابیں نہیں، بلکہ مینا بازار، پنج رقعہ، شاہنامہ اور دیوان اور دفاتر ابوالفضل وغیرہ۔ گھر میں نیاز کا دوسرا مشغلہ غیر مذہبی کتابوں کا مطالعہ تھا جو مدرسہ کے ان کے استادوں کو سخت ناپسند تھا۔ مذہبی طریق تعلیم کی طرف سے نیاز کی بے اطمینانی کم عمری سے ہی شروع ہوگئی تھی وہ دینی معاملات میں اپنے اساتذہ سے بحث کرتے تھے۔ مذہبی امور میں اساتذہ کی مقلدانہ کور عقلی اور بچوں کے ساتھ ان کی مار پیٹ ایسی باتیں تھیں جنھوں نے نیاز کو مروجہ مذہبی تعلیم سے متنفر کر دیا۔ آگے چل کر انھوں نے لکھا ''میں اس کمسنی میں بھی بار بار سوچا کرتا تھا اگر عبادت اور مذہبی تعلیم کا صحیح نتیجہ یہی ہے تو مذہب اور مذہبیت کوئی معقول چیز نہیں۔'' میٹرک پاس کرنے کے بعد نیاز پولیس میں بھرتی ہو گئے اور 1901ء میں ان کا تقرر بطور سب انسپکٹر الہ آباد کے تھانہ ہنڈیا میں ہوگیا۔ تقریباً ایک سال ملازمت کرنے کے بعد نیاز نے استعفیٰ دے دیا اور اس کے بعد انھوں نے اس وقت کی برائے نام آزاد چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں مختلف چھوٹے بڑے عہدوں پر ملازمتیں کیں، تدریس کا کام کیا یا پھر اخبارات سے وابستہ رہے۔ وہ 1910ء میں زمیندار اخبار سے وابستہ ہوئے، 1911ء میں ہفتہ وار ''توحید'' کے نائب مدیر مقرر ہوئے، 1913ء میں

ہفت روزہ ’’خطیب‘‘ کے قلمی معاون رہے، اور 1919ء میں اخبار ’’رعیت‘‘ کے مدیر اعلی بنے۔ اس عرصہ میں ان کی ادبی اور علمی سرگرمیاں جاری رہیں اور انھوں نے اپنی شاعری، افسانوں اور علمی مضامین کی بدولت باذوق علمی وادبی حلقوں میں شہرت حاصل کر لی۔ 1914ء میں حکیم اجمل خان نے ان کو اپنے قائم کردہ انگریزی اسکول میں ہیڈ ماسٹر مقرر کردیا۔ اس زمانہ کے بارے میں ’’خطیب‘‘ کے مالک اور مدیر ملّا واحدی کہتے ہیں ’’نیاز صاحب حکیم اجمل خان کے اسکول کی ہیڈ ماسٹری کے علاوہ خطیب میں ادبی و مذہبی مضامین بھی لکھتے تھے 1914ء میں ان کی مذہبی تحریریں ادبی تحریروں کی طرح پسند کی جاتی تھیں۔ اس زمانے میں نیاز نماز کے پابند تھے۔ لیکن تقریباً روزانہ دونوں سنیما دیکھنے جاتے تھے نیاز فلم دیکھ کر ایک مضمون ضرور لکھتے تھے۔ ان کا ’’کیوپڈ اور سائکی‘‘ ناولٹ کسی فلم سے متاثر ہو کر لکھا گیا تھا۔‘‘ نیاز اردو، فارسی اور عربی میں بھی شعر کہتے تھے۔ 1913ء میں ان کی نظمیں ’’شہر آشوب اسلام‘‘ اور ’’بت خانہ‘‘ الہلال اور ’’نقاد‘‘ میں شائع ہوئی تھیں۔ شاعری گاہے بہ گاہے دوسروں کو سنانے کے لئے کرتے تھے۔ ان کا کوئی مجموعۂ کلام شائع نہیں ہوا۔ ان کو جو شاعری کرنی تھی وہ انھوں نے اپنی نثر میں کی۔

1915ء میں نیاز اپنے عقیدتمندوں کی درخواست پر بھوپال چلے گئے جہاں وہ پہلے پولیس میں اور پھر محکمۂ تاریخ میں کام کرتے رہے۔ اس محکمے میں ان کو لکھنے پڑھنے کی زیادہ فرصت ملی اور یہیں انھوں نے ’’تاریخ الدولتین‘‘، ’’مصطفیٰ کمال پاشا‘‘، اور ’’تاریخ اسلام۔۔۔ ابتدا سے حملۂ تیمور تک‘‘، لکھیں۔ ’’صحابیات‘‘ قمر الحسن کی تصنیف ہے لیکن نیاز کے طویل دیباچہ کے طفیل اسے بھی نیاز کی کتابوں میں گنا جاتا ہے۔ بھوپال میں قیام کے دوران ہی نیاز نے ’’نگار‘‘ جاری کیا۔ وہ ترکی شاعرہ نگار بنت عثمان سے بہت متاثر تھے۔ 1927ء میں ان کو بھوپال چھوڑنا پڑا کیونکہ انھوں نے محل کی داخلی سیاست پر اظہار خیال شروع کر دیا تھا اور ریاست کے کچھ وزیر نیاز کی تحریروں سے حوالہ سے ان کو دہریہ بھی قرار دیتے تھے۔ 1927 میں وہ لکھنؤ آ گئے جہاں انھیں اپنے خیالات کے اظہار کی زیادہ آزادی تھی۔ ’’نگار‘‘ کا یہی عہد زرّیں تھا۔ 1962ء میں حکومت ہند نے ان کی علمی وتدریسی خدمات کے لئے ان کو ’’پدم بھوشن‘‘ کے خطاب سے نوازا۔ لیکن اسی سال وہ ہجرت کرکے پاکستان چلے گئے جس کا سیاست یا قومیت سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ یہ ان کے کچھ سنگین گھریلو مسائل تھے۔ وہ پاکستان میں بھی ’’نگار‘‘ نکالتے رہے لیکن ان کو وہاں وہ آزادی میسر نہیں تھی جو ہندوستان میں تھی۔ 24 مئی 1966ء کو کراچی میں کینسر کے مرض میں ان کا انتقال ہوا۔

فراق گورکھپوری

فراق گورکھپوری (1896–1982) اردو کے معروف شاعر، نقاد، اور ادیب تھے جنہوں نے اردو شاعری میں اہم مقام حاصل کیا۔ ان کا اصل نام "رشید احمد خان" تھا اور وہ گورکھپور، اتر پردیش سے تعلق رکھتے تھے، جہاں سے ان کا تخلص "فراق" آیا۔ فراق گورکھپوری کی شاعری میں رومانویت، غم، اور انسانی جذبات کی گہرائیوں کو بہت خوبصورتی سے پیش کیا گیا ہے۔

انہوں نے اردو ادب میں نقد و نظر کی اہمیت کو اجاگر کیا اور اپنی تنقیدی تحریروں سے ادب کے معیار کو بلند کیا۔ ان کی شاعری میں غالب کے اثرات بھی نظر آتے ہیں، لیکن ان کا اپنا ایک منفرد رنگ تھا۔ ان کی مشہور کتابیں "گورکھپوری کا انتخاب" اور "فراق گورکھپوری کی منتخب نظمیں" ہیں۔

فراق گورکھپوری کی شاعری میں درد اور تنہائی کے موضوعات خاص طور پر اہم ہیں۔ ان کے اشعار میں غالب کے اثرات بھی نمایاں ہیں، اور ان کی شاعری کا ایک خاص پہلو وہ ہے جس میں وہ انسانی احساسات اور جذبات کی انتہائی باریکی سے عکاسی کرتے ہیں۔

فراق گورکھپوری کی شاعری میں غالب کی طرح درد، تنہائی، اور محبت کے گہرے جذبات کی جھلکیاں ملتی ہیں، لیکن ان کا اسلوب زیادہ سادہ اور بیان میں گہرائی سے بھرپور تھا۔ ان کی شاعری میں فلسفیانہ اور فطری خیالات کی گونج ہے، جو زندگی کے پیچیدہ سوالات اور انسانی تعلقات کی حقیقت کو بیان کرتی ہے۔

ان کی نظموں میں ایک خاص نوع کی غمگینی اور بے بسی کا عنصر پایا جاتا ہے، لیکن ساتھ ہی انہوں نے اس غم کو ایک خوبصورت تخلیقی عمل میں ڈھال کر اسے فن کا حصہ بنا دیا۔ ان کی سب سے مشہور نظموں میں "یادیں" اور "شام کی دھوپ" شامل ہیں، جن میں وہ اپنے ذاتی تجربات اور احساسات کو باآسانی پیش کرتے ہیں۔

فراق گورکھپوری نے اپنی شاعری میں متعدد موضوعات کو چھوا، جن میں محبت، عیش و آرام، زندگی کا فریب، اور افراتفری کے دور میں انسان کا اکیلا پن شامل ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ انسان جب تک اپنے دکھوں کا ادراک نہیں کرتا، وہ دنیا کے حقیقی معنی کو نہیں سمجھ سکتا۔ اسی لیے ان کی شاعری میں ایک نیا منظر نظر آتا ہے، جو ہمیں اپنے اندر کی دنیا کو بہتر طور پر جانچنے کی دعوت دیتی ہے۔

اس کے علاوہ، فراق گورکھپوری اردو ادب کے بڑے نقاد بھی تھے، اور انہوں نے ادب کی معیاری تنقید کے اصولوں کو ترتیب دینے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کا تنقیدی نظریہ "حسیت" پر مبنی تھا، جس میں انہوں نے فن پارے کے جمالیاتی اور جذباتی پہلو کو

اہمیت دی۔ وہ ہمیشہ ادب کو صرف ذہنی کھیل نہیں، بلکہ ایک حقیقی انسانی تجربہ کے طور پر دیکھتے تھے۔ فراق گورکھپوری کا شمار اردو ادب کے ان شاعروں میں ہوتا ہے جن کی شاعری نے نہ صرف ایک عہد کی عکاسی کی بلکہ وہ آج بھی اردو ادب کے طلبہ، محققین اور شاعری کے شائقین کے لیے ایک اہم حوالہ ہیں۔

سعادت حسن منٹو

سعادت حسن منٹو (1912–1955) اردو ادب کے ایک عظیم اور متنازعہ افسانہ نگار تھے، جنہیں اپنی حقیقت پسندی، سماجی تنقید اور جرات مندی کے لئے جانا جاتا ہے۔ ان کا اسلوب خاص طور پر ان کی بے باک اور ناپسندیدہ حقیقتوں کو بیان کرنے کے حوالے سے مشہور ہے۔ انہوں نے اردو ادب میں ایک منفرد مقام حاصل کیا، اور ان کے افسانے آج بھی عالمی ادب میں اہمیت رکھتے ہیں۔

زندگی کا مختصر خاکہ: سعادت حسن منٹو کا تعلق پاکستان کے شہر امرتسر سے تھا، اور ان کا خاندان تقسیم کے وقت پاکستان منتقل ہوگیا۔ منٹو نے اپنی ابتدائی تعلیم امرتسر میں حاصل کی اور پھر بمبئی (موجودہ ممبئی) میں اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ منٹو نے اپنی زندگی کے بیشتر حصے کو اس وقت کے ہندوستان کے معاشرتی اور سیاسی مسائل میں غرق پایا، اور ان کی تحریریں ان ہی مسائل کی عکاسی کرتی ہیں۔

شاعری اور افسانہ نگاری: منٹو کا افسانہ نگاری کا سفر ابتدا میں ہندی اور اردو کے مختلف رسائل اور جرائد میں شائع ہونے والے مختصر افسانوں سے شروع ہوا۔ ان کے افسانے سماج کی سیاہ حقیقتوں کو کھول کر پیش کرتے تھے، جنہیں دوسرے مصنفین عام طور پر نظرانداز کرتے۔ ان کی کہانیاں خواتین کے مسائل، جنس، مذہب، طبقاتی فرق اور تقسیم ہند کے اثرات پر مبنی ہوتی تھیں۔

منٹو کا اسلوب سادہ، واضح اور براہ راست تھا، جس میں وہ انسان کے اندھیرے پہلوؤں کو بڑی بے رحمی سے بیان کرتے تھے۔ ان کے افسانے میں چیلنج اور سوالات ہوتے ہیں جو اس وقت کے معاشرتی اقدار اور مروجہ اخلاقیات کے خلاف اٹھائے جاتے تھے۔

مشہور افسانے: منٹو کی سب سے مشہور کہانیاں "ٹھنڈی ہوا"، "کالی شلوار"، "کسر" "بو" اور "بابو گوپی ناتھ" ہیں۔ ان کہانیوں میں منٹو نے انسان کے پیچیدہ جذبات، سماجی ناہمواریوں اور معاشرتی تشویشات کو بے خوفی سے پیش کیا۔

تقسیم ہند اور منٹو: تقسیم کے بعد، منٹو کی زندگی اور ادبی تخلیقات میں ایک واضح تبدیلی آئی۔ تقسیم ہند کے فسادات اور انسانی ظلمتوں نے ان کی تحریروں میں ایک خاص بے چینی اور غمگینی پیدا کی۔ ان کی کہانیاں اس دور کے فسادات کی حقیقتوں کی عکس بندی کرتی ہیں، اور اس وقت کے لوگوں کے جذبات کو اجاگر کرتی ہیں۔

متنازعہ اور جرات مندی: منٹو کی تحریریں ان کے زمانے کے قاریوں اور نقادوں کے لیے بہت متنازعہ ثابت ہوئیں۔ انہوں نے معاشرتی taboos جیسے جنس، بالغوں کی محبت، اور جنسی تعلقات جیسے موضوعات کو کھل کر پیش کیا۔ ان کی اس جرات مندانہ تحریریں انہیں متعدد مرتبہ مقدمات کا سامنا بھی کرنے پر مجبور کر گئیں، اور انہیں اخلاقی اور قانونی طور پر چیلنج کیا گیا۔

موت اور ورثہ: سعادت حسن منٹو کی زندگی مختصر تھی، اور وہ 1955 میں صرف 43 سال کی عمر میں انتقال کر گئے۔ ان کی وفات کے باوجود ان کا ادبی ورثہ آج بھی زندہ ہے اور ان کی تحریروں کا مطالعہ نہ صرف اردو ادب بلکہ عالمی سطح پر بھی کیا جاتا ہے۔ منٹو کی ادبی خدمات اور ان کی حقیقت پسندی آج بھی اردو ادب میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے، اور ان کی کہانیاں ادب کے شائقین اور نقادوں کے لیے ہمیشہ ایک متنازعہ، مگر انتہائی اہم موضوع رہی ہیں۔

خدیجہ مستور

خدیجہ مستور (ولادت: 11 دسمبر، 1927ء - وفات: 26 جولائی، 1982ء) پاکستان سے تعلق رکھنے والی اردو کی مشہور و معروف ناول نگار و افسانہ نگار تھیں جو اردو ادب کی بے حد مقبول شخصیات میں سے ایک تھیں۔ خدیجہ اپنے ناول آنگن کی وجہ سے دنیائے ادب میں شہرت رکھتیں ہیں جس پر ہم ٹی وی کی طرف سے ڈراما بھی بنایا گیا۔ ان کی چھوٹی بہن ہاجرہ مسرور بھی ایک ناول نگار و افسانہ نگار تھیں جبکہ شاعر، ڈراما نگار اور کالم نگار خالد احمد ان کے چھوٹے بھائی تھے۔

خدیجہ کے والد سید طہور احمد خان برطانوی فوج میں طبیب تھے۔ ان کا انتقال دل کا دورہ پڑنے کی وجہ سے ہوا۔ خدیجہ 1947ء میں پاکستان کی آزادی کے بعد اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کی اور لاہور میں مقیم ہوئیں

خدیجہ مستور 11 دسمبر، 1927ء کو بلسہ، بریلی، برطانوی ہندوستان میں پیدا ہوئیں۔ ان کے والد کا نام ڈاکٹر طہور احمد خان تھا وہ سرکاری ملازم تھے، ملازمت کی وجہ سے مختلف شہروں اور قصبوں میں اُن کا تبادلہ ہوتا رہا جس کی وجہ سے وہ صحیح معنوں میں بچوں کی تعلیم و تربیت پر توجہ نہ دے سکے۔ خدیجہ کی والدہ کا نام انور جہاں تھا، وہ ایک پڑھی

لکھی خاتون تھیں، اکثر اُن کے مضامین خواتین کے مختلف رسالوں میں چھپتے تھے۔ اُن کی دیکھا دیکھی بچوں میں بھی ادبی رجحانات پیدا ہوئے۔ چھوٹی عمر میں ہی خدیجہ کے والد صاحب کا انتقال ہو گیا، جس کی وجہ سے اُن کے خاندان کو بے حد مشکلات پیش آئیں۔ کچھ عرصہ بمبئی میں قیام رہا۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آ گئیں اور لاہور میں مستقل قیام پزیر ہوئیں۔ یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ خدیجہ کا خاندان ہجرت کے وقت انتہائی بے سروسامانی کی حالت میں تھا ایسے کڑے وقت میں احمد ندیم قاسمی نے ان کی مدد کی۔ 1950ء میں خدیجہ کی شادی مشہور افسانہ نگار احمد ندیم قاسمی کے بھانجے ظہیر بابر سے ہوئی جو صحافت کے پیشے سے منسلک تھے۔ خدیجہ نے شادی کے بعد بڑی پُرسکون زندگی گزاری۔ دونوں میاں بیوی میں بے حد محبت تھی۔ دونوں ایک دوسرے کا بے حد خیال رکھتے تھے۔

خدیجہ کے افسانوں کے پانچ مجموعے سامنے آئے۔ جن میں بوچھاڑ اور چند روز اور شامل ہیں۔ 1962ء میں اپنے شہرہ آفاق ناول آنگن پر آدم جی ادبی انعام ملا۔ جب کہ اُن کے افسانوں کے آخری مجموعے ٹھنڈا میٹھا پانی پر انھیں ہجرہ ایوارڈ سے نوازا گیا۔

خدیجہ کا پہلا افسانہ کب منظر عام پر آیا، اس کے بارے میں کہنا کچھ مشکل ہے تاہم اُن کے مطبوعہ افسانوں کا اولین سراغ دلّی کے رسالے ساقی سے ملتا ہے۔ اس رسالے نے اُردو افسانے کے فروغ میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اس کے علاوہ اُن کے افسانے لاہور کے رسالے عالم گیر، ہفت روزہ خیام اور ادب لطیف میں بھی شائع ہوتے رہے ہیں۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ ساقی کے اپریل 1944ء کے شمارے میں دونوں بہنوں ہاجرہ مسرور اور خدیجہ مستور کے افسانے بیک وقت شائع ہوئے۔ ساقی میں افسانوں کی اشاعت سے دونوں بہنوں کا نام ادبی حلقوں میں شہرت پانے لگا۔

بیسویں صدی کی کی ایک عظیم شخصیت کا تعارف

ڈاکٹر محمد حمید اللہ ممتاز اسلامی مفکر و مترجم

نصیر وارثی (مدیر: سہ ماہی ورثہ نیو یارک)

ڈاکٹر حمید اللہ کی شخصیت اور علمی کام کا اثر صرف مسلمان دنیا تک محدود نہیں رہا، بلکہ انہوں نے مغربی اسکالرز کو بھی اسلامی تعلیمات سے روشناس کرانے میں اہم کردار ادا کیا۔ ان کی علمی کاوشوں نے بین الاقوامی سطح پر اسلام کے متعلق غلط فہمیوں کو دور کرنے میں مدد دی۔

محمد حمید اللہ اسلام کے ایک ممتاز عالم اور 20ویں صدی کے سب سے ممتاز اسلامی مفکرین میں سے ایک تھے۔ وہ ایک قابل مصنف اور مترجم تھے، اور ان کے کام نے دنیا بھر میں اسلامی اسکالرشپ پر گہرا اثر ڈالا ہے۔ اس بلاگ میں، ہم اس قابل ذکر شخص کی زندگی اور شراکت پر گہری نظر ڈالیں گے۔

آپ 9 فروری، 1908ء کو اور بعض حوالوں کے مطابق 19 فروری، 1908 کو مملکت آصفیہ کے شہر حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔

محمد حمید اللہ کے والد عبدالمجید خان ایک نامور وکیل اور سیاست دان تھے جنہوں نے انڈین نیشنل کانگریس کے رکن کے طور پر خدمات انجام دیں۔ حمید اللہ نے ابتدائی تعلیم حیدرآباد میں حاصل کی اور بعد میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لیے پیرس بھیج دیا گیا۔

آپ نے گھر میں ابتدائی تعلیم کے بعد جامعہ نظامیہ میں داخلہ لیا اور 1924ء میں مولوی کامل کا درجہ مکمل کیا۔ بعد ازاں، گھر والوں کو بتائے بغیر، انگریزی زبان کی اہمیت کے پیش نظر میٹرک کے امتحان کی تیاری کے بعد میٹرک کا امتحان بھی دیا اور امتیازی حیثیت سے کامیاب ہوئے۔ اُن کے والد کو مقامی اخبارات کے ذریعہ ڈاکٹر صاحب کی کامیابی کی اطلاع ملی۔ اس کامیابی کے بعد انھوں نے بیٹے کی مزید حوصلہ افزائی کی۔ 1924ء میں انھوں نے جامعہ عثمانیہ میں داخلہ لیا اور اسلام، علم قانون میں ایم اے اور ایل ایل بی کی سند جامعہ عثمانیہ سے 1930ء میں حاصل کی۔ جامعہ عثمانیہ کی جانب سے اسلامی قوانین بین الاقوامی میں ڈاکٹریٹ کے لیے آپ کو فیلوشپ سے نوازا گیا۔ 1932ء میں جامعہ بون، جرمنی سے انھوں نے ڈی فل کی سند حاصل کی اور پھر اسی جامعہ میں عربی و اردو کے استاد کی حیثیت سے متعین ہوئے۔ جرمنی میں کچھ عرصہ گزارنے کے بعد انھوں نے ڈاکٹریٹ کی ایک اور سند کے لیے فرانسیسی دار الحکومت پیرس کی معروف جامعہ سوربون میں داخلہ لیا۔ 11 ماہ کے مختصر عرصے میں آپ نے ڈی لٹ کی سند حاصل کی۔

پی ایچ ڈی کرنے کے بعد، حمید اللہ ہندوستان واپس آئے، جہاں انہوں نے حیدرآباد کی عثمانیہ یونیورسٹی میں اسلامی قانون کے پروفیسر کے طور پر اپنے کیریئر کا آغاز کیا۔ بعد ازاں انہوں نے پاکستان میں کراچی یونیورسٹی اور ریاض، سعودی عرب کی کنگ سعود یونیورسٹی میں اسلامیات کے پروفیسر کے طور پر خدمات انجام دیں۔

اپنے پورے کیریئر میں حمید اللہ ایک نامور مصنف اور مترجم تھے۔ انہوں نے اسلامی قانون، تاریخ اور الٰہیات سمیت وسیع موضوعات پر 200 سے زائد کتابیں اور مضامین تصنیف کیے۔ انہوں نے عربی، فرانسیسی اور دیگر زبانوں سے متعدد کاموں کا انگریزی میں ترجمہ بھی کیا، جن میں قرآن، حدیث، اور سیرتِ نبوی کا بھی شامل ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کا سب سے نمایاں کام ان کا فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے اسلامی قانون، تاریخ، اور سیرت پر بھی قابل قدر علمی کام کیے ہیں۔ ان کا ترجمہ قرآن آج بھی مسلم اور غیر مسلم فرانسیسی بولنے والے افراد کے لیے ایک اہم ذریعہ ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی یہ کوشش اسلامی علوم کو عالمی سطح پر متعارف کرانے میں اہم قدم ثابت ہوئی۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے نہ صرف فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ کیا بلکہ انہوں نے اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں متعارف کرانے کے لیے بہت سے تحقیقی کام بھی کیے۔ ان کی کتابیں اور مضامین اسلامی تاریخ، قانون، اور سیرت النبی ﷺ پر گہرائی سے روشنی ڈالتے ہیں۔

ان کا فرانسیسی ترجمہ قرآن 1959 میں پہلی بار شائع ہوا، جو اپنی روانی اور درستگی کی وجہ سے آج بھی معتبر سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے حدیث، فقہ، اور اسلامی ثقافت کے موضوعات پر بھی وسیع کام کیا۔

اپنے علمی کام کے علاوہ، حمید اللہ مسلم کمیونٹی میں بھی سرگرم رہے اور مسلم دنیا کی کئی حکومتوں کے مشیر کے طور پر خدمات انجام دیں۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والے تھے اور 1947 میں پاکستان کے قیام میں کلیدی کردار ادا کیا۔

محمد حمید اللہ کا انتقال 17 دسمبر 2002 کو 94 سال کی عمر میں ہوا۔ اسلامی اسکالرشپ میں ان کی شراکت نے میدان میں دیرپا اثر ڈالا اور دنیا بھر کے اسکالرز اس کا مطالعہ اور بحث کرتے رہے۔

حمید اللہ کے قرآن اور حدیث کے تراجم کو انگریزی زبان میں سب سے زیادہ درست اور قابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اسلامی قانون اور تاریخ پر ان کے کام بھی متاثر کن رہے ہیں، اور جدید معاشرے میں اسلام کے کردار کے بارے میں ان کے نظریات کا مطالعہ اور اسکالرز اور پالیسی سازوں کی طرف سے بحث جاری ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کو مسلم کمیونٹی کے لیے ان کی گرانقدر خدمات کے لیے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ایک عالم، محقق، اور مترجم کے علاوہ عملی طور پر بھی مسلمانوں کے مسائل کے حل اور ان کی رہنمائی میں فعال رہے۔ انہوں نے نہ صرف علمی محاذ پر مسلمانوں کی رہنمائی کی بلکہ عملی طور پر بھی مسلم کمیونٹی کی ترقی کے لیے کام کیا۔

وہ ایک وقت میں پیرس کی مسلم کمیونٹی کے ساتھ بھی منسلک رہے اور انہوں نے وہاں کے مسلمانوں کی مذہبی ضروریات کو پورا کرنے کے لیے بے شمار خدمات سرانجام دیں۔

ڈاکٹر حمید اللہ نے مختلف اسلامی موضوعات پر لیکچرز دیے اور اسلامی تعلیمات کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے بے شمار مضامین لکھے۔

ان کی کوششوں کی وجہ سے مغربی دنیا میں اسلام اور مسلمانوں کی صحیح تصویر پیش کرنے میں مدد ملی۔ وہ مسلمانوں کے اتحاد اور ان کی تعلیم کے فروغ کے لیے کوشاں رہے، جس کی وجہ سے آج بھی انہیں ایک بلند مقام پر فائز کیا جاتا ہے۔ ان کی زندگی مسلمانوں کے لیے ایک مثال ہے کہ کیسے علم اور خدمت کے ذریعے معاشرتی اور مذہبی ترقی کی راہ ہموار کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر حمید اللہ کی علمی کاوشوں اور ان کی شخصیت نے بہت سے فرانسیسی غیر مسلموں کو اسلام قبول کرنے کی طرف مائل کیا۔ ان کے کام کی وجہ سے اسلام کی تعلیمات کو نہایت خوبصورتی اور درستگی کے ساتھ پیش کیا گیا، جس نے بہت سے لوگوں کو متاثر کیا۔

ان کا فرانسیسی زبان میں قرآن کا ترجمہ اور اسلامی موضوعات پر گہرائی سے تحقیق نے بہت سے غیر مسلموں کو اسلام کی طرف راغب کیا۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا انداز بیان اور اسلامی تعلیمات کی وضاحت، خاص طور پر مغربی دنیا کے لوگوں کے لیے، بہت واضح اور دل کو چھونے والا تھا۔ ان کے دلائل اور انداز تبلیغ نے اسلام کو سمجھنے میں مدد کی اور کئی لوگوں کے دلوں میں اس مذہب کی سچائی کو محسوس کرنے کا موقع فراہم کیا۔

اپنی علمی میراث کے علاوہ، حمید اللہ کو مسلم کمیونٹی کے لیے ان کی خدمات کے لیے بھی یاد کیا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان میں مسلمانوں کے حقوق کے لیے آواز اٹھانے والے تھے اور انہوں نے قیام پاکستان میں کلیدی کردار ادا کیا۔ وہ فلسطینی کاز کے پرزور حامی بھی تھے اور عالمی اسلامی کانگریس کے بانیوں میں سے تھے۔

مذہب کی تفہیم اور جدید معاشرے میں اس کا مقام، اور اس کا اثر بہت سے معاصر اسلامی اسکالرز اور مفکرین کے کام میں دیکھا جاسکتا ہے۔

شاید حمید اللہ کی سب سے بڑی میراث میں سے ایک ان کا خیال سے وابستگی ہے کہ اسلام ایک عالمگیر اور جامع مذہب ہے جس میں دنیا کو پیش کرنے کے لیے بہت کچھ ہے۔ ان کا ماننا تھا کہ مسلمانوں کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ دیگر ثقافتوں اور عقائد کے ساتھ باہمی احترام اور افہام وتفہیم کے جذبے سے جڑے رہیں، اور انہوں نے زندگی بھر اس پیغام کو فروغ دینے کے لیے انتھک محنت کی۔

مجموعی طور پر، محمد حمید اللہ ایک قابل ذکر اسکالر اور مفکر تھے جن کی اسلامی اسکالرشپ اور امت مسلمہ میں خدمات کو آج بھی محسوس کیا جارہا ہے۔ جدید معاشرے میں اسلام کے کردار کے بارے میں ان کے خیالات، قرآن وحدیث کے ان کے تراجم، اور مسلمانوں کے حقوق کے لیے ان کی وکالت، یہ سب انھیں مذہب اور دنیا میں اس کے مقام سے دلچسپی رکھنے والے ہر فرد کے لیے مطالعہ اور غور وفکر کے لائق بناتے ہیں۔ ڈاکٹر حمید اللہ کا انتقال 17 دسمبر 2002 کو امریکہ کے شہر جیکسن وِل، فلوریڈا میں ہوا۔ ان کی عمر 95 سال تھی۔ وہ اپنے آخری ایام میں وہاں مقیم تھے اور مسلمانوں

کے علمی اور دینی مسائل پر کام کرتے رہے تھے۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی وفات پر دنیا بھر میں مسلمان علمی حلقے اور عام افراد نے افسوس کا اظہار کیا۔ ان کے علمی کام اور خدمات کو ہمیشہ یاد رکھا جائے گا اور وہ اسلامی دنیا کے ایک عظیم عالم کے طور پر ہمیشہ تاریخ میں زندہ رہیں گے۔

محترمہ تہنیت النساء بیگم شعر و ادب کی دنیا میں دو وجہوں سے کافی شہرت رکھتی ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ مشہور محقق اور ماہرِ لسانیات ڈاکٹر محی الدین قادری زور کی شریکِ حیات ہیں اور دوسری سب سے بڑی یہ کہ وہ اردو کی صاحبِ دیوان نعت گو شاعرہ ہیں۔ 20/مئی 1910ء کو حیدر آباد کے ایک علمی و ادبی گھرانے میں پیدا ہوئیں۔ ان کی شعری و ادبی خدمات نا قابلِ فراموش ہیں۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ مل کر تا دمِ حیات اردو زبان کی ترویج و اشاعت میں کوشاں رہیں۔ اس تعلق سے ڈاکٹر محی الدین زورؔ خود لکھتے ہیں کہ "میں اپنی بیوی کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے سارے گھریلو کاروبار سے مجھے آج تک بے نیاز رکھا۔ نہ صرف یہی بلکہ میرے علمی و ادبی کاموں میں بھی انہوں نے دور دور تک ہاتھ بٹایا۔

دنیا میں بولی جانے والی مختلف زبانوں کی نوعیت بہت قدیم ہے۔ اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ ترجمے کا فن بھی بہت قدیم ہے۔ کیونکہ روم میں 300 ق م میں یونانی زبان کے ذریعہ یونانی تہذیب وثقافت کی پیروی میں تراجم کا ایک اہم کردار رہا ہے۔ اس کے بعد مغربی ممالک نے بھی عرب ممالک کی تہذیب وثقافت اور علم وہنر کے ذخیرے کو تراجم کے ذریعے اپنی زبانوں میں منتقل کرنا شروع کر دیا تھا۔ ثقافتی شعبے کے علاوہ مذہبی شعبوں میں بھی سامی (قدیم ملک آرام سے متعلق) اور یونانی زبانوں میں بائبل کے جو نسخے موجود تھے، ان کا ترجمہ الگ الگ دور میں مختلف زبانوں میں کیا گیا۔ ہندوستان میں انگریزی حکومت کے قیام کے بعد سنسکرت زبان سے بڑی تعداد میں تراجم کرائے گئے۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ انیسویں صدی تک جتنی بھی کتابیں اہم زبانوں میں موجود تھیں، انھیں تراجم کے ذریعے دوسری زبانوں میں منتقل گیا۔

افسانے سے مراد ادبی کام کی ایک قسم ہے جو حقیقی واقعات یا حقائق پر مبنی ہونے کے بجائے تخیل سے تخلیق کی جاتی ہے۔ افسانے میں، مصنفین ایسی کہانی سنانے کے لیے کردار، ترتیبات اور پلاٹ ایجاد کرتے ہیں جن کا حقیقی دنیا سے کوئی تعلق ہو یا نہ ہو۔ اس صنف میں ناول، مختصر کہانیاں، ڈرامے اور شاعری سمیت بہت سی شکلیں شامل ہیں، جہاں بنیادی زور حقیقت کی حقیقی نمائندگی کے بجائے مصنف کی تخلیقی صلاحیتوں اور کہانی سنانے کے فن پر ہوتا ہے۔ فکشن مصنفین کو مختلف موضوعات، جذبات اور تناظر کو تلاش کرنے کی اجازت دیتا ہے، جو اکثر قارئین کو خیالی دنیاؤں میں فرار ہونے یا انسانی تجربے کی بصیرت حاصل کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔

روایتی شکلوں کا احیاء: کچھ ڈرامہ نگار اور تھیٹر گروپ اردو ڈرامے کی روایتی شکلوں پر نظر ثانی کر رہے ہیں اور اسے بحال کر رہے ہیں، جیسے "داستان گوئی" (کہانی سنانے) اور "کٹھ پتلی تھیٹر"۔ یہ احیاء ایک عصری موڑ کا اضافہ کرتے ہوئے ثقافتی ورثے کو محفوظ رکھنے میں مدد کرتا ہے۔

اردو ڈرامہ معاشرے اور فنون لطیفہ کی بدلتی ہوئی حرکیات کے مطابق ارتقاء اور ڈھل رہا ہے۔ یہ اظہار کی ایک متحرک اور بااثر شکل ہے، جدت اور تنوع کو اپناتے ہوئے موضوعات اور مسائل کی ایک وسیع رینج کو حل کرتی ہے۔ یہاں جن رجحانات کا تذکرہ کیا گیا ہے ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ اردو ڈرامہ ادب اور فنون لطیفہ کی عصری دنیا میں نہ صرف زندہ ہے بلکہ ترقی کی منازل طے کر رہا ہے۔

اردو شاعری کی دنیا میں اداسی ایک کثیر جہتی استعارہ کے طور پر کام کرتی ہے جو اپنے جذباتی مرکز سے ماورا ہے۔ یہ ایک ایسا آلہ ہے جس کے ذریعے شاعر انسانی حالت کو دریافت کرتے ہیں، اپنے خیالات اور احساسات کا اظہار کرتے ہیں، اور اپنے سامعین سے گہری جذباتی اور فکری سطح پر جڑتے ہیں۔ اردو شاعری کی خوبصورتی دیگر جذبات کے ساتھ اداسی کو استعمال کرنے کی صلاحیت میں پنہاں ہے تاکہ معنی اور تجربے کی ایک بھرپور ٹیپسٹری تخلیق کی جا سکے۔

اردو افسانے کی ابتداء سے لے کر آج تک کی رفتار نہ صرف ایک ادبی روایت کے ارتقاء کی عکاسی کرتی ہے بلکہ ایک ایسی زبان کی لچک کی بھی عکاسی کرتی ہے جس نے متنوع ثقافتی اثرات کو جذب کیا اور اس کے مطابق ڈھال لیا ہے۔ اردو فکشن وسیع تر ادبی منظر نامے کا ایک متحرک اور اٹوٹ حصہ بنی ہوئی ہے، جو کہانی سنانے کی دنیا میں منفرد بیانیے اور نقطہ نظر کا حصہ ہے۔

غیر افسانوی ادب یا غیر مصنوع ادب ایک ادبی اثر ہے جو فکری، تعلیمی، حقیقی یا علمی موضوعات پر مبنی ہوتا ہے بجائے کہ کسی خیالی یا مصنوع کہانی پر مبنی ہو۔ یہ ادبی حقیقتوں، تجربات، تحقیقات، اور تجزیات کی روشنی میں لکھا جاتا ہے اور اس کا مقصد غالباً قارئین کو معلومات فراہم کرنا، تربیت دینا، یا انہیں مختلف فکری یا معاشرتی موضوعات پر غور کرنے کے لئے ترغیب دینا ہوتا ہے۔

غیر افسانوی ادب مختلف اشکال اختیار کرتا ہے جیسے کہ تقریب، مضامین، تحقیقاتی کتب، تجزیات، سفر نامے، خطوط اور دیگر غیر افسانوی چیزیں۔ اس میں لوگوں کے تجربات، تفکرات، اور نظریات کو شامل کیا جاتا ہے اور اس سے قارئین کو علمی، فکری، یا معاشرتی حوالے میں نیا و چارہ فراہم ہوتا ہے۔

R&H ROSS & HILL
PERSONAL INJURY LAWYERS

NEW YORK'S PREMIER INJURY LAW FIRM

Equality Icon
No Fee Unless We Win

There's no cost for a consultation. Virtual or in-person. We are a team with one goal in mind - Win

hummer
See Our Results

Hiring the best personal injury attorney in New York to represent you after an accident is extremely important. Click here to see examples of our victories.

Book A Free Consultation

Our NYC personal injury attorneys handle all types of accident cases and have won substantial settlements for our clients. When you need to win , call Ross & Hill.

ROSS & HILL
45,Broadway
Suits 1110 New York.NY 10006
Ph: 646-351-6222

Best Pakistani Community Channel
Movie
Drama
Comedy
Music
Poetry
Interwiews
Social Roundup & More
PTN-USA
Subscribe to our Channel
YouTube
facebook
twitter